تین ناول

خدا کے سائے میں
آنکھ مچولی

رحمٰن عباس

خدا کے سائے میں آنکھ مچولی

رحمٰن عبّاس

عرشیہ پبلی کیشنز دہلی ۹۵

Teen Novel
by: Rahman Abbas
Ist Edition : 2013
Rs.: 500/-

نام کتاب : تین ناول
مصنف : رحمن عباس
موبائل : 09869083296
مطبع : کلاسک آرٹ پریس، دہلی
سرورق : اظہار احمد ندیم
ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز

ملنے کے پتے
- راعی بک ڈپو، الہ آباد۔ 09889742811
- کتب خانہ انجمن ترقی، جامع مسجد، دہلی 011-23276526
- کتاب دار، ممبئی۔ 022-23411854
- مرزا ورلڈ بک، اورنگ آباد۔
- بک امپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔ ۴

arshia publications
A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi-110095 (INDIA)
Mob: 9971775969, 9899706640 Email: arshiapublicationspvt@gmail

ماہرہ اور رومی کے نام

یہ کائنات ہے میری ہی خاک کا ذرہ
میں اپنے دشت سے گزرا تو بھید پائے بہت
جو موتیوں کی طلب نے کبھی اداس کیا
تو ہم بھی راہ سے کنکر سمیٹ لائے بہت
بس ایک رات ٹھہر نا ہے، کیا گلہ کیجئے
مسافروں کو غنیمت ہے یہ سرائے بہت
(شکیب جلالی)

بات کی جانچ کر اور کہنے والے کی طرف خیال نہ کر کہ وہ کون ہے۔

(حضرت علیؓ)

جس نے دنیا کو جس قدر پہچانا ہے اسی قدر اس سے بے رغبت ہوا۔

(حضرت عثمان غنیؓ)

more

theyread

less

theyknow

more

pagesturned

more

sinscommitted

ShahAbdulLatif(translatedbyAnjuMakhijaandHariDilgir)

"If you had died young, I would have asked you to get life. But you lived long. So I shall ask you to come again the way you came before."

Things Fall Apart - Chinua Achebe

مؤذن نے تکبیر پڑھی اور لوگ جمعہ کی نماز کے لئے صف میں کھڑے ہو گئے۔ عبدالسلام کالشیکر بھی کھڑا ہو گیا۔اس کے سر پر ٹوپی نہیں تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔امام نے سورہَ فاتحہ شروع کی تو اس کے کان میں کھجلی ہوئی۔اس نے کان کھجایا۔کان کھجاتے ہی اسے یاد آیا کئی دنوں سے وہ کان صاف کرنے کے بڈس خریدنا بھول رہا ہے۔اس نے خود سے کہا آج وہ ضرور خریدے گا۔اسی دوران اس کی نظر مسجد کی دیوار پر لگی گھڑی پر گئی جس میں ایک بج کر پینتیس منٹ ہو رہے تھے۔ اس نے فوراً اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا جس میں ایک بج کر پینتالیس منٹ ہو رہے تھے۔وقت کی یہ تفاوت اس پر گراں گزری۔اس نے سوچا مسجد کی گھڑیاں اکثر پیچھے کیوں رہتی ہیں۔اس خیال پر وہ سنجیدگی سے غور کرنا چاہتا تھا لیکن عین اسی وقت ایک موٹی سرخ چیونٹی نے اس کے انگوٹھے پر رینگنا شروع کیا۔ اس نے ہلکے سے چار پانچ بار پیر جھٹکا تاکہ چیونٹی گر جائے۔چیونٹی رینگتے ہوئے اس کی ایڑی تک پہنچ گئی۔ابھی وہ اس آفت پر قابو پانے میں کامیاب ہوتا کہ اس سے لگ کر جو نمازی کھڑا تھا اس نے آنکھیں ترچھی کر کے ایک نظر اس کو گھور کر دیکھا۔

ان دونوں کی آنکھیں ملیں تو اس نے آنکھوں کے اشارے سے عبدالسلام کو احساس دلایا کہ اس کا دھیان امام صاحب کی طرف ہونا چاہیے۔ تذبذب میں اس نے گردن جھکائی۔ دوبارہ چیونٹی پر اس کی نظریں مرکوز ہوئیں، جس نے اسے عجیب الجھن میں ڈال دیا تھا۔ بالآخر اس نے دھیرے سے اپنا ایک پیر اٹھا کر دوسرے پیر سے رگڑا اور اس ابلیسی چیونٹی سے نجات پائی۔

سورۂ فاتحہ ختم ہوئی اور آمین کا شور بلند ہوا۔ اس نے بھی بہ آوازِ بلند آمین کہا۔ جوں ہی اس کی زبان سے آمین ادا ہوا ایک دبیز مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیلی۔۔۔ دراصل اسے امینہ یاد آگئی تھی۔ طالبِ علمی کے زمانے میں وہ کالج کے عقبی حصے کی جھاڑیوں میں اسے یہ کہہ کر لے جایا کرتا تھا کہ پیار کی باتیں ایسی جگہ بیٹھ کر کرنا چاہیے، جہاں فطرت کے علاوہ ان کی گفتگو کوئی اور نہ سن سکے۔ امینہ گیارھویں جماعت میں اس کی کلاسمیٹ تھی۔ امینہ کی یاد کے ساتھ اس کا سراپا اس کی نگاہوں میں روشن ہو گیا جس میں گداز، کیف اور شرارے ہم آہنگ تھے۔ پھر نماز کب، کس طرح ختم ہوئی، اسے کچھ خبر نہ رہی۔ بس امینہ کے ساتھ گزارے ہوئے دنوں کے لذت بھرے ذائقے اسے یاد آتے رہے۔ نماز ختم ہونے کے بعد امام صاحب نے دعا شروع کی۔ جس میں بار بار مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کی اللہ سے استدعا تھی۔ جانے کیوں اس وقت اسے ہنسی آگئی جسے وہ کسی طرح روک نہ سکا۔ اس کے چہرے سے یوں بھی عیاں تھا کہ وہ دعا مانگنے میں امام کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ اس کی نظریں امام پر مرکوز تھیں۔ اچانک اسے بچپن کے دنوں کے وہ امام صاحب یاد آگئے جو اکثر مکتب ختم ہونے کے بعد اس کے دوست نظیر عمر شیخ کو پیر دبوانے کے لئے مسجد میں روک لیتے تھے۔ امام صاحب

بنگالی تھے اور عموماً لنگی پہنے رہتے تھے۔ نظیر عمر شیخ پیر دباتے دباتے، امام صاحب کی چھڑی کے ڈر سے، ان کی لنگی میں چھپنے لگا۔ پھر کئی برسوں تک امام صاحب کے پان جس میں ’ایک سو بیس‘ تمباکو کی تیز بو شامل ہوتی تھی، نظیر کی چھاتی سے نکلتی ہوئی محسوس ہوتی رہی۔ مکتب میں پڑھنے والے کچھ دوستوں نے عبدالسلام کو یہ بھی بتایا تھا کہ نظیر عمر شیخ کے بدن سے امام صاحب کے سر میں لگائے جانے والے زیتون کے تیل کی مہک بھی آتی ہے۔ ایک دوست نے رازدارانہ انداز میں اس کو بتایا تھا کہ ایک دن اس نے نظیر کے کان میں کچھ کہنا چاہا تو اس کے کان سے عطر جنت الفردوس کی خوشبو آرہی تھی۔ یہ وہی عطر تھا جس کا پھاہا امام صاحب اپنے بائیں کان میں لگائے رکھتے تھے۔ امام صاحب نے بچوں سے یہ بھی کہا تھا کہ عطر کا استعمال کرنا افضل ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ نظیر یسّرنا القران سے آگے نہیں پڑھ سکا۔ ایک دن اس کے جی میں کیا آیا کہ اپنے کپڑے ایک تھیلی میں ٹھونس کر وہ گھر سے نکلا اور بمبئی نمبر ۸ کی بھول بھلیوں میں کھو گیا۔ نظیر کا اس طرح یکایک غائب ہونا ایک معمہ تھا۔ عبدالسلام نے نظیر عمر شیخ کا ذکر اپنی نجی ڈائری میں صرف ایک بار کیا ہے۔ چند برسوں بعد نظیر کے یکا یک غائب ہونے کا عقدہ اس پر کھل گیا تھا۔

یاد کے اس ٹکڑے کے ساتھ ہی عبدالسلام کے دعا کے لیے اٹھے ہاتھ اس کے چہرے پر گر گئے۔ ایک افسردگی اس کی روح میں کروٹ لینے لگی۔ وہ اٹھا اور احاطۂ مسجد سے باہر نکل گیا۔

عبدالسلام 'انجمن یادگارانِ مسلمین' میں بطورِ انگریزی معلم برسرِ روزگار تھا۔ جہاں مذہبی اقدار کے فروغ کو خاصی اہمیت دی جاتی ہے۔ طالبات کے لیے اسکارف لازمی تھا۔ لڑکے کبڈی کے کھیل میں بھی ٹوپی سر سے اتارنے کی گستاخی نہیں کرسکتے تھے۔ ان کو بتایا گیا تھا کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو اللہ ان کا ساتھ نہیں دے گا۔ عبدالسلام کو اس وقت بہت حیرانی ہوتی جب دونوں ٹیموں کے کھلاڑیوں کے سروں پر سفید و سیاہ ٹوپیاں، بازؤں پر اماموں اور پیروں کے تعویذ اور ضامن بندھے ہوتے۔ ایسے وقت وہ سوچتا: اب خدا کس کو جتائے گا؟ کیا خدا کنفیوژ ہوگا؟ پھر وہ خود کو سمجھاتا کہ خدا طاقتور کے ساتھ ہو جائے ہوگا کیوں کہ طاقت کی معنویت سے خدا سب سے زیادہ واقف ہے۔

اسکول کے تدریسی اسٹاف میں دو مرد اور پندرہ خواتین تھیں۔ خواتین ٹیچریں گھر سے برقعہ اوڑھ کر آتیں اور اسکول میں اتار دیتیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اسٹاف روم میں گرمی زیادہ ہوتی ہے۔ عبدالسلام کا خیال تھا کہ ان میں سے بعض خود بھی اسٹاف روم کی گرمی کا سبب ہیں۔ مرد ٹیچروں کے لب و لہجے میں نسائیت در آئی تھی۔ دونوں حضرات ماشااللہ باریش تھے اس لئے جنسی تشخیص فوراً ہو جاتی تھی۔ خالی

وقتوں میں وہ مذہب کے زوال کے اسباب، مسلمانانِ ہند کی تعلیمی پسماندگی اور فسادات میں پولس کی جانب داری وغیرہ ایسے موضوعات پر خواتین ٹیچروں سے ہم کلام رہتے۔ خواتین ٹیچریں سلائی بنائی میں مصروف یا پھر وڑا، سموسا کھاتے یا بیاضیں چیک کرتے ہوئے ان کی باتوں کو بہ غور سنتیں۔ سب کو عبدالسلام سے شکایت تھی کہ وہ ان سنجیدہ اور گراں قدر موضوعات پر ہونے والی بات چیت میں حصّہ نہیں لیتا۔ وہ اخبار یا کسی کتاب میں ڈوبا رہتا یا مسکراتا رہتا۔ لیڈیز ٹیچریں اس بات پر متفق تھیں کہ انگریزی میڈیم میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ اردو میڈیم طلبہ کے مقابلے، لکھنے پڑھنے کی مہارت جلدی حاصل کر لیتے ہیں۔ اسی بناء پر انھوں نے اپنے بچوں کو انگریزی اسکول میں تعلیم دلوانا مناسب سمجھا تھا۔ یہ واحد مماثلت ان خواتین میں تھی ورنہ دوسرے تمام موضوعات پر ان میں اختلاف پایا جاتا تھا۔

وقت کی کمی، کام کا بوجھ، تنخواہ سے روپے بچانے کے ایسے طریقے جس پر ساس اور نندیں اعتراض نہ کر سکیں،، شوہر سے اپنی فرمائشوں کی تکمیل کے آسان اور جذباتی نسخے، کنڈوم جائز ہے یا حرام؟ انگریزوں اور یہودیوں کی بنائی ہوئی ربڑ جیسی اس شئے سے مزہ کم ہوتا یا زیادہ۔۔۔ اور اس کی ایجاد کے پسِ پردہ کوئی صیہونی سازش تو نہیں ہے؟ وغیرہ ایسے موضوعات تھے جن پر اکیلے میں وہ خوب بحث کرتیں اور حسبِ عادت کبھی ایک دوسرے سے اتفاق نہیں کرتیں۔ شادی کے بعد جن کے معاشقے چل رہے تھے، وہ راز داری میں ایک دوسرے سے مشورہ کرتیں کہ انھیں اپنے عاشق پر کتنا خرچ کرنا چاہیے؟ کن ہوٹلوں میں سستا کمرے ملتے ہیں؟ کون سے ہوٹل شہر سے دور ہیں؟ ورگیزم میں کس کو مزہ زیادہ آیا ہے؟ ساتھ ہی ساتھ شب قدر اور شبِ معراج میں کتنی نفل تو نے پڑھی

اور میں نے کتنے روزے رکھے ان کے عام موضوعات تھے۔

عبدالسلام اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ لیڈیز ٹیچریں زندگی سے زیادہ لطف اور انبساط کشید کرنے کے عمل سے گزر رہی ہیں جبکہ مرد ٹیچرز انفرادی شخصیت کو تحلیل کرکے، فراموش کرکے، سب کی طرح بن جانے کے عمل میں گرفتار ہو کر رفتہ رفتہ بے شناخت شخص اور بے ضرر آدمی میں بدل رہے ہیں۔ وہ اس بات پر حیراں ہوتا کہ ان کے ملبوسات بھی ایسے ہوتے کہ کہیں سے انفرادیت کا عنصر نہ جھلک پائے۔ ''سماج اور معاشرے کے مطابق رہنے کے عمل نے بیشتر مرد ٹیچروں کو گانڈو آدمی بنا دیا ہے۔'' یہ عبارت اپنی نوٹ بک میں اس نے تحریر کی، پھر کچھ دیر اس پر غور کیا اور گانڈو لفظ کاٹ دیا۔ اس کے جگہ 'غیر آدمی' لکھا۔ اس نے اس لفظ کو اس لیے کاٹا تھا کہ نوٹ بک اسٹاف روم میں رکھی رہتی تھی اور اسے خدشہ تھا کہ اگر کوئی ٹیچر ورق گردانی کرے گا تو خواہ مخواہ اس کی دل آزاری ہوگی۔ عبدالسلام کا خیال تھا کہ ٹیچر ایک ایسا جانور ہے جس کی اپنی نہ کوئی شناخت ہے، نہ ذات۔ وہ ہمیشہ سب کے جیسا، سارے مذہبی تہوار منانے والا، سرکاری اجلاس میں جامد و ساکت بیٹھنے والا، دوسروں کے فارم بھرنے والا، اور الیکشن یا مردم شماری میں کلرکوں کے کام آنے والا انسٹرومنٹ بن گیا ہے۔ ٹیچر اس کے مشاہدے میں ایک ایسی پَرجاتی تھی جس کے کیمیاء میں احتجاج، غصے، اور بغاوت کا کوئی نشان نہیں تھا۔

عبدالسلام کی تعلیم و تربیت بمبئی میں ہوئی۔ وہ ایک متوسط طبقے اور روایاتی طور پر خود کو مذہبی تصور کرنے والے گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے باوجود مذہب کے معاملات میں اس کے خیالات کو پوری طرح سمجھنا دشوار ہے۔ کبھی وہ مذہب کے متعلق حد درجہ سنجیدہ نظر آتا اور کبھی ایسا لگتا جیسے مذہب اسے ایک لبادہ نظر آتا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ باطن کی نمائش کے حق میں نہیں تھا۔ لیکن اس کے جن خیالات سے اس کے قریبی دوست واقف تھے۔ ان میں یہ باتیں شامل تھیں کہ اس کا خیال تھا کہ وہ جس عہد میں جی رہا ہے، اس میں مذہب ذات کے اسفل ترین چہرے کو چھپانے کا ایک وسیلہ ہے۔ نمائش پسند لوگوں کا ہتھیار ہے۔ مذہب، افراد کے اچھے برے ہونے کا پیمانہ نہیں ہے۔ بے عقل اور غیر منطقی فکر کے حامل افراد مذہب کی جمالیات کو سمجھ نہیں سکتے۔ وہ لوگ جو جنس اور حسن کی معنویت سے آشنا نہ ہوں خدا سے قریب نہیں ہو سکتے؟

دوسری جانب یہ بات بھی دیکھی گئی ہے کہ معمولی سی بیماری بھی اس پر سایہ کرتی تو وہ مسجد کا رخ کرتا اور اللہ سے دعا کرتا: 'یا اللہ ترے بارے میں غلط سلط

سوچتا رہا۔۔۔کیا تو اس کی سزا دے رہا ہے؟ میں جو کچھ سوچتا ہوں وہ میرا دماغ سوچتا ہے۔ میں کیا کروں؟ دماغ کی ساخت تو نے بنائی ہے۔ تری مرضی کے بغیر پتا بھی نہیں ہل سکتا، پھر دماغ کیا کرسکتا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں تیرے خلاف سوچنے پر۔۔۔(وہ غور کرنے والے انداز میں سوچتا) تو ہی مجھے اکساتا ہے؟ جیسے تو نے ابلیس کو اپنے خلاف محاذ کھولنے کی توفیق دی تھی۔ یہ سب تیرا گیم ہے۔ اچھا اب میں تیرے بارے میں غلط نہیں سوچوں گا۔۔۔لیکن توفیق تجھے دینا پڑے گی۔'' دعا کے بعد خوشی خوشی مسجد سے باہر نکلتا۔ دل میں فتح مندی کا احساس بیدار ہوتا تو پان کی دکان سے ماوا بنواتا۔'بھولا ،کتری سپاری، اسٹار مار کر'۔

ماوا منہ میں ڈالتا اور ادھر ادھر ٹہلتا رہتا۔ ٹوپی سر سے نہیں اتارتا۔ محلّے کے لوگوں سے سلام دعا کرتا ہوا بازار میں بھٹکتا پھرتا۔ کچھ دیر بعد جب اپنی ترنگ میں لوٹ آتا تو سوچتا: میں جس کو مخاطب کرکے اتنی باتیں کر رہا تھا۔۔وہ ہے بھی یا نہیں۔۔۔یا بس میرا وہم ہے؟ آدمی کیا کرسکتا ہے۔۔۔مجبور جو ہے۔۔۔کچھ توقف کے بعد سوچتا: خدا نہیں ہوا تو کوئی بات نہیں۔۔لیکن اگر ہوا؟۔۔۔وہ کچھ دیر اور خدا کے وجود پر غور کرتا پھر کہتا: خیریت اسی میں ہے کہ اس کے خلاف نہ جاؤ (پھر چاہے جو کرو) جیسے سبھی کرتے ہیں۔۔۔لیکن ہر بار اس موڑ پر آنے کے بعد وہ نفی میں سر ہلاتا اور خود کلامی کا اختتام اس خیال پر کرتا: اگر میں بھی سبھی کی طرح ہوگیا تو بچا کیا۔۔۔نہیں نہیں میں نفس کے ساتھ فریب نہیں کرسکتا۔'میں صرف اپنی نفس کا اظہار ہوں'۔(اس کی نجی ڈائری کا ذیلی عنوان یہی ہے۔)

عبدالسلام کے مطابق خدا سب کی ڈھال ہے اور چوری چوری چپکے چپکے سب کے ساتھ تھوڑا بہت وقت گزار لیتا ہے۔ تو گڑیا، اڈوانی، اور مودودی کا خدا ہے۔

اسامہ، صدام اور ملا عمر کا خدا ہے۔ جارج بش، پوتن، اور ٹونی بلیر کا خدا ہے۔ میڈونا ، مادھوری دکشت اور کرشمہ کپور کا خدا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ آدمی سوچتا ہے جب تک دوسرے اسے احترام کی نگاہ سے نہیں دیکھیں گے وہ بے آدمی ہے۔ اس احساس کو برداشت کرنے کی صفت انسانی ذہن نے ابھی ایجاد نہیں کی ہے۔

''انسان خدا سے کٹ کر خود کو دریافت کرنے کی اجتماعی کوشش کم از کم مزید ۵ ملین برسوں تک نہ کر پائے۔ یا شاید کبھی نہ کر پائے۔ مگر انسان خدا سے جڑا بھی تو نہیں رہتا۔ وہ خدا کو شلوار کی طرح پہن لیتا ہے۔ تلک کی طرح لگا لیتا ہے یا ٹوپی کی صورت اوڑھ لیتا ہے۔ یا مزار کی صورت اس کے گرد قوالیاں منعقد کرتا ہے۔ خدا کو استعمال کرتا ہے، اپنے آپ کو سماج میں مناسب مقام دلوانے کے لئے، قبولیت کے لئے۔ گویا صحرائے زندگی میں خدا ایک چادر ہے جو ہمارے سروں پر ہمیشہ رہے۔ ڈر ہے اس سایے سے باہر نکلتے ہی دھوپ کی تمازت سے ہمارے دلوں کے نرم ریشے تحلیل ہو جائیں گے۔''

اپنے پہلے ناول 'غیر مطبوعہ' کے دوسرے باب 'آدمی کی سوانح عمری' کے مسودے میں مندرجہ بالا پیر گراف اس نے لکھا تھا۔ لیکن جو ایڈیشن شائع ہوا اس میں یہ پیراگراف نہیں ہے۔ مسودے میں ہی اس نے اس پیراگراف کو کاٹ دیا تھا۔ اسے ڈر تھا اس کے مذہبی دوست (جو خود ادیب تھے) اس کی ان باتوں سے ناراض ہو جائیں گے۔ اس پیراگراف کو کاٹ کر اس نے حاشئے پر پنسل سے لکھا تھا:

''میں تیرے بارے میں وہ باتیں بھی دوسروں کو نہیں بتا سکتا جو تو خود چاہتا ہے میں انھیں بتا دوں۔''

عبدالسلام کبھی خدا سے بے پناہ عقیدت کا اظہار کرتا اور کبھی اس پر برہم ہوتا۔طیش اور غصے سے کبھی اس کے فیصلوں اور غلط جماعت کے ساتھ ہونے پر تنقید کرتا۔ پھر سوچتا: 'یار جب تو ہے ہی نہیں، تو میں تجھ پر اتنے الزام کیوں لگا تا ہوں؟ میری مت ماری گئی ہے؟' پھر مسکراتا اور کہتا: ''سن! اب اگر ہے، تو میری سر پھری باتوں کا مجھ سے انتقام مت لینا۔' ایسے جملے وہ آسمان کی جانب دیکھ کر دل ہی دل میں ادا کرتا۔

اس کی خود کلامی کے حوالے سے جب کوئی اس سے پوچھتا: 'کیا ہوا بھئی؟'

جواب دیتا: 'ربّ ِباری سے فریادِ مغفرت کر رہا ہوں۔اللہ تمہیں بھی بے حیائی اور برائی سے بچائے۔'

جیسے ہی پوچھنے والا شخص گزر جاتا۔وہ مسکراتا اور کہتا۔''اِنَّا للہ۔۔راجعون۔''

ایک دفعہ کا واقعہ ہے جب اس کی خدا بر ہمی پہلی اور آخری بار اس کے ایک طالب علم پر عیاں ہوگئی۔ہوا یوں تھا کہ اسکول کی پکنک کسی پہاڑی مقام پر گئی ہوئی

تھی۔ وہاں ایک آبشار سے پانی دھاڑ دھاڑ گر رہا تھا۔ طلبہ اور اساتذہ سب موج مستی میں مگن تھے۔ عبدالسلام ایک پیڑ کے سایے میں بیٹھا اپنی ایامِ جوانی کی اس پکنک کو یاد کر رہا تھا جس میں شہلا نامی ایک لڑکی کو وہ ایسے ہی کنج میں درختوں کے پیچھے لے جا کر محوِ کلامِ عشق تھا۔ اس شام کے پُرشہوت منظر اس کے دماغ کی اسکرین پر ماضی کے کھنڈرات سے نکل کر ابھی جلوہ گر ہونے ہی والے تھے کہ ایک طالبِ علم جو اکثر اس سے سنجیدہ موضوعات پر غیر سنجیدہ سوالات پوچھا کرتا تھا، قریب آیا اور پوچھ بیٹھا: 'سر یہ آبشار میں پانی کدھر سے آتا ہے؟'

اس کی زبان سے ایک تلخ اور دل برداشتہ کر دینے والا جملہ ادا ہوا۔ لڑکا تلملایا اور فوراً وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ عبدالسلام کو کچھ دیر بعد اپنے رویے پر ندامت بھی ہوئی۔ اسے یاد آیا ان ہی دنوں اس نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ ہماری زبان سے ادا ہونے والا ہر جملہ ہمارے اطراف کئی برسوں تک گردش کرتا رہتا ہے۔ ہم میں سے جو لوگ بہت حساس ہوتے ہیں وہ ادا کیے گئے جملوں کی صدائے بازگشت بھی سننے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ہمارے کئی جملے ایسے بھی ہوتے ہیں جو خلائے بسیط میں اس وقت کا انتظار کرتے ہیں جب ہم ان کی ادائیگی کا خمیازہ ادا کریں۔

وہاں وہ بہت دیر تک اپنی سابقہ معشوقہ کو دل کی بھول بھولیوں میں ڈھونڈتا رہا مگر اس نے مراجعت نہیں کی۔ ہاں! البتہ اس دن کے بعد سے عبدالسلام اس طالبِ علم سے نظریں چراتا رہا۔ اسے نظر انداز کرتا رہا۔ لیکن کمبخت! وہ طالبِ علم بھی جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا، جب بھی جمعہ کی نماز میں اسکول کی مسجد سے عبدالسلام کو باہر آتے دیکھ لیتا چشم زدن میں، کسی فرماں بردار جن کی طرح اس

کے سامنے وارد ہوتا اور کہتا: ''سر۔۔سلام ۔۔وعلیکم۔۔'' کبھی کبھی رحمت اللہ بھی جوڑ دیتا۔عبدالسلام کو ایسا لگتا یہ سلام اس لڑکے کے منہ سے نہیں بلکہ انتقاماً اسی مقام سے آرہا ہے جہاں سے آبشار میں پانی آتا ہے۔

جہاں تک میں نے معلومات اکٹھا کی ہے اس کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ لوگ باگ عبدالسلام کو پسند کیا کرتے تھے۔وہ خاصا انسان دوست شخص تھا۔ آشفتہ حال صرف اس وقت ہوتا جب کسی انتہائی کم درجہ آدمی کی مبالغہ آمیز تعریف اس کے سامنے کی جاتی۔کسی تعلیمی جلسے میں ایک محترمہ کے منہ سے دوران تقریر ادا ہوا' سابق صدر جناب عبدالکلام میزائل خان جتنے عظیم سائنسداں ہیں اتنے ہی باکمال شاعر بھی ہیں۔' عبدالسلام سے رہا نہیں گیا۔اس نے اسٹیج پر جاکر خاتون سے مخاطب ہوکر کہا' بڑی بی! عبدالکلام کی انگریزی شاعری ایسی ہی ہے جیسی اردو میں تابڑاہیم چاشک کی۔مجمع قہقہہ بردار ہوگیا حتیٰ کہ وہ محترمہ بھی ہنسی روک نہیں سکیں۔ (تابڑاہیم چاشک کی وفات دو سال قبل ہی ہوئی تھی۔وہ بمبئی کے ایک مقامی تاجر تھے جن کو شاعری کا بھی چسکا تھا۔حالانکہ وہ انتہائی کمزور شاعر تھے لیکن ان کا دعویٰ تھا کہ وہ عہدِ حاضر کے غالب ہیں، اور جو لوگ ان کی شاعری کو کمزور کہتے

ہیں ان کو فن شاعری کا شعور نہیں ہے۔) اسی واقعے سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ عبدالسلام کے حوالے سے ممبئی شہر کے علمی حلقوں میں مشہور تھا۔ اس کے ایک استاد افسانہ نگار ایک ادبی جریدے کے مدیر بھی تھے۔ عبدالسلام کو اپنے استاد کی افسانہ نگاری شاید ناپسند تھی۔ بہت ہی خاص دوستوں میں سے کسی نے اس سے پوچھا کہ 'استاد کی افسانہ نگاری کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟' بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا: ''چھوتیا افسانہ نگار ہے۔'' ہفتے پندرہ دن میں بات عبدالسلام کے استاد تک پہنچ گئی۔ ایک ادبی جلسے میں استاد بھی حاضر تھے۔ سلام کسی سے کہہ رہا تھا کہ ان سے ملئے یہ میرے استاد ہیں۔ استاد کو غصہ آ گیا۔ انھوں نے اونچی آواز میں کہا ''منہ پر استاد کہتے ہو اور پیچھے چھوتیا۔ خود استاد ہو گئے ہو کچھ تو شرم کرو۔''

چند افسانہ نگار اور شاعر ارد گرد جمع ہو گئے۔ عبدالسلام نے استاد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: ''سر! میں آپ کو چھوتیا کیسے کہہ سکتا ہوں۔ کیا آپ چھوتیا ہیں؟'' اس پر مجمع ہنس دیا۔ استاد کچھ سمجھے نہ سمجھے، مسکراتے ہوئے ایک طرف ہو گئے۔ عبدالسلام نے زیرِ لب کہا: 'سچ مچ کس قدر چھوتیا آدمی ہے۔ ۲۰۰۳ء تک لفظ ''چھوتیا''، ممبئی میں کم فہم آدمی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس واقعے کے بعد لوگ شرارتاً عبدالسلام کے استاد کا نام اس لفظ کی جگہ استعمال کرنے لگ گئے۔ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں عبدالسلام کو اس واقعے پر افسوس ہوتا رہا۔

رمضان کا مہینہ اس کے لیے رحمتوں بھرا نہیں بلکہ اذیتوں بھرا ہوتا۔ روزہ نہیں رکھتا تھا لیکن پورا دن روزہ داروں کی سی حالت بنائے رہتا۔ اپنی حالت پر افسوس بھی کرتا اور بارہا خود سے کہتا کہ کاش! میں انھیں بتا دیتا کہ میں بھوکا ہوں روزہ دار نہیں ہوں۔ گھر میں رہتا تو دن بھر کھاتا پیتا رہتا اور مغرب کی اذان سے ذرا پہلے دستر خوان پر بیٹھ جاتا۔ والدہ کے ساتھ دعا پڑھ کر روزہ کھولتا اور بھائیوں کے ساتھ بلڈنگ سے نیچے اترتا۔ اس کے بڑے بھائی مسجد کی طرف جاتے، یہ پان والے کی دکان پر پہنچ جاتا۔''ایک بھولا، کچی سپاری، اسٹار مار کر۔''

دکان والا پوچھتا' سر روجے کیسے جا رہے ہیں؟

تو جواب میں کہتا۔''اس سال تو معلوم ہی نہیں پڑ رہے ہیں۔''

پان منہ میں ڈال کر دل میں کہتا: کس سالے کو معلوم نہیں پڑ رہے ہیں؟ پھر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے سوچتا، اس مہینے اگر شیطان کو تو قید کرتا ہے تو پھر مجھے گمراہ کون کر رہا ہے؟ شاید تو ہی نہیں چاہتا کہ میں روزے رکھوں۔ اگر تیری یہی مرضی ہے، تو مجھے روزے رکھنے کی توفیق کیوں کر نصیب ہو؟ ویسے رکھ بھی لیتا تو کچھ نہیں بگڑتا۔ اسکول میں اتنے گھنٹے تو یوں بھی بھوکا رہتا ہوں۔ کچھ دیر بعد اپنی ہی بات کو کاٹتے ہوئے کہتا: کیا پاگل پن ہے۔ بھوکا رہنے سے تو خوش ہو جاتا؟ تو اتنا

بے وقوف نہیں ہو سکتا۔ اگر ہوتا تو نا؟ ہاں مگر بھوکا رہنے سے میرا ہاضمہ ٹھیک ہو جائے گا۔ روزہ رکھنے میں کئی فائدے ہیں۔ نیکسٹ ٹائم رکھوں گا۔ تری خاطر نہیں بلکہ اپنے ہاضمے کی خاطر۔ مگر وہ دن کبھی نہیں آیا۔

پچاسویں سالگرہ کے دوسرے روز اسے ڈائریا ہوا، تب ڈاکٹر سے کہا: 'سب جانتا ہوں، ان کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟ کاش! سالے روزے رکھ لیتا۔' پھر آسمان کی جانب دیکھ کر ملتجیانہ لہجے میں کہا: 'اتنے نحیف آدمی سے اتنا شدید انتقام۔'

’ہندوستانی سماج میں خواتین ٹیچروں کا ایک بہت بڑا طبقہ ایسا ہے جو ذہنی، معاشی اور جنسی عدم اطمینانی کا شکار رہے۔ جن کا درد کوئی نہیں سمجھتا۔‘

عبدالسلام کا اس جملے کو بار بار دہرانا اس کے تجربے کا حصہ تھا۔

اسکول میں جو چہرہ وہ پیش کرتی ہیں وہ ان کی ذات کی ضد ہوا کرتا ہے۔ مذہب کا زیادہ سہارا ذات کے گہرے انتشار اور آشفتگی کا اظہار ہے۔ عبدالسلام جب کسی برقعہ پوش ٹیچر سے بات چیت کرتا تو اسے اُن کے المیہ کا احساس بھی ہوتا۔ اس نے ایک جگہ لکھا ہے: ’کئی بار محزون دل عورتوں کے بدن سے اٹھنے والی بو میں نے محسوس کی ہے۔‘ جس کا سبب اسے یہ لگتا تھا کہ حزنیہ کیفیت کی وجہ سے ان عورتوں کے بدن پر داغ نکل آتے ہیں جو ایک عرصے بعد پیپ بن کر رسنے لگتے ہیں جس کی سرانڈ کو سب محسوس نہیں کر سکتے۔ بعض اوقات یہ خواتین خود اس بو کے اصل سبب کو سمجھ نہیں پاتیں۔

کئی دفعہ اسے یوں بھی لگا کہ اسکول اسٹاف روم سے متصل کمرے میں جو بعض خواتین ٹیچریں نماز کے لیے جاتی ہیں ان میں ایسی بھی ہیں جو درحقیقت رونے کے لیے جائے سکون کی متلاشی ہیں۔ اپنے ذہن اور بدن کے اسرار ان پر کھل

گئے ہیں ۔ان کی تکمیل کے راستے مسدود پا کر وہ ہیجان کی شکار رہیں ۔اسی لیے خدا کی گود میں سر رکھ کر وہ اپنی نسوانی ارتکازیت کو بھولنا چاہتی ہیں ۔ان میں خدا جن کو اپنی گرفت میں لینے سے انکار کر دیتا ہے وہ لامحالہ کسی کلرک ،کسی ٹیچر یا کسی پڑوسی کے آدھے ادھورے کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے ہفتے پندرہ دن سے ہو آتی ہیں ۔ فائلوں پر نمبر شمار لکھنا ،مضمون نویسی میں مدد کرنا ، پرچے پر دیئے گئے نمبروں کو re-check کرنا ایسے کاموں میں ان کا تعاون ، دراصل ان کی شخصیت کی کال کوٹھری میں نہاں ، اداس اور نہ بیان کی گئی کہانی کے سب سے زیادہ اذیّت ناک حصّے کا اظہار ہے ۔

عبدالسلام پر یہ اسرار منکشف ہو گیا تھا۔ اسی سبب انہماک سے کام کرتی ہوئی ٹیچروں کو دیکھ کر اسے عجیب احساس زیاں گھیر لیتا۔ وہ جانتا ہے: ”کام وقت اور ذات کو قتل کرنے کا بہترین ہتھیار ہے ۔“ اور یہ محروم ٹیچریں اسے استعمال کر رہی ہیں ۔ یہ مردہ زندہ ابدان ہیں ۔عبدالسلام کو ان سے ہمدردی بھی تھی اور یہی ہمدردانہ روّیہ ایک روز اسے اپنی سب سے سنیئر موسٹ ٹیچر کے گھر لے گیا۔جس کی شادی کو دس بارہ سال بیت چکے تھے ۔اس کا شوہر سعودی عرب میں ملازم تھا۔ دو بچّے تھے ، اور دونوں اسی شوہر سے تھے ۔عبدالسلام نے اس کے ساتھ ٹی وی پر کوئی فلم دیکھی ۔ پھر اسٹاف کی باتیں ہوئیں ۔ پھر چائے ، پھر لطیفے ،کبھی کبھار خدائے رحیم و کریم کے اوصاف پر صوفیانہ انداز میں گفتگو ہوتی ۔عبدالسلام کا اس کے گھر آنا جانا بڑھتا گیا تو وہ بھی ساڑی سے شلوار قمیص اور پھر میکسی پر اتر آئی ۔ چند مہینوں بعد جب عبدالسلام کی سانسیں دوبارہ اپنے رِدم میں لوٹنا شروع ہوئیں تو میکسی بھی ٹی ۔وی کی طرح ایک کونے سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی ۔عبدالسلام حیران نہ تھا

اور سینئر موسٹ پریشان نہ تھی۔ انھیں ابتدا سے اس انجام کا احساس اور انتظار تھا۔ البتہ درمیان میں جو اتنے ہفتے یوں ہی اجنبیت کی دیوار پاٹنے میں گذر گئے انھیں صرف اس کا ملال تھا۔

عبدالسلام کے تعلقات اس کے ساتھ ۲۶ برسوں تک رہے۔

اس کے شوہر کی واپسی اور بچوں کے جوان ہونے کے بعد بھی دوستی کی چھانو میں محبت کا یہ تماشا جاری رہا اور اس روز ختم ہوا جب سینئر موسٹ کے سرخ دنوں کے بجائے گاڑھے سفید سیال نے اختیار کیا۔ سفید سیال دنوں کے آغاز کے چوتھے مہینے سینئر موسٹ نے حج کے لئے فارم بھر دیا۔ عبدالسلام اس دن خوب ہنستا رہا۔ حالانکہ اسے خود یہ پتہ نہیں تھا کہ وہ کس بات پر اس قدر ہنس رہا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے اسے اس بات کا سبب پتہ ہو لیکن اس نے اپنی کسی ڈائری میں اس کا اظہار کرنے کو مناسب نہیں سمجھا۔ جب وہ آخری بار اس سے ملنے آئی، تب اس لمحے کی سرد مہری میں عبدالسلام کی زبان سے ایک سرد جملہ ادا ہوا: ''خدا تمہارے گناہ بھی میرے نام ٹرانسفر کر دے۔ میرا خدا تعلقات کی نوعیت کو سمجھتا ہے۔ وہ عدم ہے۔''

حج سے واپسی کے نو سال بعد اور عبدالسلام کی موت سے پندرہ سال پہلے سینئر موسٹ کا دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا۔ غم گساروں میں وہ بھی شریک تھا۔ نعش دوسرے کمرے میں رکھی ہوئی تھی۔ جہاں عورتیں نم آنکھوں سے اس کا آخری دیدار کر رہی تھیں۔ لیکن سلام کو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ نعش کے قریب کھڑا ہے اور سینئر موسٹ کے زرد گلابی چہرے کو دیکھ رہا ہے۔

میت اس سے کہتی تھی: 'دیکھو! اس بدن کے کتنے گہرے راز تمہارے دل

میں دفن ہیں؟ میرا دل تمہاری یادوں سے بھرا ہوا تھا جسے ایک دن، باعثِ ضعف پھٹنا پڑا۔'

عبدالسلام کی آنکھوں میں بھنور بنے جن میں آنسو نہیں، بلکہ کچھ ریت تھی۔

وہ وہاں سے نکل گیا۔

محمد علی روڈ سے گزرتے ہوئے پان کی دکان پر وہ رک گیا۔

'ارے یار۔۔۔ایک بھولا کتری سپاری، اسٹار مار کر دینا۔'

اس کے لہجے میں افسردگی تھی اور اس کے گلے میں گویا ریت کے بھنور بن رہے تھے۔

عبدالسلام کی دیرینہ خواہش تھی کے انتقال سے پہلے وہ اپنی ''داستانِ عشق،، مکمل کرلے جس کی تین جلدوں کے مسودے وہ لکھ چکا تھا لیکن جب تک ساتوں جلدیں جو اس کے دل میں محفوظ تھیں، زیب قرطاس نہ ہوں وہ ان کو شائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی دو وجوہ وہ بیان کرتا تھا۔ پہلی: اس کے قارئین کو پھر جانے کتنے برسوں تک دوسری جلد کے انتظار میں خوامخواہ بے قراری اور اضطراب سے گزرنا پڑے گا۔ دوسری: وہ محبوبائیں جو اب تک قیدِ حیات ہیں چوں کہ ان کا ذکر مطبوعہ جلدوں میں نہیں ہوگا ان کی ناراضی اسے برداشت کرنا پڑے

گی۔ چوں کہ آدمی ایمان دار تھا اس لیے عجلت میں اپنی کسی محبوبہ کے ساتھ ناانصافی کرنے کا گناہ گار نہیں بننا چاہتا تھا۔

''داستان عشق'' تحریر کرنے کا ارادہ اس نے طالب علمی کے دنوں میں کیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کی معشوقہ شہلا نے اسے یہ مشورہ دیا تھا۔ ایک روز شہلا نے اس سے کہا: ''تم جو اس والہانہ دیوانگی کے ساتھ مجھے کالج کے عقب کی جھاڑیوں میں پرندوں کے گھونسلے دکھانے کے بہانے پیار کرنے لاتے ہو۔ کیا اس دیوانگی کو دنیا پر آشکار نہیں کرو گے۔ کیا ہمارا یہ پاگل پن مشہور ہو کر تاریخ میں زندہ نہیں رہ سکتا؟'' تب فرطِ محبت میں اس نے شہلا کی لپ اسٹک کو جیب سے رومال نکال کر صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔ 'ہماری محبت عہدِ حاضر کی سب سے یادگار روداد ہو گی۔ جسے میں خود تحریر کروں گا۔' جملہ ادا کرنے کے بعد اس نے رومال پر لپ اسٹک کی سرخی دیکھنے کے لئے آنکھیں مرکوز کیں تو وہ حیران و ششدد رہ گیا۔ غلطی سے رومال کی بجائے عجلت میں وہ جیب میں والد کی سفید ٹوپی ٹھونس لایا تھا۔ اب اس ٹوپی کو دوبارہ گھر لے جانا مناسب نہیں تھا۔ اس نے سوچا: کیوں نہ محبت کی نشانی کے طور پر ٹوپی کو وہیں جھاڑیوں کے سپرد کر دے۔

چند روز تک یہ محبت اپنے شباب پر رہی۔ پھر شہلا کے دماغ میں یہ بات آئی کہ ''محبت میں بچھڑنا ضروری ہے ورنہ اسے تاریخی اہمیت حاصل نہیں ہوگی۔'' شاید اس خیال کے اختراع کے نشے میں چور ہو کر وہ ترکِ محبت پر آمادہ ہوگئی۔ شہلا کی بے وفائی نے اس کے دل کو مفلس کا چراغ بنا دیا تھا جس کے سبب چند روز تک اسے بے قرار، مضطرب اور کینٹین میں چائے پر چائے پیتے اور میرؔ کے اشعار سنتے سناتے دیکھا گیا۔ پھر ایک دوسری لڑکی سے دوستی پر یہ دکھ رفتہ رفتہ

مندمل ہوگیا۔ مگر اس محبت نے اسے جو سب سے اہم سبق سکھایا وہ یہ تھا کہ محبت کے واقعات کو ہر شب سونے سے قبل ایک ڈائری میں تحریر کر لینا چاہیے تاکہ کثرت کی وجہ سے وہ کہیں انھیں بھول نہ جائے۔ اس طرح ہر معشوقہ کی محبت کی علاحدہ روداد کے لئے الگ ڈائری بنائی جائے تاکہ واقعات آپس میں گڈ مڈ نہ ہوں اور اگر ناموں میں یکسانیت ہو تو آخری ایامِ زندگی میں وہ انھیں ایک ہی سمجھنے کی حماقت نہ کر بیٹھے۔

آگے چل کر وہ باقاعدگی سے واقعاتِ محبت کو تحریر کرنے لگا۔ ان ڈائریوں کو وہ ایک خاص الماری میں رکھتا تھا جس کو اس نے اپنے دل میں 'آخری شب کے ہم سفر' نام دیا تھا۔ جب تک وہ والدین کے ساتھ رہا، الماری کی چابی اس نے ہمیشہ اپنے پاس رکھی۔ زندگی کے سفر میں کل ملا کر ۵۳ چھوٹی چھوٹی ڈائریاں اس کی الماری میں جمع ہوگئیں۔ جن میں بے شمار واقعات، حاشیہ جات، تواریخ، تحفوں اور شکایتوں کے اندراجات کے علاوہ محبت کے جذبے اور تجربے پر اس کے اپنے خیالات محفوظ ہیں۔ ان ڈائریوں کی اساس پر ہی 'داستانِ عشق' کے تین مسودے اس نے تحریر کیے تھے۔ جن میں صرف ۲۶ ڈائریوں کا مواد سمایا تھا۔ 'داستانِ عشق' کی باقی چار جلدوں میں وہ باقی ماندہ ڈائریوں کی محبتوں کے احوال کو استعمال کرنا چاہتا تھا لیکن وقت کی کمی اور مزاج کی بے راہ روی کی بنا پر مکمل نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ رٹائرمنٹ کے بعد وہ یہ کام دل لگا کر کر پائے گا۔ ساتوں جلدوں کی اشاعت پر جو اخراجات ہوں گے وہ پروویڈنٹ فنڈ سے حاصل ہونے والی رقم سے ادا کرے گا۔

۵۳ ڈائریوں میں بعض کنواری لڑکیاں، چند معزز افراد کی بیویاں، چار بمبئی

کی اسکول ٹیچریں، ایک یچی کلی، تین مطلقہ خواتین، دو گجراتی لڑکیاں، ایک ملیالم لڑکی، ایک تمل اور چار مراٹھی عورتوں کے علاوہ، تین دوستوں کی بیویاں شامل تھیں جنھیں وہ الگ نام دے دیا کرتا تھا تاکہ دوستی پر خواہ مخواہ آنچ نہ آئے۔ ساری محبتوں کا ذکر اس نے انتہائی عرق ریزی سے کیا تھا۔ مگر ایک محبت کا ذکر وہ چاہ کر بھی نہیں کر سکا۔ وہ لڑکی جو اس کی زندگی کے بڑے عرصے پر سایہ کیئے رہی۔ ساری جاری محبتوں کے درمیان وہ یاد کا مینار بن کر اس کے دل کی تاریک گلیوں میں وقفے وقفے سے مراجعت کیا کرتی تھی۔ یہ کہنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ وہ لڑکی عبدالسلام کے دل کے ایک حصے میں مقیم تھی لیکن وہ خود اس حصے کو فراموش کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس کے نام کی ڈائری وہ کبھی نہیں لکھ سکا۔ ہر بار چند سطریں لکھ کر وہ اداس اور مغموم ہو جاتا جس کے سبب کئی دنوں تک ذہنی طور پر وہ منتشر رہتا۔ درد کی اس لہر کا مداوا اور محبت کے اس الہام کی توضیح و تفہیم کا پروانہ اس کے پاس نہیں تھا۔ یہ وہ واحد محبت تھی جو ناقابل تحریر تھی۔ ناگہانی موت سے چند روز قبل اس نے اپنی زندگی کا احتساب اور اپنی معشوقاؤں کی فہرست پر نظر ڈالی تھی تب اسے پختہ یقین ہو گیا تھا کہ یہ واحد لڑکی ہے جس کی کہانی وہ لکھ نہیں سکا لیکن اس کے علاوہ کسی اور کے ساتھ وہ محبت میں جسم و جاں کے مکمل ارتکاز کے ساتھ شریک بھی نہیں تھا۔ تب اسے عرفان ہوا، 'الفاظ جذبات کی شدت کے مدِمقابل بہت ادنی اور کم احاطہ ہیں۔ اس لیے حقیقی محبت کی واردات ناقابل تحریر ہے۔' یہ جملہ اس نے اپنی ایک پسندیدہ کتاب کے ابتدائی صفحے پر لکھا تھا۔ اس کتاب کا عنوان تھا 'داغِ عشق تنہا رہ گیا'۔ غالباً یہ جملہ اس نے اپنی موت کے چند ماہ پہلے لکھا ہوگا۔ یہ بات اس کتاب کی تاریخ اشاعت کو مدنظر رکھ کر کہی جا رہی ہے۔

میں عبدالسلام کی زندگی پر ایک ضخیم ناول لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور اس کے بارے میں معلومات اکٹھا کر رہا ہوں۔ جس کی اساس پر اس کے کردار اور شخصیت کو فکشن کا روپ دینے کی کوشش کروں گا۔۔شاید میں بھی مذکورہ محبت کو بیان کرنے سے قاصر رہوں۔ تجربے کی حقیقت کے بغیر جو کچھ تحریر ہو گا وہ خیالی ہو گا اور محبت غیر خیالی ٹھوس حقیقت ہے۔ یہ ہماری انسانی مجبوری ہے کہ ہم اپنی ٹھوس حقیقی محبت کے علاوہ باقی تمام واقعات لکھ سکتے ہیں۔ اس ضمن میں، میں اتنا تو آپ کو بتا سکتا ہوں کہ عبدالسلام کا ماننا تھا کہ اگر وہ اپنی معشوقاؤں کی ڈائریاں نہیں لکھتا تو ممکن ہے کسی کو بھول جاتا لیکن یہ واحد محبت تھی جسے نہ لکھنے کی وجہ سے وہ زیادہ شدید طور پر یاد رکھنے میں کامیاب تھا۔

عبدالسلام کو ہندوستانی فلمیں پسند نہیں تھیں۔ البتہ چند ہیروئنز کا ذکر وہ اکثر کیا کرتا۔ اسے ان کے نشیلے بدن، ان کی انگڑائیاں اور محبت کے منظروں میں ان کی آوازیں، (جو اشتہا انگیز ہوتی ہیں) اس کی دلچسپی کا مرکز تھیں۔ اپنے تجربات کی روشنی میں وہ کہتا: 'عورتیں عموماً محبت کے لمحوں میں مردہ پڑی رہتی ہیں۔' یہ مردانہ معاشرے کے نفسیاتی جبر کی انتہا ہے۔ جہاں عورتیں اپنے لذت آشنا لمحوں میں بھی بے حس، بے جان، بلکہ ایک لاش میں بدل کر رہ جائیں۔ وہ کہتا: 'افسوس! فلم کی ہیروئنز کو دیکھ کر بھی عورتیں کچھ سیکھ نہیں پاتیں۔ جس کا مطلب ہے اجتماعی فراموشی کی برف ان کے دماغ کے خلیوں میں ناقابل پیمائش حد تک سرایت کر چکی ہے۔' ایک بار جب اس موضوع پر بات ہو رہی تھی اور کسی نے اس سے پوچھا کہ جو آپ کہہ رہے ہیں وہ درست ہے تو پھر یہ بات بھی تو صحیح ہے کہ فلم کی ہیروئنز بھی تو عورتیں ہیں پھر ان کو کیسے یاد رہتا ہے کہ محبت کے لمحوں میں روح کا نغمہ کیسا ہوتا ہے۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے کہا تھا کہ مرد کی یادداشت میں یہ بات محفوظ ہے کہ عورت کی آوازیں اس پر کیا اثر مرتب کرتی ہیں اور یہ مناظر اسی یادداشت کا غیر شعوری اظہار ہے۔ مرد بنیادی طور پر ایسی عورت سے ہم آغوش ہونے کا متمنی

ہوتا ہے جس کی روح کے نغمات بھی وہ سن سکے لیکن عورت مرد کے معاشرے سے اس قدر خائف رہی ہے کہ اس کے اندر کی موسیقی، مرد کی یادوں میں اس کے بدن سے منور ہو جاتی ہے لیکن مرد کی موجودگی میں اسیرِ ذات ہو جاتی ہے۔ کچھ دوستوں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ جن تین دوستوں نے ایک آواز ہو کر کہا تھا کہ 'تری بات میں دم ہے۔' ان کی طرف دیکھ کر اس نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا تھا تم لوگوں کی بیویاں ہیروئنز ہیں کیا؟ ان تینوں کے علاوہ سارے دوست اس ریمارک پر بہت دیر تک ہنستے رہے۔

چند نامور شعراء کو چھوڑ کر باقی کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ یہ نا قابل حصول بدن پر ماتم کرتے ہیں۔ وہ کہتا: 'یہ کم بخت نہ محبت کرتے ہیں، نہ فطرت کے رمز شناس ہیں نہ ہی مذہبی و معاشی جدلیت سے واقف، جانے کیوں قافیہ ردیف ملاتے رہتے ہیں۔' اس کا خیال تھا کہ اردو ادب محبت کی رنگارنگی سے محروم ہے اور شاعری میں عورت کا تصور فلمی ہے۔

ایک بار کسی نے اس سے پوچھا: علامہ اقبال کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ اس نے جواب دیا۔ ''سب کو سینڈی لگا کر گیا ہے وہ، مردِ مومن بنائے نہیں جاتے، پیدا ہوتے ہیں۔ اقبال کے خیالات تھیریٹیکل ہیں، پریکٹیکل نہیں۔ اس کے باوجود

وہ ایک عظیم شاعر ہے۔''

مشاعروں کو وہ تماشا اور سیاست دانوں اور سیٹھ لوگوں کے ذوق کا سامان کہتا۔ مشاعرہ باز شعراء کو 'بد بخت بھانڈ' کہتا۔ کہیں اس نے لکھا بھی ہے کہ شعراء ایک ایسی نسل کے جانور ہیں جن میں نوے فی صد بد خصال اور نامراد ہوتے ہیں۔'

اردو افسانہ نگاروں کے بارے میں اس کی رائے تھی: 'یہ افراد کی واحد جماعت ہے جسے ان کے علاوہ نہ کوئی جانتا ہے، نہ مانتا ہے اور نہ پڑھتا ہے۔ یہ ایک دوسرے کی تحریریں پڑھتے ہیں اور خود ہی ایک دوسرے پر مضامین لکھتے ہیں۔ اس سے زیادہ پاگل پن اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ خود ایک دوسرے کو کافکا اور موپاساں کہتے ہیں لیکن دونوں کی تخلیقی دنیا میں فرق کرنے سے محروم ہوں۔ عموماً وہ یہ بات دہراتا اور خوب ہنستا۔ پھر کہتا: 'خدا بھی ایک افسانہ نگار ہے اور اس کی حالت اردو افسانہ نگاروں سے بری ہے۔' اپنی کتابوں کو وہی لکھواتا ہے، وہی پڑھواتا ہے اور خود ہی سنتا ہے۔ پھر اس سماعت پر پڑھنے والوں کو انعامات سے نوازتا بھی ہے۔ عجیب تماشا ہے۔ ایک بار اس طرح کی گفتگو میں اس نے کہا تھا: 'دراصل سب سے بڑا المیہ اسی افسانہ نگار کے ساتھ ہے۔'

آس پاس جو لوگ کھڑے تھے، وہ خاموش رہے۔ اس نے ان کے چہروں کو پڑھا اور کہا: 'آپ لوگ ڈرتے ہیں۔ سوچتے ہیں کہیں زبان سے کچھ الٹا سلٹا نکلا تو خدا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہمارے پیچھے پڑ جائے گا۔ جانے کن کن امراض یا قدرتی آفات کو جھیلنا پڑے گا۔' اس کے دوستوں نے کچھ نہیں کہا۔ ایک کا چہرہ، اکھڑا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر عبدالسلام نے کہا۔ 'بات صحیح ہے تیری۔ اللہ سے نہ زیادہ دوستی اچھی، نہ دشمنی۔'

دوست مسکرایا۔

سلام کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیلی ۔ پھر اس نے دل میں کہا: ’دیکھا خداجی! لوگ تجھے بمبئی کے پولس والے جیسا سمجھتے ہیں۔‘

(کچھ دیر بعد اسی مقام پر)

جانے کس خیال میں گم تھا۔ ایک دوست نے اس سے پوچھا: ’یار اب کیا سوچ رہے ہو؟‘

تب خیالات کے بھنور سے ابھرتے ہوئے اس نے کہا: ’اللہ کی جلوہ گری دیکھ رہا ہوں ۔ ہر چیز کو کس تناسب سے اس نے پیدا کیا ہے؟‘

سننے والے نے سبحان اللہ کہا۔ کچھ اور لوگوں کے بھی چہرے کھل گئے۔

ایک دوست کے قریب جا کر آہستہ سے اس نے کہا ’تناسب‘ کہا ہے میں نے، تو نے کچھ اور تو نہیں سن لیا نا۔‘ پھر گردن اونچی کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ دونوں کچھ دیر ایک دوسرے کو اسی کیفیت میں دیکھتے رہے۔

کچھ دیر بعد وہ نکڑ کی پان کی دکان پر پہنچا: ’ایک بھولا، کتری سپاری، اسٹار مار کر۔۔۔سب ’مناسب‘ ڈالنا۔

''ساب' مناسب' بولے تو کیا۔'' دکان پر بیٹھے لڑکے نے پوچھا۔
'مناسب مطلب جتنا میرے نصیب میں ہے۔' سلام نے کہا۔
لڑکا مسکرایا اور بولا: ساب مجاک اچھا مارتے ہو۔
دونوں مسکرائے اور جو ایک مبہم تلخی سلام کی ذات میں لہریں مار رہی تھی وہ کم ہوگئی۔

ایک دن:

صبح سے اس کا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ ایک طرح کی الجھن وہ محسوس کر رہا تھا۔ داخلی کم مائیگی اور انتشار سے نجات کی اسے ایک ترکیب نظر آئی۔ اس نے اندھیری اسٹیشن سے بس پکڑی اور سیدھے ماہم میں واقع سینٹ میری چرچ پہنچ گیا۔ چرچ مردوں، عورتوں اور بچوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس نے اپنے لیے تھوڑی سی جگہ بنائی اور وہاں سے عبادت میں منہمک افراد کے چہروں کے تاثرات کو پڑھنے لگا۔ خوب صورت لڑکی یا عورت پر نظر مرکوز ہوتی تو صرف چہرہ پڑھنے پر قناعت نہیں کرتا۔ تھوڑا فارم کا ذائقہ بھی چکھتا۔ اس کے بائیں طرف ایک شوخ حسینہ عبادت میں محو تھی۔ اس نے سرخ رنگ کی اسکرٹ اور اس پر سفید

ٹی شرٹ پہنی تھا۔ عبدالسلام نے اس کے چہرے کے دلکش خطوط اور اس کی سڈول ٹانگوں کو دیکھ کر سوچا: 'بدنصیب ہے وہ تخلیقی ذہن جو اس تحفۃ السرور سے محروم ہو۔' اس خیال کے ساتھ ہی اسے فیض احمد فیض کی ایک نظم یاد آئی جو کچھ دن پہلے اس نے U-tube سے عابدہ پروین کی آواز میں ڈاؤن لوڈ کی تھی۔ نظم کے کچھ مصرعے اسے یاد تھے:

ہائے اس جسم کے کم بخت دل آویز خطوط
آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسانے ہوں گے
اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

ان مصرعوں کو وہ زیرِ لب گنگنا رہا تھا کہ اس کی نظر ایک پرانے دوست پنکج پر جا ٹھہری جو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا ممبر تھا۔ دونوں کالج کے دنوں کے دوست تھے۔ اس وقت پنکج نے عبدالسلام کو کارل مارکس کی تھیوری سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی۔ پنکج چاہتا تھا کہ عبدالسلام بھی کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو جائے اور بائیں بازو کی اس تحریک میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کی نمائندگی کرے اور ان کی شرکت میں اضافہ کرے۔ عبدالسلام پنکج کی باتوں کو سن کر ہوا میں اڑا دیتا تھا۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ جس طرح وہ خدا کے وجود کے بارے میں لایقینی کا شکار رہے بالکل اسی طرح وہ خدا کے عدم وجود کے بارے میں بھی لایقینی کا شکار ہے۔ اس کا مزاج سیاست کے لیے موزوں نہیں تھا۔ اس بارے میں اس نے نجی ڈائری میں لکھا ہے کہ 'سیاست کی دلدل میں پھنسنے سے بہتر ہے میں ذات کی

دلدل میں ڈوبا رہوں۔' اس بات کا یہ مطلب ہرگز نہیں نکالا جاسکتا کہ وہ سیاست کے موضوع سے فرار کی کوشش کرتا تھا بلکہ جن لوگوں نے اس کے بارے میں مجھے زیادہ معلومات فراہم کی ہے ان کا کہنا تھا کہ اس کا سیاسی شعور بیدار اور بالغ تھا لیکن وہ سیاسی وسماجی سرگرمیوں سے الگ رہ کر زندگی کا مشاہدہ کرنے کو ترجیح دیا کرتا۔

پنکج کو گرجا گھر میں دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ اس نے سوچا یہ یہاں کیا لینے آیا ہے۔کیا اب کارل مارکس کی تھیوری میں خدا کے لیے بھی گنجائش پیدا ہوگئی ہے؟ سالا مارکس کہیں پیغمبرِ مارکسزم تو نہیں بن گیا؟

عبدالسلام کسی طرح پنکج کے پاس پہنچا۔

اس نے پنکج کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ مڑ گیا۔

اسے دیکھ کر پنکج استعجاب اور استفہام کی ایک ملی جلی کیفیت سے دو چار ہوا۔ پہلے تو عبدالسلام کو ایسا لگا پنکج کی بولتی بند ہوگئی ہے یا اس کے حلق میں کانٹا پھنس گیا ہے۔ اس نے سوچا۔۔۔ یہ سوچ رہا ہوگا کہ جس کو میں کمیونسٹ بنانا چاہتا تھا وہ اپنے خدا کو چھوڑ کر میرے خدا کے دربار میں کیا کر رہا ہے۔ کشش و پند میں پنکج نے سلام کیا اور اس سے ہاتھ ملایا۔ پنکج کی زبان سے جیسے ہی 'سلام یار' ادا ہوا اس کے آس پاس کھڑے عیسائی افراد ڈر سے گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ بات بگڑ جاتی اور پولیس ولیس کو بلایا جاتا، وہ دونوں چرچ سے باہر نکل گئے۔ دونوں چپ چاپ چلتے ہوئے ایک ملباری کے کیفے میں داخل ہوئے۔ پھر اپنی اپنی حیرانیوں کو چھپانے کے لیے یہاں وہاں کے سوالات ایک دوسرے سے پوچھتے رہے۔ چند منٹوں بعد دونوں کی حیرانی میں کچھ کمی واقع ہوئی تو دونوں نے ایک ساتھ پوچھا: 'تو ادھر کیسے؟'

دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ پھیلی۔
پنکج نے کہا: 'یار میری عورت رلجیس ہے اور اس کو ہیپی کرنے کے لیے کبھی کبھی آجاتا ہوں۔ وہ چرچ کے لوگوں کے ساتھ مل کر سٹریٹ پیپل کے لیے کام بھی کرتی ہے۔' پھر لہجہ درست کرتے ہوئے اس نے کہا: but i am still a communist۔ میرے کو گوڈ سے کوئی لینا دینا نہیں ہے، کھالی عورت کی happiness کے واسطے۔۔۔۔عبدالسلام سے رہا نہیں گیا اس نے پنکج کے جملے کے ختم ہونے سے پیشتر کہا: 'مسلمان آدمی اپنی عورت کی خوشی کے لئے خدا کو خوش نہیں کرتا۔ ہمارے ادھر یہ شرک ہے۔ لیکن ایک حساب سے تم خوش نصیب ہو۔ ہمارے یہاں atheist کو شاید گوڈ معاف بھی کر دے لیکن، مشرک کو نہیں۔ اپنی بات کہنے کے بعد اس نے' پنکج کو شرک اور مشرک کے معنی بھی سمجھائے۔
پنکج کے چہرے پر شرمندگی اور کنفیوژن کا ملا جلا ایک رنگ ابھرا۔ پھر وہ مسکرایا کہ مسکراہٹ تذبذب کو زائل کرنے کا آسان طریقہ ہے جس کا استعمال کرنے میں کمیونسٹ یوں بھی مہارت رکھتے ہیں۔
اب یہ بتا، تو چرچ میں کیسے؟ کرسچن بن گیا ہے کیا؟ پنکج نے کچھ دیر بعد پوچھا۔
'یار سن! جو اپنے دھرم کا پوری طرح سے نہیں ہوا۔۔ وہ چرچ کا کیا ہوگا۔'
'تو سالے پھر تو چرچ میں کیا کر رہا تھا؟'
'بات کیا ہے نا مئی کی چھٹیاں ہیں۔ گھر میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ سوچا چلو ٹائم پاس کرتے ہیں۔ اس لیے ادھر نکل آیا۔ ادھر ایک سے بڑھ کر ایک مال دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہمارے ادھر بس کالی بکریاں دکھائی دیتی ہیں۔' دونوں ہنس پڑے۔ پھر بہت دیر تک یہاں وہاں کی باتیں ہوتی رہیں۔ رخصت ہونے سے

قبل ایک دوسرے کے موبائل نمبر لیے اور ملاقات کا وعدہ کیا۔

کچھ دنوں بعد عبد السلام پنکج کے گھر گیا۔

حالات حاضرہ پر باتیں ہوئیں جس میں پنکج کی بیوی نے بھی حصہ لیا۔ عبد السلام کو یہ جان کر خوشی ہوئی کے پنکج کی بیوی کو انگریزی ادب سے خاصا لگاؤ ہے۔ دونوں میں انگریزی فکشن پر گفتگو ہونے لگی۔ پنکج کی بیوی کو کچھ کتابیں 'مابعد جدیدیت کی فلسفیانہ اساس' پر درکار تھیں جو اسے نہیں مل رہی تھیں۔ سلام نے اس موضوع پر اسے تین کتابیں دیتے ہوئے کہا: 'Thosewhocannotwritethey canliveinthelabyrinthoflinguistics.' پنکج کی بیوی کو اس جملے نے بہت متاثر کیا اور اس نے عہد کرلیا کہ وہ خالص ادب پڑھے گی اور غیر ضروری فلسفیانہ مضامین جو ادب کے نام پر لکھے جاتے ہیں ان میں وقت ضائع نہیں کرے گی۔ اس طرح ان میں ادب پر ایک مکالمہ شروع ہوا جس نے دونوں کو قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ایک دن سلام نے اس کے لیے ایک کتاب خریدی جس کا عنوان تھا 'memoriesofmymelonchoywhore' کتاب اسے دیتے وقت اس کی لپ اسٹک کا گلابی رنگ سلام کے رومال پر منتقل ہوگیا۔ جب گھر لوٹ کر اس نے رمال دھویا تو وہ یہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا کہ سرخ رنگ کا نشان پھیل کر مزید گہرا ہوگیا ہے۔ اس بات کا ذکر اس نے نجی ڈائری میں بھی کیا ہے اور 'داستانِ عشق' میں اس واقعے کو اس نے ایک ذیلی عنوان 'اس کے لبوں کی سرخی' دیا ہے۔ لپ اسٹک کے رنگ کی اپنی مہک تھی جسے عبد السلام کئی دنوں تک باتھ روم میں محسوس کرتا رہا۔ وہاں کامریڈ اپنی سیاسی سرگرمیوں میں جٹے ہوئے تھے یہاں یہ دونوں ادب اور رومان کی دنیا میں محو۔ یہ سلسلہ کامریڈ کے ٹرانسفر تک جاری رہا۔

کامریڈ ایک بینک میں ملازم اور بینک یونین کے لیڈر تھے۔

ٹرانسفر سے دو تین روز قبل:

عبدالسلام نے کامریڈ اور ان کی بیوی کو اپنے گھر مدعو کیا تھا۔ ہندستانی ٹریڈ یونین، روس کی تقسیم، کیرالا اور بنگال میں پارٹی کی صورت اور بائیں بازو کے ادب پر گرما گرم گفتگو ہوئی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد پنکج پر قیلولہ طاری ہوا۔ اس کی آنکھ لگنے پر سلام اس کی بیوی کو اپنی الماری کے پاس لے گیا۔

اس نے وہ رومال نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھا جس میں لپ اسٹک کی مہک کا احساس اس وقت بھی موجود تھا۔

اس عقیدت کو دیکھ کر جگر سوختہ امرتا کی آنکھوں میں ہلکے بادل پھیل گئے۔ اس نے رومال کو تہہ کر کے پرس میں رکھ لیا۔ عبدالسلام نے اس شام اس واقعے کو ڈائری میں نوٹ کر لیا تھا۔ 'امرتا کچھ دن اور جی لیے ہوتے' کے عنوان کے تحت اس نے دس صفحے تحریر کئے ہیں۔ ان صفحات پر اس کیف اور سرور کا اندراج تھا جو امرتا کے ساتھ بات چیت کر کے اسے حاصل ہوا۔ ایک پیراگراف میں اس نے لکھا ہے 'بعض اوقات اسے ایسا لگتا ہے کہ ذہنی ہم آہنگی کی کمی رشتوں کی موت کا ایک اہم سبب ہوتا ہے۔ عورت محبت میں جنس سے زیادہ ہم آہنگی، قرب، عزت، اور توجہ کی طلب گار ہوتی ہے۔' دوسری اہم بات جو ان صفحات میں اس نے لکھی ہے وہ یہ ہے کہ مرد کی خواہش عموماً عورت نہیں بلکہ اپنی خواہش کی تکمیل ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے مرد عموماً محبت کے جوہر سے محروم رہتا ہے۔ جبکہ عورت محبت کی متلاشی ہوتی ہے اور بیشتر اوقات اس کے حصول کے لیے سب کچھ داو پر لگا دیتی ہے۔ عزت نفس بھی اور زندگی بھی۔ اسی میں عورت کی فنا کے اسباب تلاش کئے جا سکتے ہیں۔

اس دنیا میں: سب برے نہیں ہیں پھر بھی:

ایک ایسے سماج میں جہاں اسفل سے اسفل کام ہو رہا ہو لیکن اس کا بیان ممنوع ہو، عبدالسلام جیسے آدمی کے لیے کئی دشواریاں تھیں۔ ایسے معاشرے میں جس کی بنیاد فریب، جھوٹ، مکاری اور خواہشاتِ نفسانی کے حصول پر ہو لیکن اظہار پر پابندی ہو۔ ایک ایسی زبان جو اس کے اطراف کے لوگ استعمال کرتے تھے اور جس میں زندگی کی سچائیوں پر پردہ ڈال کر اخلاقیات کے کھوکھلے نغمے گانے کا چلن تھا، وہاں شفاف باطن عبدالسلام خود کو کتنا لاچار سمجھتا ہوگا اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں ہے۔ اس کے مشاہدے میں ہر چیز متضاد اور پیراڈوکسیکل تھی۔ مثلاً ٹیچروں کا طبقہ جس سے اس کا تعلق تھا وہ یوں تو پڑھنے پڑھانے کی بات کرتا ہے لیکن خود نرا جاہل اور کبھی نہ پڑھنے والا طبقہ تھا۔ مذہب کی چادر میں لپٹے ہوئے افراد جو اس کے اطراف پھیلے ہوئے تھے اور ہر وقت دین دھرم کا پرچار کیا کرتے وہ فی نفس جابروں، مفسدوں اور امیروں کے طرف دار تھے۔ عوام کی بھلائی کے نام پر آئے دن ہڑتال اور جلسے کرنے والے بائیں بازو کے نادار لوگ عموماً بکاؤ یا پھر بے ضرر اور بے اثر تھے۔ ان سب کے درمیان اپنی شخصیت کے جوہر کی حفاظت کرنا اس کے لئے ایک چیلنج تھا۔ اس چیلنج کو قبول کرنے اور خود کو سماج کی جڑوں میں پیوست کرنے کی کوشش میں شاید اس کی شخصیت میں ایک انتشار در آیا تھا جسے وہ سمجھ نہیں پایا لیکن اس کی تحریروں کو پڑھ کر اس کی حالت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

عبدالسلام کا مشاہدہ تھا کہ پانچ وقت کی نماز پڑھنے اور بات بات پر شریعت کی دال بگھارنے والے افراد زیادہ تر لالچی، مغرور، بزدل، بے علم اور خود پرست ہوتے ہیں۔ مذہب کی روح اور روحانیت کی چاشنی ان کے ضمیر سے کوسوں دور ہوتی ہے۔ ان ساری باتوں نے اس کی دل شکستگی میں اضافہ کیا اور تشکیک اس کی روح میں ایک راہ بھٹکے ہوئے پرندے کی طرح آ کر بس گئی۔

دوسری طرف اس کے ملنے جلنے والوں میں جو کوئی جس کسی طبقے کی نمائندگی کرتا اس کے افعال،، نظریات اور شخصی برتاؤ میں تضاد اور راور غیر مبہم پیراڈوکسیکل حالت دکھائی دیتی۔ جس سے عبدالسلام کا اعتقادِ انسانی ایک حد تک کمزور ہو گیا تھا۔ وہ کہتا: 'لوگ جو نہیں ہوتے ہیں وہی ہونے پر اصرار کیوں کرتے ہیں۔' اس کی اس حالت کا برملا اظہار اس جملے میں ملتا بھی ہے جو اس نے اپنے مضمون 'آدمی اور انسان: ایک ازلی کشمکش، میں کوٹ کیا تھا' کیا فائدہ اس دنیا میں رہنے کا جس میں آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، زبان اسے جھٹلاتی ہے۔' دراصل یہ جملہ اردو نقاد وارث علوی کا ہے لیکن اس نے غلطی سے وارث علی شاہ بابا صورتی لکھ دیا تھا۔ یہ بھی وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ غلطی اس سے سرزد ہوئی تھی یا اس کے پس پردہ کوئی شرارت تھی۔

زندگی کے تضاد نے عبدالسلام کو بدظن کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ ایک طرح کے احساسِ زیاں میں بھی گرفتار ہو گیا۔

کچھ لوگوں نے بتایا کہ نوجوانی میں وہ لوگوں سے الجھا کرتا تھا۔ ان کے دوغلے پن اور ان کے جھوٹے بیانات کا تجزیہ کر کے وہ ان کی شخصیت کا دوغلہ پن ان کے سامنے پیش کرتا۔ لیکن بہت جلد شاید اسے اس بات کا احساس ہو گیا کہ اگر

وہ مستقل اس راستے پر چلتا رہا تو وہ دن دور نہیں جب وہ الگ تھلگ پڑ جائے۔ لوگ اسے خبطی اور مفسد کہیں گے۔ بعض اس پر بے دین ہونے یا گمراہ ہونے کا لیبل چسپاں کر دیں گے۔ اس سماج میں کسی کو تنہا کرنے کا سب سے آسان ہتھیار یہی ہے کہ اس پر 'بے دین' ہونے کا لیبل لگا دیا جائے۔ بلاشبہ لوگ اس ہتھیار کا استعمال کرنے میں پیدائشی طور پر فعال واقع ہوئے ہیں۔

جس دنیا سے وہ آیا تھا:

اس کے بچپن کے دو دوست رفیق اور شفیق معاشی بدحالی اور ذہنی تناؤ کے سبب پاگل پن کے قریب پہنچ گئے تھے۔ یوں تو وہ کسی سے بات چیت نہیں کرتے تھے لیکن ہر وقت ایک ہنگامہ سا بپا کیے رہتے۔ گالیاں بکتے اور توڑ پھوڑ کرتے۔ صرف مسلمانوں کے خدا کو نہیں بلکہ دنیا کے تمام مذاہب کے خداؤں کو وہ سرِعام گالیاں بکا کرتے۔ عبدالسلام ان سے کبھی کبھار ملنے جاتا تو لوگ حیران رہ جاتے کہ ان پاگلوں کو کیا ہو جاتا ہے جو اس کے روبرو چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ ان سے بڑے اشتیاق سے باتیں کیا کرتا۔ وہ خلاء میں نظریں مرکوز کیے اس کی باتوں کو سنتے رہتے۔ کسی نے عبدالسلام سے اس راز کو جاننا چاہا تو اس کی زبان سے برجستہ یہ جملہ ادا ہوا تھا: 'میں انھیں صرف اتنا بتاتا ہوں کہ خدا نے اور کس کس کے

ساتھ ناانصافی کی ہے۔'

یہ سن کر شاید انھیں اپنا دکھ کم اور پاگل پن غیر واجب لگتا ہوگا۔ یا شاید وہ مجھے پاگل سمجھ کر چپ ہوجاتے ہوں گے۔ کیوں؟

سوال پوچھنے والا مسکراتے ہوئے گزر گیا۔ عبدالسلام نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا: 'کس قدر پاگل پن ہے یار؟ کنٹرول نہیں کرسکتا کیا' لیکن فوراً اسے نطشے کا جملہ یاد آیا کہ 'خدا نے نوے فی صد احمق اسی لیے پیدا کئے ہیں تاکہ اس کی حکمرانی برقرار رہے۔ اس کے معتقد اکثریت میں رہیں۔'

ویسے عبدالسلام یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ دنیا کا کاروبار خدا نے ان ہی دس فی صد لوگوں کے ہاتھوں میں تھما رکھا ہے، جن کو خدا سے کوئی خاص رغبت نہیں! ان دس فی صد افراد نے خدا کے نام پر باقی ماندہ نوے فیصد لوگوں کو یرغمال کر رکھا ہے۔ جب پہلی بار یہ خیال اس کے دل میں آیا تھا۔ تب ایک مسکراہٹ کے ساتھ اس کی زبان سے ادا ہوا: 'یار۔۔تو کس کے ساتھ ہے؟ جو تیرے ساتھ رہتے ہیں شاید تو ان کے ساتھ نہیں رہتا ہے۔ جو تیرے ساتھ نہیں رہتے ہیں بس کہتے ہیں تیرے ساتھ ہیں۔۔۔تو ان کے ساتھ اکثر نظر آتا ہے۔ تیری غیر جانب داری پر بھی شک ہے۔ پارٹی بدلنے میں تجھے وقت نہیں لگتا؟ تو مکّے میں ابوسفیان کے ساتھ تھا۔ کربلا میں یزید کے ساتھ ہوگیا۔ جرمنی میں تو نے ہٹلر کا بھی خوب ساتھ دیا۔ یہاں کئی برسوں سے افغانستان اور عراق کی معصوم عوام کے قاتل امریکہ پر بھی تیرا آشرواد نظر آتا ہے۔ تیرا ریکارڈ بہت خراب ہے جسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ تو طاقت ور اور اقتدار کے ساتھ ہوجاتا ہے۔۔۔کیوں؟؟

ہاہاہاہا۔۔۔

کچھ دیر بعد پھر اس نے آہستہ سے کہا: 'تو ہوتا تو اتنا غیر منصف نہیں ہوتا۔ شاید تو نہیں ہے! کیوں بھئی؟'

رفیق کا پاگل پن گزرتے وقت کے ساتھ بڑھتا گیا۔ اس کی بڑی بہن کی شادی احمد آباد کے ایک تاجر گھرانے میں ہوئی تھی لیکن ابھی صرف تین مہینے گزرے تھے کہ احمد آباد پر ایک قدرتی آفت ٹوٹ پڑی۔ مقامی مسلمانوں نے بتایا کہ دل کو دہلا دینے والی بجلی کی گرج کے ساتھ رات کے دوسرے اور تیسرے پہر خون کی بارش ہوئی، جسے صبح حکومت نے یہ کہہ کر جھٹلایا کہ اصل میں برف باری ہوتی رہی ہے۔ جن لوگوں کو خون کی بارش نظر آئی ان کا پاگل خانے میں علاج کیا جائے گا۔ یہ پاگل خانے حکومت اور وی ایچ پی کمپنی آف بجرنگ دل کے تعاون سے مسلمانوں کے علاج کے لیے ان ہی دنوں تعمیر کئے گئے تھے جس میں پولیس بطور ڈاکٹر تعینات تھے۔ خون کی بارش گجرات کے کئی اضلاع میں ہوتی رہی لیکن جو تصاویر حکومت کے ماتحت میڈیا میں جاری کی جاتی ان سے ایسا لگتا تھا کہ موسم خوشگوار ہے اور کہرا کی ایک چادر نے شہر کو اپنی آغوش میں لے رکھا ہے۔ لیکن مقامی لوگوں نے بعد میں اپنے اقارب کو بتایا پہلے پہل تو خون کی موسلا دھار بارش ہوئی بعد میں چیدہ چیدہ گھروں کو یکا یک آگ لگ جاتی تھی جس

میں پہلے گھر کے مکیں جل کر خاک ہوتے تھے۔ اس کے بعد گھر کے اندر کا ساز و سامان ہوا میں اڑ کر حکومت کے کارندوں اور رضا کاروں کے گھروں میں منتقل ہو جاتا پھر آگ گھر بار کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ مکان جلتا رہتا۔ چیخیں آگ کے شعلوں میں بے ہوش جلتے ابدان کی حلق سے نکلنے کا راستہ بھول جاتیں اور دل کی شریانوں میں قید ہو جاتیں۔

ایسی ہی ایک خوں آشام رات رفیق کی بہن اور شوہر بھی آگ میں بھسم ہو گئے۔ حکومت نے بعد میں اس یکا یک لگنے والی آگ کے بارے میں یہ بیان دیا کہ زلزے کے بعد والے جھٹکوں سے ایسا ہوا تھا۔ جب رفیق کو اس کی بہن کی موت کی خبر دی گئی تو اس پر خاموشی کے بادل چھا گئے۔ وہ تین دنوں تک گنگ ہو کر آسمان کو دیکھتا رہا۔ چوتھے روز بھی لوگوں کو ایسا لگا کہ وہ آسمان میں کچھ ڈھونڈ رہا ہے لیکن اس روز اس کی سراسیمہ روح دنیا کو خیر باد کہہ چکی تھی۔

البتہ چار پانچ برسوں کے مستقل علاج سے شفیق ٹھیک ہو گیا تھا۔ اس سے میری ایک ملاقات ہوئی۔ میں نے عبدالسلام کی زندگی کے بارے میں اس سے کچھ جاننا چاہا۔ پہلے اس نے انکار کر دیا۔ لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ میں اس کی لکھی گئی کتابوں کو شائع کرنے والا ہوں اور اس کی زندگی پر ایک تفصیلی مضمون لکھ رہا ہوں تا کہ لوگ اس کی تحریروں کے رمز کو سمجھ سکیں۔ تب اس نے مجھے کچھ اہم باتیں بتائیں۔ جن کو جاننے کے بعد عبدالسلام کی زندگی میں میری دلچسپی اور بڑھ گئی۔ میں نے اس کی تحریروں کو بغور پڑھنا شروع کیا۔ ان مقامات کی سیر کی جن کا ذکر اس کی ڈائریوں میں تھا اور کئی لوگوں سے ملاقات کی تا کہ اس کی شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں کو سمجھ سکوں اور جو موشگافیاں، اشارے کنائے اور ابہام اس کے مختصر جملوں اور طویل عبارتوں میں نظر آتا ہے، اس کی تفسیر کا امکان پیدا ہو۔

اس کی کچھ بظاہر غیر منطقی باتیں:

عبدالسلام بھارت کی تاریخ کے بارے میں عجیب وغریب باتیں کیا کرتا۔

دوستوں کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے، یا کمرۂ جماعت میں دورانِ تدریس کبھی کبھار عبدالسلام بھارت کی تاریخ کے بارے میں عجیب اور غیر روایتی باتیں کرتا۔ مثلاً ایک دن بچے علامہ اقبال کی نظم ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' گارہے تھے۔ ایک طالبِ علم نے پوچھا: 'سر کیا یہ بات سہی ہے کہ یونان، مصر، اور روم مٹ گئے ہیں؟'

عبدالسلام کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ اس نے سوال پوچھنے والے طالب علم پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا: 'بیٹا! اقبال صاحب بے وقوفی کی باتیں زیادہ کیا کرتے تھے۔ جتنے بڑے علامہ وہ کہلاتے ہیں اتنے تھے نہیں۔ مبالغہ ان کی پہچان ہے۔ بلکہ اردو شاعری سے مبالغہ کی لعنت کو نکال دیا جائے تو صرف غازہ، گیسو اور غمزہ بچ جائے گا۔ یونان مصر اور روم کی تہذیب، بھارت سے زیادہ طاقت ور نہیں تو کم بھی نہیں تھی۔ علامہ اقبال کی شاعری۔۔۔ یا کسی بھی شاعر۔۔۔ سیاست داں اور فلمی ڈائلاگ میں۔۔۔ اس ملک کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے اس پر

کبھی یقین مت کرنا۔اس ملک میں بغیر تحقیق ۔۔۔بغیر چھان پھٹک ۔۔۔جذباتی باتیں گھڑی جاتی ہیں۔بلکہ تاریخ کے معاملے میں تو جھوٹ ۔۔۔سوچ سمجھ کر کہا جاتا ہے۔'

کلاس کے طلبہ اس کی باتوں کو (خاص کر جب وہ تھوڑا جذباتی ہو جاتا تھا) دھیان سے سنتے تھے۔

اس نے دس منٹ متواتر اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔اس کا آخری جملہ جو ایک طالب علم نے اپنی بیاض میں لکھ لیا وہ یہ تھا: 'تہذیبیں تاریخ ہوتی ہیں۔تاریخ نا قابل ترمیم ہے۔جو ہوا سو ہوا، جو ہوا وہ جس طرح سے بتایا گیا ہے اسی طرح ہوا یا نہیں اس کی تحقیق ممکن ہے۔'

میں یہ بات آپ کو بتا چکا ہوں کہ بعض اوقات اس کی باتوں میں ابہام در آتا اور سننے والے کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر رہ جاتے۔لیکن اس کے طلبہ اس کی باتوں کے عادی ہو گئے تھے۔کبھی کبھی وہ کمرۂ جماعت میں ایسے الفاظ بھی استعمال کرتا جو ادق ہوتے اور بیشتر طلبہ کو حصول معنی میں دقت پیش آتی۔چوں کہ طلبہ اس سے محبت کرتے تھے اور اس کی باتوں کو ایک عالم کی باتوں کا درجہ دیتے تھے اس لیے انھوں نے اس کا حل بھی تلاش کیا تھا۔دوسرے دن کلاس کا مانیٹر لغت سے ان الفاظ کے معنی تلاش کر کے لاتا اور بورڈ پر لکھ دیتا اور پھر دیر تک کلاس میں کہرام مچا رہتا جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مانیٹر جو عبدالسلام کو اپنا روحانی گرو تسلیم کرتا تھا وہ اس کے بتائے گئے معنی کی دوبارہ وضاحت کرنے کی کوشش کرتا۔ یہ سب فری پریڈ میں ہوتا۔اسکول میں خواتین معلمات زیادہ تھیں اور وہ اپنے پریڈ میں عموماً جماعت سے غائب رہتیں۔ایک طالب علم نے ایسے ہی ایک واقعے

کا ذکر کیا کہ ایک روز وہ ڈرامے کے فن پر طلبہ سے مخاطب تھا۔ خیالات کی بے ترتیبی کی وجہ سے بچے سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ وہ اصل میں کیا کہہ رہا ہے۔ تب ایک طالب علم نے جسارت کی اور کہا: 'سر! میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔'

وہ رک گیا۔ مسکرایا۔ پھر اس نے کہا: 'میری بھی سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔'

کچھ دیر وہ خلا میں جانے کیا دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا: 'ایسی حالتیں بھی ڈرامہ ہیں۔'

سارے طلبہ ہنس پڑے۔

سلام نے کتاب بند کر دی اور طلبہ سے لطیفے سنتا رہا۔ پریڈ ختم ہونے کی بیل بجنے سے ایک منٹ پہلے طلبہ کو دوبارہ مخاطب کر کے اس نے کہا: ' یاد رکھنا! صرف لطیفے ڈرامے نہیں ہوتے ہیں۔' اتنا کہہ کر وہ کمرۂ جماعت سے نکل گیا۔ کلاس کنٹرول کے لیے مانیٹر کھڑا ہوا۔ اس نے تختۂ سیاہ پر شرارت کرنے والے طلبہ کے رول نمبر لکھنے کے بجائے لکھا: ''جو کچھ ہو رہا ہے وہ ایک لطیفہ ہے اور ہم جس اسکول میں ہیں وہ بھی ایک لطیفہ ہے۔'' ساری کلاس قہقہہ بردار ہوئی، شور کلاس کی دیواروں کو عبور کر کے پہلے اسٹاف روم تک پہنچا پھر پرنسپل کی آفس میں داخل ہوا۔ دو تین معلمات جو اپنے ٹفن دھو رہی تھیں۔ شور سنتے ہی اس طرف آئیں۔ لیکن بچوں کے قہقہوں کے سیلاب میں ان کی آواز بے اثر ثابت ہوئی۔ بالآخر پرنسپل کو آ کر ان سے اس بات کی وجہ دریافت کرنا پڑی کہ وہ کیا بات ہے جس کے سبب وہ اس قدر قہقہے لگا رہے ہیں کہ چھ ٹیچرز انھیں خاموش کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں اور خود کلاس کے باہر کھڑے رہ کر اپنی ناکامی پر قہقہہ لگا رہے ہیں۔

لیکن اس وقت تک سارے بچے بے زبان ہو گئے تھے۔

کیا انھیں ادراک ہو گیا تھا کہ 'یہ بھی ایک لطیفہ ہے۔' اس لائن میں اور کیا معنی پوشیدہ ہیں۔ اس جملے میں ان کی زندگی کا کتنا درد کتنا انبساط پوشیدہ ہے۔ درد اور انبساط کو کہیں بیان کیا جا سکتا ہے؟

پرنسپل شاعر آدمی تھے اور طلبہ پر ان کی دہشت قائم تھی۔ وہ جس کلاس سے انتقام لینا چاہتے اس جماعت میں دو تین گھنٹے اپنے غیر مطبوعہ کلیات کی غزلیں سنایا کرتے۔ ممکن ہے ان کو دیکھ کر، طلبہ اس ڈر سے چپ ہو گئے ہوں کہ پھر انھیں نان اسٹاپ دنیا کی عظیم شاعری سننا پڑے گی۔ پرنسپل نے جن جماعتوں میں اپنا کلام سنایا تھا اس جماعت کے طلبہ کا بیان ہے کہ پرنسپل شاعری شروع کرنے سے پہلے یہ بھی کہتے ہیں کہ کسی پڑھے لکھے آدمی (جس کا نام وہ بابر مہدی بتاتے ہیں) نے ایک بار یکسوئی میں ان کو بتایا ہے کہ ان کی شاعری دنیا کی عظیم شاعری میں شامل ہوتی ہے۔ یہ بات جب عبدالسلام کی جماعت کے مانیٹر نے اسے بتائی تب اس نے کہا تھا کہ بابر مہدی دراصل ازبیک زبان میں ایک ایسے پرندے کو کہتے ہیں جو اکثر گدھوں پر سواری کرتا ہے، لیکن گدھوں کو اس بات کا احساس نہیں ہوتا۔ مانیٹر اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ وہ دیر تک ہنستا رہا۔ اس نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی کہ سلام کی نگاہ میں پرنسپل کی حیثیت کیا ہے۔

اس کا مکان اور اس کا دل:

عبدالسلام چار بنگلہ، (اندھیری، ممبئی) میں ایک سات منزلہ عمارت میں رہتا تھا۔ اس کا فلیٹ گراونڈ فلور پر تھا۔ فلیٹ میں داخل ہوں تو سامنے الماری میں قرآن مجید کی پانچ کاپیاں (دو انگریزی تراجم، دو اردو تراجم اور ایک عربی زبان میں) تبلیغی نصاب کی اردو ہندی جلدیں، بہشتی زیور، تاریخ انبیاء، مختصر شافعی فقہ کی تین جلدیں، مسنون دعائیں، جماعت اسلامی کے امیر مولانا مودودی کی کتابیں 'خلافت وملوکیت' اور 'پردہ' کے ساتھ ساتھ چند اور مقبول مذہبی کتابیں تھیں۔ فرش پر ایرانی قالین بچھا ہوا رہتا۔ ایک عمدہ صوفہ تھا۔ دیوار پر سونی کا فلیٹ ٹی وی ،جس کے نیچے اونیڈا کمپنی کا ڈی وی ڈی پلیر۔ ڈی وی ڈی پلیر پر ہندستانی گل بوٹوں کی چھاپ والا پردہ پڑا رہتا۔ دیوار پر ایک اسلامی کیلنڈر، ایک زرد رنگ گھڑی۔ دوسری دیوار پر ایک بڑی سی فریم تھی جس میں مخمل کے کپڑے پر قرآنی آیات، خطاطی کا عمدہ نمونہ تھیں۔ فرش پر دیدہ زیب ٹائلس لگی ہوئی تھیں۔

بیڈ روم سے متصل ایک چھوٹا کمرہ تھا جس میں صرف اس کے دیرینہ دوستوں کو آنے کی اجازت تھی۔ اس خاص کمرے کے دروازے پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا Dead People's Conference Room۔ جنھیں اس کمرے میں رسائی حاصل تھی صرف انھیں پتہ ہوگا یہ کمرہ عبدالسلام کے دل کی طرح گنجلک تھا۔ اس کمرے میں ہر طرف کتابوں اور فائلوں کا انبار تھا۔ اردو اور انگریزی ادب کا نمائندہ انتخاب آپ کو نظر آئے گا۔ دیوار پر ایک کاغذ کا ٹکڑا چپاں تھا جس پر نیلی روشنائی میں تحریر تھا: 'کتابیں: زندہ درگور لوگوں کا ندبہ ہیں۔ آؤ! ان سے رونے کے آداب سیکھیں۔' ایک جگہ پنسل سے دیوار پر تحریر تھا: ''سچ دراصل جھوٹ ہے۔'' اس کمرے میں کھڑکی کے پاس دو چھوٹے گملے تھے۔ ایک میں زربیل کا پودا اور دوسرے میں کوئی

جنگلی گھاس تھی۔ سلام کا کہنا تھا کہ ان دونوں میں ایک خاص رشتہ ہے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا کہ زربیل اور جنگلی گھاس میں کیا رشتہ ممکن ہے؟ اگر کوئی جاننا چاہتا تو اس کا جواب ہوتا: 'خود غور کیجئے۔ آپ جان لیں گے۔' لیکن ایسی باتوں پر غور کرنے کے لئے اضافی وقت کس کے پاس تھا۔ ایک روز دوستوں نے اصرار کیا کہ وہ خود بتائے کہ زربیل اور جنگلی گھاس میں اسے کیسا رشتہ نظر آتا ہے۔ وہ راضی ہوگیا۔ اس نے کہا:

رمضان عید کی شام میں آپ کو دعوت پر بلاؤں گا، تب بتاؤں گا۔

بعض اس بات کو مذاق سمجھ کر بھول گئے۔ دو ایک دوستوں کو اشتیاق رہا۔

اپنے وعدے کے مطابق سلام کو یہ بات یاد تھی۔ عید کے دن وہ دیر تک سوتا رہا جب سورج نصف النہار پر آ کر ہنسنے لگا تب دوستوں کو فون کر کے عید کی مبارک باد دی اور کہا: 'آیئے! زربیل اور جنگلی گھاس کے رشتے کا راز جاننا ہے نا؟'

جن کے پاس وقت تھا وہ اس کے گھر پہنچ گئے۔ سلام دعا کے بعد کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں پھر اس نے کہا: 'اب سنو! زربیل اور جنگلی گھاس میں کیا رشتہ ہے۔'

سب نے کہا جلدی بتائیے۔

'ایک ہی رشتہ ہے۔' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

'کیا؟' استعجاب کے ساتھ سب نے کہا۔

وہ خموش ان کو دیکھتا رہا۔

دوستوں کو لگ رہا تھا کہ وہ انھیں بے وقوف بنائے گا۔

ان کے فق ہوتے ہوئے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے کہا: "دونوں

مٹی کی شکلیں ہیں۔ایک ہمارے لیے زر کی علامت ہے دوسری رائیگانی کی۔۔۔یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ بے معنی ہونے کی۔ دوست اس کے چہرے کو تاک رہے تھے۔اس نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا:'جب تک ان دونوں کی اہمیت دل میں یکساں نہیں ہوگی۔خدا آپ کی سمجھ سے دور ہوگا اور اسی سبب خوشی منانے کے لیے آپ کو کسی طے کردہ دن کی ضرورت پڑتی رہے گی۔جیسے عید کا دن۔۔۔'

اس کے آخری جملے سے دوستوں کو مایوسی ہوئی۔ مایوسی کے احساس کو زائل کرنے کے لیے وہ ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

ان کے مرجھائے ہوئے چہروں کو دیکھ کر اس نے کہا:'مجھے ہر دن عید سا لگتا ہے۔کوئی دن دوسرے سے افضل یا کمتر نہیں ہوتا۔'

اس جملے سے یکا یک در آیا سنّاٹا مزید گہرا گیا۔ماحول کی کثافت کو اس نے محسوس کیا۔فوراً غیر متوقع خاموشی کو خوش گواری میں بدلنے کی نیت سے اس نے کہا: 'بریانی دلی دربار سے منگائی ہے،۔۔۔آپ تو سنجیدہ ہو گئے۔کم از کم عید کے دن تو مسکرائیے۔آؤ بھئی بریانی کھاتے ہیں۔'

دوست مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے ڈائننگ ہال کی طرف بڑھے۔

تب اس نے دل میں کہا:'دیکھا! تیرے بندوں کو میں نے عید کے دن بھی رنجیدہ کر دیا۔تو کیوں انھیں فرضی خوشیاں دینے کے وعدے کرتا ہے۔تیری اسی حرکت کی وجہ سے انھیں فطری طور پر خوش رہنے کی عادت نہیں پڑتی۔'اس دن کا تذکرہ اس نے نجی معاملات کی ڈائری میں کیا ہے۔وہ چاہتا تھا کہ لوگ خوش رہنے کے لیے کسی خاص دن کا انتظار نہ کریں بلکہ روزمرہ کی زندگی سے لطف اندوز ہونے کے عادی ہوں تاکہ زندگی کی سنگلاخی کا مقابلہ کرنے کی لیاقت میں اضافہ ہو۔

اس کے کمرے میں ان دو گملوں کے علاوہ ایک صندوق تھا جس میں پرانے قلم تھے جو بے مصرف ہو چکے تھے۔ لیکن ان بے مصرف قلموں کے ساتھ اسے ایک طرح کی عقیدت تھی۔ وہ کہتا: 'جب آدمی خیالات کو کاغذ پر اتارنے سے محروم ہو جاتا ہے، تو قلم اپنی ذمے داری نبھاتے ہوئے ازخود نئے افکار تحریر کر لیتے ہیں۔ بعض بے روح تصور کیے جانے والے قلم ادیب سے زیادہ ذہین اور حساس ہوتے ہیں۔ اس لیے انھیں مردہ سمجھ کر پھینکنا نہیں چاہیے۔' قلم دان سے لگ کر فائلوں میں ایک بہت ہی خاص فائل تھی جسے اس کی زندگی میں کسی کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ خود بھی اسے بہت کم کھولتا تھا۔ جو کچھ اس میں ہے۔ وہ اتنا ذاتی اور قیمتی ہے کہ کسی سے شیئر نہیں کیا جا سکتا۔ گویا یہ اس کے دل کا سب سے پوشیدہ باب تھا جس میں اس کی ذات کی سب سے زیادہ نا قابل بیان یادیں محفوظ تھیں۔ ایسا خفیہ گوشہ ہر آدمی کے دل میں ہوتا ہے، گویا یہ وہ محور ہوتا ہے جس پر شخصیت کے اسرار رقص کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار شب کی تنہائی میں جب عبدالسلام کے دل کی ویرانی میں انجانی طغیانی در آتی اور ہر ایک لمحہ، لمحۂ گریزاں بن جاتا اور اس گریزاں لمحے کا خالی پن موجزن سکوت بن کر اس کے دل پر موت کا اندھیرا پھیلا دیتا تب وہ اس فائل کو شب کی خاموشی اور کمرے کی مہیب تاریکی میں ٹٹول کر کھولتا اور کاغذوں کے انبار سے ایک بوسیدہ تصویر کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیتا۔ آنسوؤں کو پلکوں کی تسبیحوں سے دباتے ہوئے وہ اس تصویر کو اپنی چھاتی سے لگاتا۔ پھر آنکھوں کو دیر تک تنہائی میں بہنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتا۔ اس کی پوری زندگی میں ۲۳ بار وہ اس حالت سے گزرا ہے۔ شاید یہ اس لڑکی کی تصویر ہوگی جس کی داستان وہ 'داستانِ عشق' میں کبھی قلمبند نہ کر سکا۔ اس آواگون سی کیفیت سے

وہ جب بھی گزرا ہے دوسرے دن اس نے سرخ روشنائی سے اپنی نجی ڈائری میں ہر بار یہ شعر نقل کیا ہے:

کب تک رہے گا روح پہ پیراہن بدن
کب تک ہوا اسیر رہے گی حباب میں

یہ تصویر اسی لڑکی کی ہوگی اس نتیجے پر پہنچنے میں مجھے بھی بہت وقت لگا ہے۔

اس نے جب بھی یہ شعر لکھا ہے، ساتھ ہی نمبر شمار لکھا ہے، جو کل ۲۳ ہیں۔لیکن صرف ان نمبرات کو دیکھ کر ان کا رشتہ اس کی روح کی اداسی سے لگانا غیر مناسب ہوتا۔جب میں نے 'داستان عشق' کے تیسرے مسودے کا مطالعہ کیا، اس کے چھٹے پیراگراف سے مجھ پر اس شعر اور اس کے نیچے لکھے گئے نمبر کا راز کھلا۔اس نے لکھا ہے، ایک محبت ایسی بھی ہے جس کی یادیں اس کے سینے میں تیر کی طرح پیوست ہیں۔کبھی کبھی وہ اس کے دل میں کروٹ لیتی ہیں تب اسے ایسا لگتا ہے کہ اس درد کا مداوا موت کے علاوہ کچھ اور نہیں۔آگے اسی پیراگراف میں اس نے لکھا ہے کہ جب بھی وہ اس حالت سے گزرتا ہے اسے شکیب جلالی کا ایک شعر بہت یاد آتا ہے اور اس کی انگلیاں از خود اس شعر کو ڈائری میں اتارتی ہیں۔شعر نقل کرنے کے ساتھ ساتھ وہ دن اور تاریخ بھی لکھا کرتا تھا۔شاید اس کا سبب یہ ہو کہ وہ اس بات کو یاد رکھنا چاہتا تھا وہ کب کب اس ہولناک کیفیت سے گزرا ہے جب اس کا دل خودکشی کی طرف اس کو بلاتا رہا ہے۔اس کیفیت کو خود اسی نے ایک جگہ 'کیفیتِ آواگون' تحریر کیا ہے اور میں نے اس کی کاپی کرنے کی کوشش کی ہے۔مجھے اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ اس اصطلاح سے اس کی کیا مراد تھی میں سمجھ نہیں سکا۔ہوسکتا ہے آپ میں سے کچھ لوگ سمجھ جائیں۔

اس کے دوستوں نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے مکان کو سلیقے سے رکھنے کی کوشش کرتا۔ نئے پردے، نئی پینٹنگز، نئے گلاس، عمدہ پائدان، اچھی خوشبوئیں اس کے مزاج کا حصہ تھیں مگر کبھی کبھار کچھ چھوٹی موٹی چیزوں کو بدلنے میں بھی اسے خاصا وقت لگ جاتا مثلاً ایک مرتبہ اس نے بازار سے دروازے میں لگایا جانے والا eye hole خریدا اور سوچا خود ہی فٹ کر دے گا۔ عجلت میں اس نے 'آئے ہول' لگایا اور اسکول چلا گیا۔ شام کو واپسی کے بعد آرام کر رہا تھا کہ دروازے پر غیر متوقع دستک ہوئی۔ وہ دروازہ کھولنے کے لیے بڑھا تو اسے خیال آیا کہ دیکھتے ہیں کہ اس وقت کون آیا ہے۔ اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ حیران ہوا۔ اس نے دوبارہ ہول میں جھانکا۔ اسے سوائے اندھیرے کے اور کچھ نظر نہیں آیا۔ اس نے زیرلب کہا: 'کیا اس طرف اللہ میاں آگئے ہیں۔'

دو تین بار دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ اس کا ایک دوست تھا۔

دوست قہقہہ لگا رہا تھا۔

'کیوں ہنس رہے ہو یار؟' اس نے پوچھا۔

'کیا ہوا؟ اس نے پھر کہا۔

دوست نے ہنستے ہوئے کہا: 'پہلے یہ بتاؤ یہ eyehole کس نے فٹ کیا ہے۔ مجھے باہر سے تمہاری آنکھ نظر آ رہی تھی۔'

عبدالسلام کی زبان سے ادا ہوا ''واٹ'' پھر وہ خود باہر کی طرف گیا۔ اس نے باہر سے جھانکا۔ اس کا کمرہ، اسے اصل سے کچھ بڑا نظر آیا۔ اسے اپنی حماقت پر ہنسی آئی۔

کئی دن گزر گئے لیکن eyehole کو ٹھیک کرنے کی اسے فرصت نہیں ملی۔ اس بارے میں کوئی اس سے سوال کرتا تو اس کا جواب ہوتا ''I believe in transparency''

رفتہ رفتہ احباب دستک دینے سے پہلے کمرے میں جھانکنے کے عادی ہو گئے۔ اسے بھی اس بات کا احساس تھا وہ سوچتا: 'خدا تو نے ایک کام اچھا کیا کہ اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ قیامت کے دن تو لوگوں کو ان کی ماؤں کے نام کے ساتھ مخاطب کرنے والا ہے۔ ورنہ ان منحوسوں کو کتنی مایوسی ہوتی۔' ایک بار اس خیال پر اسی ہنسی آئی تھی، پھر اس نے سوچا: 'خدا کی دانشوری پر مجھے رشک ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے خدا ہو اور مسکراتا بھی ہو۔' پھر آسمان کی طرف دیکھ کر اس نے آنکھ ماری اور کہا: 'تو جانتا ہے نا۔۔۔ ہماری پرانی بلڈنگ کی حمیدہ سید اور کلثوم پٹھان کے بچے میرے کیا لگتے ہیں؟ انگلیوں کو اپنے ہونٹوں پر لا کر ایک بوسہ اس نے فلک کی طرف خدا کے لیے اچھال دیا۔

دانش مند قاری! اگر میں اس واقعے کو ناول میں شامل کروں گا تو مجھ سے یہ مت پوچھنا کہ وہ بوسہ ربِ کائنات تک پہنچا، یا فرشتوں نے درمیان میں اسے 'کٹ' کر کے 'کتابِ حساب' میں 'پیسٹ' کر دیا تھا۔

ایک روز اس کے ایک دوست نے اس سے دریافت کیا جس طرح کی مذہبی کتب تم نے ڈرائینگ روم میں شیشے کی الماری میں رکھی ہیں ویسی کتابیں تمہارے پڑھائی لکھائی کرنے والے کمرے میں نہیں ہیں؟ کیا وجہ ہے؟ عبدالسلام نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا: 'اصل میں کیا ہے نا! جب یہ مذہبی کتابیں ادب کی کتابوں کے ساتھ رکھی جاتی ہیں تو ان کی اصلاح کا کام شروع کر دیتی ہیں۔ بعض پر فحاشی اور جذبات کو پراگندہ کرنے یا اخلاقیات کو مجروح کرنے کا الزام لگاتی ہیں۔ جھگڑا شروع ہو جاتا ہے یار۔۔ بظاہر۔۔۔تو یہ کتابیں جلد بند ہیں لیکن غصّے میں آتی ہیں تو گالی گلوچ ، مار دھاڑ، قتل کی سازش اور سماجی بائیکاٹ کی دھمکیاں دینے لگ جاتی ہیں۔ میرا دل بیٹھ جاتا ہے۔ اس لیے میں نے انھیں نکال کر اس کمرے میں 'سب کے سامنے' رکھا ہے۔'

دوست گردن ہلا کر اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

عبدالسلام نے بات مکمل کرتے ہوئے کہا: 'الگ رکھنے سے کیا ہوتا ہے نا۔۔ گھر میں آنے والوں کی توجہ ان کو مل جاتی ہے۔ توجہ ملتے ہی ان کا کلیجہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور لوگ انھیں میرے ڈرائنگ روم میں دیکھ کر مجھے بھی دین دار تصور کرتے ہیں۔ اور وہ بھی مطمئن ہو جاتے ہیں۔'

'مطلب تو دوسروں کو ایڑ ابنا تا ہے۔'

'نہیں، اس کی کیا ضرورت ہے۔'

(دونوں مسکرائے)

'بات کیا ہے زندگی کا حسن اس کے تضاد میں پنہاں ہے۔ بہت ساری مردہ کتابیں دراصل زندہ لوگوں کے تعلقات کو برقرار رکھنے کا ایک آسان ذریعہ بن گئی ہیں۔'

دوست نے ہامی بھری اور کہا: 'تو کبھی کبھی اردو بہت سَولڈ بولتا ہے۔'

سلام نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا: 'جو کتابیں اس الماری میں ہیں ان کا ایک اور فائدہ ہے۔ ان کی موجودگی سے لوگ میری باتوں کو گوارا کر لیتے ہیں۔ ان کا گھر میں ہونا اس بات کا اشارہ ہے کہ 'اپنا آدمی ہے۔ ورنہ یار تم تو جانتے ہو۔۔ یوں بھی یہ کتابیں کون سمجھتا ہے۔'

'تیری بات میں پوئنٹ ہے، آج کل میں بھی دیکھ ریلاؤں ان سب کے بہانے ہی مولانا لوگ مسلمانوں کو آپس میں لڑارے لے ہیں۔' دوست نے اس کی بات ختم ہونے سے پیشتر کہا جسے تین چار مہینے قبل ایک مسجد سے یہ کہہ کر نکال دیا گیا تھا کہ اس مسجد میں وہابی حضرات کو نماز ادا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

(چند سوالات:)

کیا عبدالسلام جیسے افراد ہمارے معاشرے میں کم ہیں؟

عبدالسلام ایسے لوگوں کو خدا خود پیدا کرتا ہے یا یہ خود کو پیدا کرنے کے مرتکب ہیں؟ اگر یہ کردار سماج میں فٹ نہیں ہے تو اس کا ذمہ دار سماج ہے یا خدا؟ کیا ایسے سماج میں خدا فٹ ہوسکتا ہے جس میں عبدالسلام اَن فٹ ہو۔

عبدالسلام کو ناول کے کردار کے طور پر پیش کرنے کی خواہش کے بعد میں عجیب تخلیقی دشواری سے گزرنے لگا۔ سوال یہ ہے کہ بطورِ ناول نگار کیا عبدالسلام کے کردار کی تخلیق کی ساری ذمے داری مجھ پر عائد ہوگی؟ اس کے تمام افعال کا ذمہ دار میں رہوں گا؟ میں اس وسوسے کا بھی شکار رہا ہوں کہ اس کی اپنی ذات اور شخصیت، ناول میں خود کو میرے ارادے کے بغیر کس طرح پیش کرے گی؟ اس کی زندگی کے بارے میں، میں نے جتنی معلومات اکٹھا کی ہے اس کے بعد وہ میری بنائی ہوئی تخلیقی دنیا میں کس طرح قید رہے گا؟ ان سوالات کے علاوہ بعض دوسرے مگر اردو زبان میں ناول نگار کے طور پر جنم لینے کے سبب کچھ زیادہ اہم سوال مجھے پریشان کرتے ہیں۔ مثلاً:

ا) اگر افراد کا عمل غیر اخلاقی ہو تو کیا اسے من وعن بیان کرنا اخلاقی گناہ ہے؟

۲) مذہب سے بیگانہ افراد کا بیان کس طرح کیا جانا چاہیے؟

۳) ایک شخص عام زندگی میں اگر گالیاں بکتا ہے تو کیا لکھنے والے کو اسے حذف کر دینا چاہیے؟

۴) کردار اپنی سابقہ محبتوں اور جنسی تعلقات کو کسی مخصوص حالت میں زیادہ جذباتی وابستگی سے یاد کرتا ہے تو کیا ان کا ذکر نہیں کرنا چاہیے؟

۵) کردار اگر سماجی اصولوں، مذہب اور اخلاقیات پر سوالات قائم کرتا ہے تو کیا انھیں صرف اس لیے بیان نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اب اردو پڑھنے والوں میں زیادہ افراد مذہب پرست ہیں؟

۶) کیا لکھنے سے پہلے ادیب کو مذہبی رہنماؤں سے درسِ اخلاقیات لینا چاہیے کہ زندگی کو بیان کرنے کی کتنی آزادی اسے حاصل ہے؟

۷) کیا ادیب کا کام لوگوں کو یہ بتانا ہے کہ انھیں زندگی کس طرح گزارنا چاہیے یا یہ بتانا کہ افراد زندگی کے گرداب میں کس طرح پھنسے ہوئے ہیں؟

۸) ادیب ناصح ہے یا آزاد بیانیہ کا خالق جو جاری زندگی کا عکس متن میں پیش کرتا ہے؟

یہ اور اس طرح کے کئی سوالات ہیں جن سے اکثر ادیب گزرتا رہتا ہے لیکن میرے دل میں کچھ اور قسم کے سوالات بھی ابھرتے ہیں، مثلاً

۱) کیا ناول کا کلاسیکی فارم اب بھی کار آمد ہے؟ ابتدا۔ عروج۔ اختتام والا فارم۔ کردار کی پیدائش، جوانی اور انجام۔ یا کردار کی ذہنی حالتوں کا

بیان اہم ہے؟

۲) شعور کی رو سے کس طرح باہر نکلا جا سکتا ہے؟

۳) کیا ہر ناول کے لیے فارم کا تجربہ مناسب ہے؟

۴) کیا ناول کے اسالیب سے فنی طور پر واقف ہوئے بغیر اس میدان میں اضافے کے امکانات ہیں؟

۵) کیا فارم کے تجربے کو دوہرانا تخلیقی توانائی کے کمی کی علامت نہیں ہے؟

۶) کیا فلابیئر، وکٹور ہیگو، ٹالسٹائی، گارسیا مارکیز، اور میلان کنڈیرا ایسے ناول نگاروں کے فنی اسالیب کا اردو ناول کے ساتھ موازنہ ممکن ہے؟

۷) اردو ادیب مذکورہ عالمی ناول نگاروں کی تحریروں سے آگے کے ناول کس طرح لکھ پائے گا؟

۸) کیا اپنے اندھیروں کو دوسروں کے اجالے کے سامنے پرکھنا بے جا ہے؟

۹) بدلتی دنیا میں ناول نگار کا کام کیا ایک مخصوص لسانی و مذہنی ثقافت کا دفاع ہے یا اجتماعی شعور کا عرفان حاصل کرنا؟

۱۰) تہذیبی سطح پر عرفان کی مغربی اور مشرقی تاویلوں میں پھنس کر مذہبی وابستگی کی پاس داری کی جائے یا روشن خیالی کی راہ اپنائی جائے؟

۱۱) اردو کا معاشرہ نثر اور تخلیقی نثر سے اس قدر بیگانہ کیوں ہے؟

یہ سوالات عبدالسلام کی زندگی پر ناول لکھنے کی نیت سے جمع کیے جانے والے مواد، اس کی ڈائریوں اور دیگر مضامین کے مطالعے کے وقت بھی میرے ذہن میں کروٹ لیتے رہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ خود عبدالسلام کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا اور وہ خود کو ناول نگار سمجھتا تھا۔ انگریزی کا معلم ہونے کے باوجود اردو ادب سے اس کا رشتہ گہرا تھا۔ بعض اوقات تو مجھے حیرت ہوتی کہ اس کے فکشن کے متعلق خیالات میرے خیالات سے کس قدر ملتے ہیں۔ وہ کہتا ہے: ''زندگی پانی، ہوا، اور خوشبو کی طرح ہے۔ جن کا کوئی ایک فارم نہیں ہے۔ ناول کو بھی زندگی کی طرح ہونا چاہیے۔'' یا اس کا مشہور جملہ: ''ناول زندگی پر خدا کی تنقید ہے۔ ایک ایسے خدا کی جو ہے، لیکن کہیں موجود نہیں۔'' مجھے بے حد پسند ہے۔ ایسا لگتا ہے میں خود اس بات کو لکھنا چاہتا تھا۔

عبدالسلام کے کردار پر مبنی ناول لکھنے کا خاکہ تیار کرتے کرتے میں نے آپ کے سامنے اپنے دل کے چند وسوسے بیان کر دیے۔ یہ باتیں میں اس خاکے میں تو لکھ سکتا ہوں، ناول میں اس کو عیب سمجھا جائے گا۔ کئی بار یہ خیال بھی آیا کہ صرف معلومات کی بنیاد پر ناول لکھنا آسان نہیں ہوگا۔ ناول کے آرٹ سے

میری واقفیت ابھی کم ہے۔ اس لیے غلطی اور لغزش کے امکانات ہوں گے۔ ممکن ہے دوران تحریر میں جگہ جگہ بہک جاؤں۔

کیا آپ ایک مقصود، مشق یافتہ اور پرفیکٹ زندگی گزار رہے ہیں۔ عبدالسلام کا بیان اس ضمن میں درست ہوگا کہ ہماری ٹریجڈی یہی ہے کہ ہمیں زندہ رہنے کا کام اس کی مشق کے بغیر دیا گیا ہے۔ میں سوچتا ہوں ایک ایسے آدمی کی کہانی میں ناول کے کلاسیکی فارم میں کیسے لکھوں گا جس کی زندگی میں انتشار تھا۔ افعال میں کبھی توازن نہیں رہا۔ جس کی زندگی بے ترتیب، غیر ارادی اور موج رواں کی طرح تھی۔)

ایک رات کا ذکر:

بمبئی سے دو ڈھائی گھنٹے کی مسافت پر کسارا گھاٹ ایک علاقہ ہے۔ حدِ نظر ایک پہاڑی سلسلہ ہے۔ پہاڑوں کی بلندی سے جھانکنے پر چند اداس ندیاں رینگتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ موسم باراں میں جب اطراف سے سیاہ بھور بادل اس پہاڑی علاقے پر سینہ پھاڑ کر روتے ہیں تو ندیاں سرخ وسفید جھاگ کے ساتھ بہتی ہیں لیکن تب بھی ایسا لگتا ہے کسارا گھاٹ کی فضا میں کسی مہجور عورت کا گیت محلول ہو گیا ہے۔ اردو شاعر بانی اس مقام کی سیر کرتے تو وہ اسے 'نواح جاں کی لایعنی تفسیر' کہہ کر مخاطب کرتے۔ کسارا گھاٹ کے بارے میں عبدالسلام نے لکھا ہے کہ اس گھاٹ کی تنہائی میں کچھ گھنٹے سانس لینے سے دل کا انتشار کم ہو جاتا ہے۔ یہاں مظاہر فطرت سے مکالمہ کیا جائے تو خاموشی کی دیوار سے جوابات چھن کر آتے ہیں۔ کسارا گھاٹ کے جنوب میں 'دل آباد' نامی ایک چھوٹا سا گانو تھا جس کو چاروں طرف سے پہاڑوں نے گھیر رکھا تھا۔ یہ گانو اس کے ایک دوست سرفراز صوبے دار کا تھا۔ سرفراز بمبئی کی ایک کالج میں نفسیات کا لیکچرر تھا۔ دونوں کو جب بھی وقت ملتا وہ 'دل آباد' چلے جاتے۔ عبدالسلام نے اپنی زندگی کی بعض انتہائی اداس شامیں 'دل آباد' میں گزاری ہیں۔ سردی کے موسم میں یہاں سر شام سورج زرد

پھول کی طرح دھند سے اٹے ہوئے تالاب میں سرنگوں نظر آتا ہے۔

اس روز بھی سورج کی کرنیں سرد ذرات میں بہت جلد دم توڑ چکی تھیں اور جانے کس ماتم کی آمد تھی کہ عبدالسلام کا دل شام سے ہی ایک نکتے کے گرد چکر کاٹ رہا تھا۔ جانے کون سے گھاؤ ہمارے دلوں میں کب کے لگے ہوتے ہیں جو پھر ماضی کے کھنڈرات سے کبھی کبھار غبار بن کر اٹھتے ہیں اور غیر محسوس طور پر روح میں رقصاں ہو جاتے ہیں۔

زرد سفید دھند عبدالسلام کے چہرے پر نیا رنگ بھرنے میں ناکام تھی اس لیے خود بھی مغموم تھی۔

جب دھند رات بہت روتی ہے تو صبح 'دل آباد' کے مکانوں کی کھڑکیوں کے شیشوں پر اس کے آنسوؤں کی پرت چڑھ جاتی ہے۔ جس پر بچے ا، آ، ئ۔۔ لکھنے میں مشغول نظر آتے ہیں۔ اس شب بھی یخ بستہ تنہائی کوئی فطری وقفہ نہیں تھی، بلکہ عبدالسلام کے دل کی بھول بھلیوں کی کشاکش بھی اس میں شامل تھی۔ ایک بے منزل، بے مقصد، رائیگاں زندگی کا احساس؛ کہیں بہت اندر، اپنا ایک آدھا ادھورا چہرہ، خلق کئے ہوئے تھی۔ جسے وہ سماجی روابط کے استحکام کے لیے باطن کے زنداں میں پوشیدہ رکھنے میں کامیاب تو ہوا تھا لیکن تضاد سے پیدا ہونے والے تلاطم سے وہ مستقل متصادم بھی تھا۔ اس متصادم تلاطم میں خدا سے اس کی روح کے منقطع ہونے کا نوحہ بھی جاری تھا۔

رات کا سایہ جنگلی پودوں اور درختوں پر پھیل گیا تھا۔

کیڑوں کی موسیقی، سوکھی گھاس کے قطعوں، جھاڑیوں اور نیم خوابیدہ درختوں کی شاخوں سے بہہ رہی تھی۔ جس میں اتنا نشہ تھا کہ ہوا کو اپنے قافلے سے کاٹ کر

اپنے ساتھ دور تک بہائے لیے جا رہی تھی۔ اندھیرا عبدالسلام کو منور دکھائی دیتا تھا۔ اس سرد شب کی سیاہی سے اس کے دل میں سوئے اندھے پرندے کسمسائے اور پھڑ پھڑائے۔ اس نے دیکھا: دل کے نہاں خانے سے اندھے پرندے باہر آئے اور ظلمتِ شب میں اس کے ارد گرد جگنو بن کر چمکنے لگے۔

جگنو کہاں سے آتے ہیں؟

انسان اس کرۂ ارض پر کہاں سے آیا ہے؟

....

خدا کیوں ہے؟

کیا روح جگنو ہے؟

کیا جگنو خدا ہے؟

عبدالسلام کے دل میں سوالات کچھ اس انداز سے پیدا ہوتے تھے گویا وہ خود ایک بھنور ہے اور یہ سوالات نفس کی گردش جس میں اس کی روح ڈوب رہی ہو۔

اس لمحے شاید وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اگر خدا روح ہے تو میں اسے اپنے دل کے نہاں خانے میں مقید کیے ہوئے ہوں پھر عبادتوں کے پل صراط کیا معنی رکھتے

ہیں۔عبادتیں افراد کو سیاسی مصلحتوں سے دور رکھنے اور ریاست کا مطیع بنانے کا آلہ تو نہیں؟ عقاید کی بنیاد پر سیاسی اقتدار حاصل کرنے والے مذہبی مبلغ کیا عوام کی سادگی کو اپنے سیاسی مفادات کے لیے ڈھال بناتے رہے ہیں۔

سرفراز ایک طرف بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ جانتا ہے کہ عبدالسلام جب چپ چاپ ہو تو اسے ڈسٹرب نہیں کرنا چاہیے۔

عبدالسلام شاید خدا کو صداقت سمجھتا ہے۔جسے اجتماعی آنکھ اور عبادتوں کے سلسلوں سے دریافت نہیں کیا جاسکتا۔''ہر روح ایک انفرادی تجربہ ہے اور ہر روح کا خدا سے رشتہ اس کے انفرادی وجود اور فہم کی سطحوں سے تشکیل ہوگا۔خدا بے ہیت، لاماضی، عدم خواہش، لامکاں اور لامستقبل ہے۔انسان ماضی، خواہش، مکان اور مستقبل سے مربوط ہے۔دونوں ایک دوسرے کی ضرورت اور پیداوار ہیں۔''یہ عبارت 'دل آباد' کی ایک سیر کے چند روز بعد اس نے اپنی نجی ڈائری میں اتاری تھی۔

عبدالسلام نے سرفراز کی سگریٹ سے اپنی سگریٹ سلگائی۔اور پھر محوِ خیال ہو گیا۔اس نے سوچا:

خدا اور اِنسان کے درمیان جو رشتہ ہے اسے آگہی کے ایک مخصوص نقطے پر محسوس کیا جا سکتا ہے، جس کے بعد زندگی کے تصرف کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ ایک ایسا عرفان جس سے خاموشی، مسکراہٹ اور محبت کی حقیقی معنویت آدمی پر آشکار ہوتی ہے۔اس نے سگریٹ کا ایک کش لیا اور پھر سوچا: عرفانِ نفس سے زندگی ایک تجرباتی صداقت بن کر پرلطف ہو جاتی ہے۔

عبدالسلام کے دل کی نسیجوں میں سگریٹ کا دھواں پھیلا اور اس کی سانس

کے ساتھ بہت سارے اندھے پرندے صدیوں کی قید سے آزاد ہو کر سیاہ شب کی تنہائی میں پھیل گئے۔۔۔اب وہ ارد گرد کی تاریکی میں روشنی پھیلا رہے تھے۔

بہت دیر تک خاموشی ُدل آباد ُپر سایہ کئے رہی۔

دونوں بہت ساری سگریٹس پی چکے تھے۔

''عبدالسلام کیا ہوا؟ بہت مایوس لگ رہے ہو؟'' سرفراز نے کہا۔

''یار دل میں بے شمار خیالات آتے رہتے ہیں؟

''کونسے خیالات؟

(وقفہ)

''کون سے خیالات یار''؟

''ہم کون ہیں یار جو ان پہاڑوں کا نظارہ کر رہے ہیں۔کیا ہم بھی بس ایک نظارہ ہیں جسے کوئی صدیوں کے فاصلے سے کر رہا ہے۔''

''تو بھی یار۔۔کیا کیا سوچتا رہتا ہے؟''

''کیا کروں یار۔۔یہ سوالات بے چین کرتے ہیں؟''

''تو خالی پھوکٹ دماغ کیوں خراب کرتا ہے۔ لے ماوا کھا۔''

''کون سا ہے۔''

''میرے کو معلوم ہے یار۔۔۔تو کون سا کھاتا ہے۔وہی بھولا ،کتری سپاری ،اسٹار مار کر۔۔''

عبدالسلام مسکرایا۔سرفراز نے ماوا نکال کر اسے دیا۔

دونوں مسکراتے ہوئے سرفراز کے گھر میں داخل ہوئے جہاں اس کی والدہ نے ان کے لیے چائے بنا رکھی تھی۔ وہ چار دیواری میں چلے گئے تو باہر جگنوؤں کی دنیا بھی مفقود ہوگئی۔

اس کی زندگی کا ایک عجیب تجربہ:

عبدالسلام کی خالہ زاد بہن اس سے کم وبیش دس بارہ سال بڑی تھی۔ اس کی شادی میں عبدالسلام اپنے والدین کے ساتھ شریک ہوا تھا۔ شادی اس کے آبائی گانو میں تھی جو ممبئی سے سات گھنٹوں کی دوری پر واقع ہے۔ گانو کی شادی میں اسے خوب مزہ آیا تھا۔ کوکنی رسوم اور بولی سے اس کی واقفیت کم تھی۔ اس کے باوجود اسے کوکن کا ماحول اچھا لگا۔ ممبئی واپسی کے تین روز بعد اس کی خالہ نے فون پر اس کے والدہ کو بتایا کے شگفتہ سسرال چھوڑ کر گھر واپس آئی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہنے کے لیے راضی نہیں ہے۔ طلاق چاہتی ہے۔ عبدالسلام کے والد اس خبر سے خاصے پریشان ہوئے۔ سارا دن کچھ اور رشتے داروں سے صلاح مشورہ کرتے رہے۔ کالج سے واپسی پر عبدالسلام کو اس بات کا علم ہوا تو پہلے اسے حیرت ہوئی پھر ماجرے کی پیچیدگی اس کی دلچسپی کا سبب بن گئی۔ وہ اس چیستان کو سمجھنا چاہتا تھا کہ دو تین دن میں ایک لڑکی طلاق پر بضد کیوں ہے۔ اسی لیے جب دوسری صبح اس کے والد گانو جانے کے لیے تیار ہوئے، وہ بھی ان کے ساتھ چل پڑا۔

گانو کے چند عمر رسیدہ ااور بزرگ افراد آنگن میں جمع تھے۔قریبی رشتے دار گھر کے اندر بیٹھے ہوئے تھے۔

شگفتہ مٹی کے چبوتروں سے بنے ہوئے ایک کمرے میں بیٹھی تھی۔جس میں ایک چالیس واٹ کا بلب رات آٹھ بجے روشن ہوتااور گیارہ بارہ بجے کے درمیان بغیر کسی کو سوئچ آف کرنے کی زحمت دیے خود سو جاتا تھا۔ایک طاق میں چراغ جل رہا تھا۔جس کے مقابل کتابِ مقدس رکھی ہوئی تھی۔اس کتاب کو صرف رمضان کے مہینے میں پڑھا جاتا اور ساری قسمیں اس سے منسوب کی جاتیں۔ایک کونے میں چٹائی پر گودڑی بچھی ہوئی تھی۔اگر آپ اجالے میں گودڑی کو دیکھیں گے تو اندازہ ہوگا کہ کس ریاضت سے اسے تیار کیا گیا ہے۔کیسے کیسے گل بوٹے، پرندے،اور جغرافیائی علامات اس پر بنی ہیں۔ایک طرف تھوک دان رکھا ہوا تھا۔اس کے قریب ہی پان سپاری کی تھیلی اور اڑکیتا رکھا ہوا تھا۔پانی سے بھرا ہوا ایک لوٹا تھا۔زمین گوبر سے لیپی ہوئی تھی۔کمرے کی اندرونی دیواروں کو لال مٹی سے رنگایا گیا تھا۔

شگفتہ کو سمجھانے کی سب نے بہت کوششیں کی تھیں لیکن وہ اپنے ارادے پر قایم تھی۔یہاں کے لوگوں نے لڑکے والوں سے بات کی وہ ہر طرح کی مفاہمت کے لیے تیار تھے۔لیکن شگفتہ طلاق پر بضد تھی۔اس کا کہنا تھا:’اگر اس کی طلاق نہیں ہوئی تو جان سے جائے گی‘۔

آنگن میں بیٹھے بزرگوں کی باتیں سن کر وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ رہا تھا بلکہ گتھی الجھتی جارہی تھی۔اس نے سوچا وہ خود شگفتہ اور خالہ سے مل کر مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کرے گا۔

دروازے کی کڑی کو کھٹکھٹا کر وہ اس نیم روشن کمرے میں داخل ہوا جس میں کویلوں اور دیوار کے درمیان کی پھٹوں سے چاند کی روشنی ایک گاڑھی لکیر کی صورت کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔۔۔کونے میں شگفتہ دیوار سے لگ کر بیٹھی تھی۔ گھٹنوں کے گرد کہنیوں کا گھیرا بنائے۔

''بھانا۔''(آپا۔۔)

''کون؟''

''بھانا عبدالسلام۔''

''ممبئ والو۔''(بمبئ والا)

''ارے یہ بس۔''

اس نے گھٹنوں کے گرد سے کہنیوں کو الگ کیا اور گودڑی پر اس کے لیے جگہ بنائی۔

عبدالسلام اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے شگفتہ کے چہرے کو اتنے قریب سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔سفید اور منور آنکھیں عبدالسلام پر مرکوز تھیں۔

''تم کیوں آئے ہو؟''

''ہمیں برا لگا۔''

''برا تو سب کو لگ رہا ہے۔''

''مگر کیوں آپا؟''

''ابھی تم چھوٹے ہو۔۔۔ان باتوں کو سمجھنے کے لیے بڑا ہونا پڑتا ہے۔'' شگفتہ نے انتہائی متین لہجے میں کہا۔

''آپا میں بڑا ہو چکا ہوں۔''

''بدھو ویسے بڑا نہیں۔تھوڑا زندگی کا تجربہ۔''

''مجھے بہت ہے۔''

شگفتہ کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔

''بھانا میں جاننا چاہتا ہوں۔کیا تمھیں لڑکا پسند نہیں ہے؟''

''نہیں یہ بات نہیں ہے۔''

''اس کے گھروالوں سے پریشانی ہے؟''

''نہیں۔وہ بھی اچھے ہیں۔''

عبدالسلام نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''ارے تو پھر پروبلم کیا ہے؟''

''کچھ باتیں ہوتی ہیں جن کو سمجھنے کے لیے بڑا ہونا پڑتا ہے۔''اس بار شگفتہ نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''باتیں بنا کر مجھے ایڑا مت بناؤ۔کہیں اس لڑکے نے تمہیں ناپسند تو نہیں کیا؟''

''بالکل نہیں۔''

''پھر کیوں۔۔۔کیوں سارے خاندان کو۔''

عبدالسلام جملہ مکمل نہ کرسکا۔شگفتہ نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

اس دوران محلے کی ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔اونچے قد اور بھرے ہوئے بدن کی لڑکی۔جس کی عمر چوبیس پچیس سال ہوگی۔

شگفتہ ۔مھاورں تلو چاں ہے ۔''(مچھلی تلنا ہے)

''براں ۔تو جا منگ''(ٹھیک ہے،تم جاؤ ۔)

اس نے جاتے ہوئے ایک لمحہ ٹھہر کر عبد السلام کو دیکھا۔عبد السلام عمر کی اس منزل پر،یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس طرح ٹھہر کر اسے دیکھنے کا کیا مفہوم تھا۔

''ارے کلثوم ما جو بھاس ہے۔''(ارے کلثوم میرا بھائی ہے۔)

یہ جملہ غیر متوقع تھا اور شگفتہ کا لہجہ بھی اسے کچھ عجیب لگا۔پل بھر کے لیے عبد السلام کو ایسا لگا سچ مچ ابھی وہ بہت چھوٹا ہے۔

تیز طرار اور تیکھے نقوش والی وہ لڑکی چلی گئی لیکن اس کے چہرے کے خطوط عبد السلام کی آنکھوں میں کچھ دیر ٹھہرے اور پھر یادداشت میں محفوظ ہو گئے۔

''یہ کون تھی آپا؟''

''میری خاص سہیلی ہے۔''

''اچھا۔''کہہ کر اس نے ایک بار شگفتہ کی سفید چمک دار آنکھوں میں دیکھنے کی نیت سے آنکھیں اٹھانے کی کوشش کی لیکن اس کی قوت نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور اس کی نظریں چالیس واٹ کے بلب پر جا کر رک گئیں جس کے ارد گرد بہت سارے جنگلی کیڑے مکوڑے اڑ رہے تھے۔دیوار کی ایک پھٹ سے ایک چھپکلی ان کو گھور رہی تھی۔

دیر تک عبد السلام وہاں بیٹھا رہا لیکن جس جواب کا اسے انتظار تھا،اسے نہیں ملا۔دو دن قیام کرنے کے بعد وہ اپنے والد کے ساتھ بمبئی واپس آگیا۔چند ہفتوں بعد شگفتہ کی طلاق ہوگئی۔عبد السلام کئی مہینوں تک الجھن کا شکار رہا۔اس کی یادداشت میں کلثوم کے تیکھے نقوش ابھرتے اور اسے ایسا لگتا اس کی حسین اور رتاب

دار آنکھیں اس کی طرف گھور رہی ہیں۔

طلاق کے چھ مہینے بعد اس نے شگفتہ کو دو خط لکھے۔

کبھی کبھار کچھ رشتے داروں سے اس کی خیریت بھی دریافت کیا کرتا۔

کرسمس کے موقع پر کالج ہفتے بھر کے لیے بند تھا۔ اس کے دل میں گانو جانے کا خیال کروٹ لے چکا تھا۔ اس نے والد سے اجازت لی اور شگفتہ سے ملنے نکل پڑا۔

کیا شگفتہ کی ٹریجڈی نے اس کے دل میں ہمدردی پیدا کی تھی؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ کلثوم کی تاب دار حسین آنکھوں کا جادو جاننے کا اشتیاق اس کے تحت الشعور میں پیدا ہوا تھا؟ دوران سفر وہ متواتر ایس ٹی بس کی کھڑکی پر گردن لٹکائے باہر درختوں، کھیت کے قطعوں اور چھوٹی موٹی بستیوں کو دیکھتا رہا۔ شگفتہ کا نیم اندھیرے میں دیکھا ہوا مغموم چہرہ کہیں کھو سا گیا تھا۔ بس، پل بھر کے لیے چہرے کا کوئی ایک خط ابھرتا اور ذہن کی نیم تاریکی میں دوبارہ ڈوب جاتا۔

جس قت وہ شگفتہ کے مکان کی دہلیز پر پہنچا سورج کی کرنیں اس کے سرخ ہالے میں مراجعت کر چکی تھیں۔ آنگن میں امرود کا ایک پیڑ تھا۔ وہ کچھ اداس سا لگ رہا تھا۔ کئی دنوں سے سرِ شام ایک ہری دم والا پرندہ آ کر اس کی ایک سوکھی ہوئی شاخ پر بیٹھ جاتا اور ایک 'فراموش کردہ داستان' کا کچھ حصہ سناتا تھا۔ داستان ۱۸۵۷ کے آس پاس کسی نے تحریر کی تھی۔ پرندہ ہر دن کہانی کو ایسے المیاتی موڑ پر لا کر ختم کرتا تھا کہ امرود کے پیڑ کی اداسی میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔ 'فراموش کردہ داستان' بہت طویل تھی اور پرندے نے امرود کے پیڑ سے وعدہ کیا تھا کہ جب تک داستان ختم نہیں ہوگی تب تک وہ اسے یہ نہیں بتائے گا کہ وہ 'طاؤس چمن'

کے دربار سے مفرور پرندہ ہے۔ اس کے مالک کا نام طلسم ِ نیر ابن گنجفہ ابن عطرِ کافور تھا۔

آنگن کے دروازے سے لگ کر مہمانوں کے بیٹھنے کا کمرہ تھا جسے وٹے دار کہتے ہیں۔ وہیں سے اندرونِ مکان جانے کے لیے ایک دروازہ تھا۔ اندر دائیں بائیں دو کمرے تھے۔ ایک کمرے میں مالے کے لیے سیڑھی لگی تھی۔ پھر اترن کے بعد پڑی تھی جس میں ایک طرف موری اور دوسری طرف چولہا تھا۔ ایک کونے میں لکڑیاں اور سوکھے پتوں کا انبار تھا۔ پڑی کے درمیان سے پچھواڑے میں نکلنے کے لیے ایک دروازہ تھا۔ پڑی گوبر سے لپی ہوئی تھی۔ آنگن کی فصیل پتھروں سے بنی تھی۔ اس سے الگ کر دو کلم کے پیڑ (ہاپوس آم) اور ایک شالو کا پیڑ تھا۔ ایک کونے میں چھوٹی کھوپٹی تھی جس میں برسات کے لیے لکڑیاں جمع کر کے رکھی جاتی ہیں۔

اس نے وٹے دار سے آواز لگائی۔ شگفتہ اس وقت پڑی میں تھی۔ اس کے کانوں پر آواز کا بس ارتعاش ہوا۔ وہ پڑی سے اٹھ کر وٹے دار کی طرف آئی۔ سلام پر نظر پڑھتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی۔ وہ آگے بڑھی اور اس کے ہاتھ سے سوٹ کیس لیتے ہوئے کہا: 'ارے اچانک!'

''ہاں تمہاری یاد آ رہی تھی۔''

''تجا سار کھوس بھاس ہاؤے۔'' (بھائی ہو تو تمہاری طرح)

''اچھا چل اندر آ۔'' اس نے کہا۔

اس کی خالہ پڑی میں بیٹھی چاول چن رہی تھی۔ اس نے خالہ کو سلام کیا۔ خالہ نے کھڑے ہو کر اسے گلے لگایا۔

''تھوڑا الما پی۔''(سلیمانی چائے پیو)
''بُکّی کمی ٹاک۔''(چائے پتی کم ڈالنا)
شگفتہ چائے کی تیاری میں لگ گئی۔عبدالسلام باہر منگلید ار میں جا کر ہاتھ پیر دھونے لگا۔چائے چولھے پر رکھ کر اس نے ہڑپے (لکڑی کا بڑا صندوق جس کا استعمال اشیائے خورد ونوش اور دیگر غذائی اجناس رکھنے کے لیے کیا جاتا ہے۔) سے ایک صاف ستھرا تولیہ نکالا۔

''باہر چو دستے۔''(فارین کا لگ رہا ہے)
''ہاں۔'' کہہ کر وہ مڑی۔

چائے ابل رہی تھی۔شگفتہ نے اندر جا کر چولھے کی سلگتی ہوئی لکڑیوں کو بجھایا۔ابھی سلام ٹاول سے چہرہ پونچھ رہا تھا کہ آنگن کی فصیل کے اس طرف سے گزرنے والی پگڈنڈی پر اسے کلثوم نظر آئی۔وہ بھی وہاں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ بلب کی ہلکی زرد روشنی میں اس کا چہرہ پرکشش اور پراسرار دکھائی دے رہا تھا۔

جب دونوں کی آنکھیں ملیں تو کلثوم نے پوچھا''کنوا ایلوس۔''(کب آئے؟)

''آج ابھی۔''
''اچھا۔''

پھر کلثوم نے اونچی آواز میں کہا۔

''گو شگفتہ۔۔۔اگو پن ہیس کھیں۔(ارے شگفتہ ہو کہاں۔)

شگفتہ کے ہاتھ سے کپ گرتے گرتے رہ گیا۔اس نے وہیں سے جواب دیا۔۔

''ایلوں۔'' (آئی)

شگفتہ نے چائے کا کپ عبدالسلام کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے جواب دیا۔

'بول۔'

''ارے سکل مالا تو جاں، نواں پولکاں ہوا یں۔'' (کل مجھے تیرا نیا بلاؤز چاہیے۔)

''ملیل ملیل۔'' (ٹھیک ٹھیک)

''اچھا چل سکل بات کروں۔'' (چلو ٹھیک ہے کل بات کرتے ہیں)

عبدالسلام چائے کا کپ لیے، وہیں کھڑے ہو کر ان کی باتیں سن رہا تھا۔

کلثوم جانے کے لیے مڑی۔ ایک قدم آگے بڑھ کر وہ رکی اور گردن موڑ کر اس نے ایک بار شگفتہ اور عبدالسلام کو دیکھا۔ زرد بلب کی روشنی کچھ اور پیلیا گئی تھی۔ زردی مائل روشنی نے امرود کے پیڑ کی افسردگی کو مزید بڑھا دیا تھا۔ آنگن کی فصیل جو اندر سے کھوکھلی تھی اس میں ایک بے رنگ سانپ اونگھ رہا تھا۔ شالو کے پیڑ پر کوئل بیٹھی سارے دن کی تھکن کو یاد کر رہی تھی۔ شگفتہ نے اس کے طرف دیکھا لیکن اس کی نظروں میں اتنی تاب نہیں تھی کہ وہ بھی اس کی آنکھوں میں جھانک کر کچھ تلاش کر پاتا۔ اس نے کپ سے چائے کا آخری گھونٹ لیا۔ آنگن کی فصیل میں

لیٹا سانپ گھر اور محلے کے تمام افراد کی بو سے واقف تھا۔عبدالسلام کی تازہ بوسونگھنے کے بعد وہ الرٹ ہوگیا تھا۔ ورنہ سورج ڈوبنے کے بعد وہ وہاں سے نکل کرفصیل کے پیچھے والی جھاڑیوں سے ہوکر قریب کے جنگل میں کچھ دور شکار کی تلاش میں اب تک نکل چکا ہوتا۔

کلثوم نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔

مگر اس کی سفید پر اسرار آنکھیں وہیں بلب کی زرد روشنی میں ساکت تھیں۔ گویا عبداسلام کو گھور رہی ہوں۔

رات میں کھانے پر خاندان کے دیگر افراد سے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔

بھونے ہوئے کولم کا ذائقہ اسے بہت اچھا لگا۔

کوکن میں رات کے کھانے کے بعد آنگن میں بیٹھ کر گپ شپ کرنے کا رواج ہے۔تاروں بھرا آسمان جھلملا کر اس گفتگو کا لطف لیتا ہے۔سلام نے سوچا اتنا روشن آسمان، مہانگر ممبئی میں نظر کیوں نہیں آتا؟ وہ کہکشاں کو دیکھتا رہا۔ چاروں طرف بکھری رات کی بے زبانی، آم، پیپل اور کٹھل کے پیڑوں کی شاخوں سے پیدا موسیقی کے ذریعے اپنا گیت سنا رہی تھی۔ایک طرف دھومی کی گئی تھی۔جس سے

ہلکا ہلکا سفید دھواں لہروں کے صورت اٹھتا تھا اور تھوڑے سفر کے بعد شب کی چادر میں گم ہو جاتا تھا۔

خالہ کے کئی سوالوں کا جواب عبدالسلام دیتا رہا۔

درمیان میں شگفتہ بھی اس کی تعلیم اور مستقبل کے منصوبوں پر سوالات کرتی رہی۔ وہ جواب دیتا رہا۔ ایک سوال وہ بھی شگفتہ سے پوچھنا چاہتا تھا۔

مگر خالہ کی غیر موجودگی اس کے لیے لازمی تھی۔

اتفاق کہیے کہ خالہ پان دان لانے خود ہی اٹھ گئی۔

''شگفتہ آپا۔۔۔ کلثوم کچھ نرالی لگتی ہے!''

ہنستے ہوئے شگفتہ نے کہا ''وہ بہت اچھی ہے۔''

''ہاں۔ مگر اس کی آنکھوں میں عجیب تیج ہے۔ کیوں؟''

''تمہیں ایسا لگتا ہے۔ تو ہو گا۔''

''تم کب سے اس کو جانتی ہو۔''

''ہم بچپن سے ساتھ رہتے آئے ہیں۔۔۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔''

عبدالسلام کے لیے لفظ 'محبت' اس وقت ایک سادہ سا لفظ تھا۔ شاید اس لفظ کی بوقلمونی اور پیچیدگی سے واقف ہونے کے لیے اسے ابھی سچ مچ کچھ اور بڑا ہونے کی

ضرورت تھی۔ کیا شگفتہ اس بات کو بھول گئی تھی کہ عبدالسلام ابھی اتنا بڑا نہیں ہوا ہے۔

(چند روز بعد ایک صبح)

خالہ نے اس کے لیے چائے کے ساتھ کھانے کے لیے گھاؤنے بنائے۔ جنھیں اس نے بڑے شوق سے کھایا اور خالہ کی تعریف کرتا رہا۔ چائے کے بعد وہ وہیں چولہے کے قریب بیٹھ کر خالہ سے گانو کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد چند اور رشتے دار اس سے ملاقات کے لیے آئے جن کے ساتھ اس کا اچھا وقت گزرا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد وہ لیٹا رہا۔ جلدی ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد کلثوم آئی۔ شگفتہ اور وہ پڑی میں باتیں کرتے رہے۔ پھر شگفتہ اسے کسی کام کے بہانے اندرونی کمرے میں لے گئی۔ خالہ جنگل میں لکڑیاں لانے چلی گئی تھی۔

آدھا گھنٹہ شاید وہ باتیں کرتی رہی ہوں گی۔

گھر میں پھیلی خاموشی نے عبدالسلام کو جگا دیا۔ اس نے پڑی کی طرف جھانکا۔ دروازے پر اندر سے کڑی لگی ہوئی تھی۔ اس نے کلثوم کے کمرے کی طرف مڑ کر دیکھا۔ وہ بھی بند تھا۔ وہ اٹھ کر دبے پاؤں پڑی میں گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ دوبارہ شگفتہ کے کمرے کی طرف آیا۔ دروازے کے پاس جا کر رک گیا۔

کمرے میں وہ دونوں باتیں کر رہی تھیں۔ آواز مٹی کی دیوار سے چھن کر آ رہی تھی۔ بہت مدھم۔۔۔ الفاظ کا تسلسل یکا یک ٹھہر جاتا لیکن چند ساعتوں بعد دوبارہ جاری ہو جاتا۔ سلام کے تجسس میں اضافے کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ وہ دیوار سے لگ کر چپ چاپ کھڑا رہا۔ دیوار اس کی اس ادا سے مبہوت تھی۔ تھوڑی دیر

بعد الفاظ کا باہر آنا بند ہوگیا۔خموشی کو اس نے اپنے اطراف پھیلتے ہوئے محسوس کیا۔ دس بارہ منٹ بعد مدھم سانسوں کی حیران کن لہریں بہتی ہوئی دیوار سے ٹکرا کر واپس کمرے میں لوٹ رہی تھیں جن سے پیدا ہونے والے ارتعاش کو سلام نے محسوس کیا۔اس کا ایک ہاتھ دیوار سے لگا ہوا تھا۔دیوار کی مٹی آواز کی لہروں کے ارتعاش کو پہلے خود میں جذب کرتی پھر سلام کی ہتھیلی میں اس کے تاثر کو منتقل کرتی تھی۔لیکن بہت جلد وہ طلسمی ارتعاش بھی ٹوٹ گیا۔تب شگفتہ کا ایک جملہ اسے صاف طور پر سنائی دیا۔

''آج نہیں۔میرا بھائی آیا ہوا ہے۔وہ جاگ جائے گا۔''

اتنا سنتے ہی عبدالسلام دبے پاؤں آکر دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔

سانسوں کی حیران کن لہروں نے اس پر شگفتہ کی طلاق کا راز افشا کر دیا تھا۔ کچھ دنوں تک وہ رنجیدہ رہا۔

آئندہ دو تین برسوں میں زندگی کی زیادہ سفاک صداقتوں سے اس کا سامنا ہونے والا تھا،تب اس نے اس موضوع پر شگفتہ سے بات بھی کی اور یہ تاثر دیا کہ وہ معترض نہیں ہے۔شگفتہ کو حیرانی ہوئی جسے عبدالسلام کے اس جواب نے دور کر دیا'طلاق کے سبب کو سمجھنے کے لیے اب میں بڑا ہوگیا ہوں۔'

شگفتہ،کلثوم اور اس کے درمیان آگے چل کر ایک تعلق خاطر پیدا ہوا۔ عبدالسلام نے انھیں کبھی یہ احساس نہیں دلایا کہ وہ غیر فطری اظہارِ نفس کو برا سمجھتا ہے۔مزید چند برسوں بعد اس کا کہنا تھا۔''صرف اقلیت میں ہونے سے کوئی فعل غیر فطری نہیں ہو جاتا۔'' وہ شگفتہ کی جسارت اور نجی زندگی کو یہ کہہ کر تسلیم کر چکا تھا کہ کم از کم اس ماضی حال جاری زندگی میں کوئی فریب نہیں ہے۔ان ہی دنوں اسے

نظیر کی گمشدگی کے سبب کا ادراک ہوا۔ مدرسے کے امام کا مکروہ چہرہ یاد آنے پر اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو جاتا۔

رفتہ رفتہ خاندان کے دیگر افراد پر بھی شگفتہ اور کلثوم کے رشتے کی حقیقت کھل گئی اور سب نے ان دونوں سے منہ موڑ لیا۔ چند برسوں بعد خالہ بھی لقمہء اجل ہوگئیں۔ ان کے انتقال کے بعد شگفتہ اکیلی ہوگئی تھی۔ رشتے دار اس سے تعلقات محدود کر چکے تھے۔ دوسری طرف عبد السلام سے اس کی قربت بڑھ گئی تھی۔ شاید اسی لیے سال دو سال کے عرصے میں وہ گانو جا کر اس سے ملتا۔ کلثوم سے بھی بات چیت ہوتی۔ وہ دونوں کے لیے تحفے لے جاتا۔ ان تینوں کے دلوں کے دھاگے جس مضبوطی سے آخری دم تک جڑے رہے وہ واقعی بڑی انوکھی مثال تھی۔

عبدالسلام کے دل میں اس کے گانو کی عورتوں اور ندیوں کو دیکھ کر ایک عجیب خیال پیدا ہوتا جسے ایک دن جامع ترتیب میں یوں اس کے ذہن میں متشکل ہونا تھا: ''کوکن کی عورتوں اور ندیوں کا دکھ یکساں ہے۔'' یہ جملہ اس کی نجی ڈائری میں اس کے گانو کے بارے میں لکھے گئے ایک طویل پیراگراف میں ہے۔

۱۹۹۸ء میں اس نے بارہویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ مئی کی چھٹیوں میں سیر وتفریح کے لیے وہ کوکن گیا۔ اس بار وہ دو مہینے کوکن میں رہا۔ اس نے اپنے تمام رشتے داروں اور گانو کے لگ بھگ سارے لوگوں سے ملاقات کی۔ گانو کے بیشتر گھروں میں جاتا، بیٹھتا، اور زندگی کا مشاہدہ کرتا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے وہ ایک دن فکشن کا مواد بن سکتا ہے۔ اب لوگوں نے کھیتی باڑی ترک کر دی تھی۔ زمین دلتوں کو جوتنے کے لیے دی جاتی جس کے عوض فصل کا ایک حصہ زمین کے مالک کو ملتا۔ بعض زمین کے قطعے بارش میں بھیگتے ہوئے اپنے مالک کی بے توجہی اور ناانصافی پر روتے ہوں گے۔ عبدالسلام کو یاد ہے یہی کچھ دس بارہ برس قبل جب وہ گانو آیا تھا اس وقت رشتے کی بڑی عورتیں اسے اپنے سینے سے لگا لیتی تھیں۔ دعائیں دیتی تھیں۔ مگر اب بچوں کو وہ اپنائیت نصیب نہیں

ہے۔ حتیٰ کہ قریب المرگ عورتوں کو بھی ان کے بیٹوں نے جماعت کی نصابی کتاب سے محرم اور نامحرم کا فرق سمجھا دیا ہے۔ اب ہاتھ ملانا ''زنا'' کی ایک شکل کہلاتی ہے اور لوگوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ ہاتھ کا وہ حصہ ہزار برسوں تک جہنم میں جلتا رہے گا۔

جہنم کا ڈر اور قبر کا عذاب عموماً گفتگو کا موضوع ہوتے ہیں۔ جگہ جگہ مدرسے کھل گئے ہیں جن میں فقہ اور مسلک کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جو بچے عموماً آوارہ گردی کرتے ہیں یا وہ لڑکیاں جو پہلی ماہ واری کے بعد گھر کی فصیلوں سے کود کر ندیوں کے کنارے کروندے کھانے یا رنگ برنگی پتھر چننے جانے کی جسارت کرتی ہیں۔ انھیں فوراً سیاہ لباس پہنا کر اخلاقی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مدارس میں داخل کیا جاتا ہے۔

مدارس سے فارغ ہونے کے بعد وہ عالمہ کہلاتی ہیں۔ ایسی ہی ایک عالمہ سے اس کی ملاقات ۹۸ء کی چھٹیوں میں ہوئی۔ وہ اپنے ایک دور کے رشتے دار کے گھر ان سے ملاقات کے لیے گیا تھا۔ معلوم ہوا وہ جناب کہیں باہر گئے ہیں اور عالمہ ان کی بیٹی ہے جو اس وقت گھر میں اکیلی تھی۔ عبدالسلام اس سے باتیں کرتا رہا۔ یہ ملاقات بہت خوش گوار رہی۔ عالمہ کو پتہ تھا کہ وہ کس رشتے دار کے یہاں مقیم ہے۔ اب جب بھی اس کے والدین بازار چلے جاتے وہ فون کر کے عبدالسلام کو بلاتی۔ وہ بھی تپاک سے اس کے دیار پر حاضر ہو جاتا۔ عالمہ کی گفتگو میں علمیت اور مذہبی عقیدت کا ملا جلا رنگ تھا۔ عبدالسلام اس سے کافی متاثر ہوا۔ اسے اس کے ہاتھوں کی چائے بہت پسند آئی۔ جس کی اس نے برملا تعریف بھی کی۔

ایک دن دو پہر کے دو بجے ہوں گے۔ عبدالسلام پھنس (کٹھل) کی سبزی کھا کر قیلولہ کے لیے پلنگ پر دراز ہوا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس کی خالہ سو

رہی تھی۔ اس نے فون اٹھایا۔ اس طرف سے عالمہ کی آواز آئی۔ دو تین منٹ بات کرنے کے بعد عالمہ نے اسے اپنے گھر بلایا۔ جب وہ اس کے دروازے پر پہنچا دروازے کی کڑی باہر سے لگی ہوئی تھی۔ عبدالسلام نے دروازے کی کڑی کھولی اور اندر داخل ہوا۔

''عابدہ۔''

''ارے آگئے۔ آؤ اندر پڑی میں آجاؤ۔''

''اچھا۔''

''عبدالسلام کڑی لگا آنا۔ ہوائیں بہت تیز چل رہی ہیں۔''

عالمہ کی ہدایت کے مطابق دروازے سے لگی ہوئی کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر اس نے دوبارہ باہر کی کڑی لگا دی۔ وہ پڑی میں گیا۔ پڑی کے ایک کونے میں موری تھی۔ موری میں دروازے کی جگہ پردہ لگا ہوا تھا۔ وہ کمرے کی پائٹن پر بیٹھ گیا۔ تین چار منٹ گزرے ہوں گے کہ عابدہ کی آواز اس کے کانوں پر پڑی:

''اسلام علیکم۔۔ وہ وہاں رسی پر ٹاول ہے ذرا دینا۔ میں بھول گئی تھی۔''

'ابھی لایا۔'

غسل خانے کے دروازے کے پردے سے ایک مخروطی انگلیوں والا ہاتھ باہر نکلا۔ عبدالسلام نے ٹاول آگے بڑھایا۔ عابدہ کی انگلیوں کا لمس اس کی انگلیوں سے ہوتا ہوا فوراً اس کے دل میں جا کر مدغم ہوگیا۔ وہ ایک طرف بیٹھ گیا۔ عابدہ فیروزی رنگ کی امپورٹیڈ میکسی پہنے ہوئے، بالوں کو جھٹکتی ہوئی اس کے سامنے جلوہ افروز ہوئی۔ ('جلوہ افروز ہوئی' اس نے لکھ کر کاٹ دیا تھا اور لکھا تھا 'آ کھڑی ہوگئی'۔ شاید دوسری قرأت کے بعد ریمارک کے طور پر اس نے اسی

لائن کے نیچے سبز روشنائی سے لکھا: ’فارسی اور عربی کے الفاظ سے بیان دلکش نظر آتا ہے لیکن مبالغے اور فریب کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ ان کافروں سے کیسے بچا جائے۔‘) خیر! لیکن مجھے پتہ نہیں کیوں ’جلوہ افروز ہوئی‘ لکھنے میں مزہ آیا۔ کیا اس کی وجہ عابدہ کا عالمہ ہونا ہے؟ اللہ ہی دلوں کا حال جانتا ہے۔۔۔ ویسے میں لکھ رہا تھا کہ عابدہ فیروزی رنگ کی امپورٹیڈ میکسی پہنے ہوئے، بالوں کو جھٹکتی ہوئی اس کے سامنے جلوہ افروز ہوئی۔ اس کے بال اس کی کمر تک پہنچتے تھے۔ اس قدر گھنے تھے کہ ایک لمحے کے لیے سلام کو ایسا لگا عابدہ ان کو جہاں پھیلا دے، وہاں اندھیرا ہو جائے گا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں عابدہ کے کمرے میں تھے۔ عابدہ اپنے بالوں میں تیل لگا رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ عبدالسلام کی آنکھوں میں اپنا عکس تلاش کر رہی تھی۔

’’سب کہاں گئے ہیں؟‘‘

’’دوسرے گانو میں۔‘‘

’’کب تک آئیں گے؟‘‘

’’آج رات نہیں، کل صبح آئیں گے۔‘‘

’’تو تم اکیلی رہو گی؟‘‘

’’ہاں۔‘‘

’’تمہیں ڈر نہیں لگتا؟

’’کس کا ڈر۔ اذان کی آواز جہاں تک جاتی ہے، وہاں تک شیطان نہیں آتے۔‘‘ عابدہ نے ایک سانس میں کہا۔

’’ہاں! صحیح کہا تم۔۔۔‘ کہتے ہوئے سلام نے دوبارہ اپنی ہتھیلی کی طرف

دیکھا جس پر عابدہ کے بھیگے ہاتھ کے لمس نے ایک عجیب احساس جگا دیا تھا۔
عابدہ آئینے کے سامنے بال سنوار رہی تھی کہ اس کی کنگھی بالوں میں الجھ گئی۔ ''ووں''
اس کی زبان سے ادا ہوا۔

عبدالسلام نے کنگھی نکالنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو عابدہ نے کہا: 'کنگھی تو نکل جائے گی۔' اتنا کہہ کر اس نے ایک بار سلام کی آنکھوں میں جھانکا اور جملہ مکمل کیا 'دل کی الجھن کیسے کم ہوگی؟''

عابدہ اس کے سینے سے اتنی قریب تھی کہ امپورٹیڈ میکسی کی مہک اس کے نتھنوں میں پھیل رہی تھی۔ عابدہ کا جسم اسے چھو رہا تھا۔ آئینے میں عبدالسلام کا عکس لہرایا۔ پہلے گندمی، پھر سمندری، پھر نیلے۔ پھر جامنی رنگ میں اس کا سایہ بدل گیا۔ جس میں شریانوں کا جداگانہ سرخ اور قرمزی رنگ الگ سے نظر آتا تھا۔ اپنی یہ چھبی اس کے لیے پہلا تجربہ تھا۔ عابدہ کے دونوں ہاتھ اس کی کمر پر تھے۔ وہ کوکن کی برساتی ندی کی طرح پر جوش لگ رہی تھی۔ ابھی اس میں اتنی تیزی اتنا بہاؤ اور اتنی امنگ تھی کہ اسے عبور کرنا جان جوکھم میں ڈالنا ہوتا۔

عبدالسلام نے رات میں آنے کا وعدہ کیا۔ عابدہ دروازے پر کھڑی اسے دوپہر کی دھوپ میں اوجھل ہوتے دیکھتی رہی۔ سلام خالہ کے گھر جانے کی بجائے گھنے جنگل میں چلا گیا۔ جنگل کے بیچوں بیچ ایک تالاب ہے جسے ''مانی'' کہا جاتا ہے۔ ٹھنڈے، میٹھے پانی کا تالاب۔۔۔ بیس پچیس سال قبل یہاں شیر اور دوسرے خونخوار جانور اپنی پیاس بجھانے راتوں کو آیا کرتے تھے۔ مگر آبادی کے بڑھنے اور جنگلوں کی کٹائی نے جانوروں کو ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا ہوگا۔ عبدالسلام نے تالاب سے تھوڑا پانی پی کر اپنے گلے کو تر کیا جس کی ساری رطوبت کو عابدہ کی

پر اسرار نگاہوں نے خشک کر دیا تھا۔ پانی کی ٹھنڈک کا احساس اس کے حلق سے نیچے اترا تو ایک شاداب لہر کی ترنگ بھی اس میں سرایت کرتی گئی۔ وہ دیر تک جنگل میں بھٹکتا رہا۔ جب واپس لوٹا تو اس کی خالہ نے چائے بنائی۔ چائے پینے کے کچھ دیر بعد اس نے کہا: 'میں شام کو دیر سے آؤں گا۔'

کچھ دیر وہ جانے انجانے لوگوں سے باتیں کرتا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کے قدم از خود کسی شرابی کی طرح مے خانے کی طرف بڑھنے لگے۔ جب وہ عابدہ کے دروزے پر پہنچا۔ باہر سے کڑی لگی ہوئی تھی۔ لیکن اب وہ جانتا تھا اس کا مفہوم کیا ہے۔ مکان کے اندر داخل ہو کر اس نے دوبارہ کڑی باہر سے؛ پھر اندر سے لگائی، اور عابدہ کو آواز دی۔

''اندر آؤ۔''

عبدالسلام کمرے میں داخل ہوا تو عابدہ پلنگ پر بیٹھی تھی۔ عبدالسلام کو دیکھتے ہی کھڑی ہوگئی۔ اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ بیٹھ گیا۔

''عبدالسلام تمھیں برا تو نہیں لگا؟''

''کیسی بات کر رہی ہو۔''

''نہیں یوں ہی۔''

تھوڑی دیر دونوں چپ رہے۔ پھر عبدالسلام نے کہا ''بیٹھو، کھڑی کیوں ہو۔''

عابدہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔ عبدالسلام نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس کی انگلیوں کے لمس کے ساتھ ہی اس نے ایک مدھم آتشی لہر کو اپنی شریانوں میں لرزاں محسوس کیا جو اس خیال کے پیدا ہونے سے قبل ہی اس کے پیروں کی

انگلیوں تک پہنچ چکی تھی۔ جس کی آنچ سے وہ پگھل گئی اور اس نے اپنی گردن سلام کے کندھے پر جھکا دی۔ کئی برسوں بعد اپنی ایک خاص سہیلی کو اس راز میں شریک کرتے ہوئے اس نے بتایا: 'درحقیقت میں آنکھیں بند کر کے اس لطف کو دیکھنا چاہتی تھی جسے عام طور پر لوگ صرف محسوس کرتے ہیں۔'

عبدالسلام نے اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیریں، تب عابدہ نے سرشاری میں اس کے دونوں ہاتھوں کو چوم لیا۔ اس رات عبدالسلام کو احساس ہوا کہ ندیوں میں مستقل بہاؤ، تیزی اور اچھان کے لیے متواتر اور مسلسل بارش کتنی ضروری ہے۔ یا پھر کہیں دور کسی پگھلتے ہوئے برف کے پہاڑی سلسلوں سے ان کا ربط کس قدر لازمی ہے۔ اس معاملے میں کوکن کی ندیاں بدنصیب ہیں۔ کوکن کی بیشتر 'ندیاں' سال بھر سرشاری سے محروم رہتی ہیں۔ حالانکہ بارش کے موسم میں یہ لہراتی، جھومتی اور گاتی ہوئی لبریز بہتی ہیں مگر سال کا بیشتر حصّہ یہ سوکھی، منتظر اور اداس رہتی ہیں۔ ان کے حزن کا احساس صرف کوکن کی منتظر، اداس اور تنہا عورتوں کی آنکھوں میں جھانک کر لگایا جا سکتا ہے۔

چند برسوں بعد عابدہ کی شادی قطر میں ملازمت کرنے والے گانو کے ایک لڑکے سے ہو گئی۔ چھٹی کے دو ماہ گزار کر وہ واپس قطر چلا گیا۔ عابدہ ایسے لمحوں میں

عبد السلام کو بہت یاد کیا کرتی اور جب اس کا دل بہت اداس ہو جاتا تو وہ بھی گھنے جنگلوں میں سیر و تفریح کے لئے نکل جاتی۔ جہاں ''مانی'' ہے۔ جس کے ایک گھونٹ سے ہی پیاس بجھ جاتی ہے۔ جب کبھی عبد السلام گانو آتا تو وہ اسی جگہ عابدہ کا انتظار کیا کرتا۔ اور وہ یہیں ایک دوسرے کی باہوں میں نا آسودہ زندگی کے کرب کو بدن کی موسیقی میں تحلیل کرتے۔ یہ سلسلہ ۲۲ برسوں تک جاری رہا۔ پھر جب عابدہ کے شوہر کو بلڈ پریشر اور شگر کے مرض نے بہت دق کیا اور وہ نوکری چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے واپس آیا تب اس کی تیمارداری میں عابدہ بارش کی سرشاری کے منظر بھول گئی۔ اس پورے سفر میں عابدہ نے دو لڑکوں اور ایک لڑکی کو جنم دیا۔ کئی سال بعد عابدہ کا بڑا لڑکا جب ایک موڑ پر عبد السلام کے سامنے پہلی بار وارد ہوا تو عبد السلام کو پتہ نہیں کیوں ایسا لگا گویا وہ اپنی نوجوانی کی تصویر دیکھ رہا ہو۔ عبد السلام کی ڈائری کے ایک باب میں اس محبت کے بارے میں اور بھی کئی باتیں تحریر ہیں جنھیں اس نے ''داستان عشق'' میں شامل نہیں کیا ہے۔

عبدالسلام سیر سپاٹے کا شوقین تھا۔ اکثر وہ اپنے احباب کے ساتھ پکنک کا پروگرام بناتا رہتا۔ اس کا خیال تھا کہ شہری زندگی کی ہنگامہ خیزی کو سرسبز وادیوں، پہاڑوں، آبشاروں اور ہوادار پیڑوں کے درمیاں وقت گزار کے کم کیا جا سکتا ہے۔ زندگی کی یکسانیت، چند لوگوں کے ساتھ روزانہ کے معاملات میں ایک جیسی سوچی سمجھی باتوں کو دہرانا۔ لیکن اس تکرار کو محسوس نہ کرنا اور اس سے پیدا ہونے والی پژمردگی کی کیفیت سے دل شکستہ نہ ہونا؛ سلام کے مطابق 'ذات کی گمشدگی' کی علامت تھی۔

اس کے اس خیال سے اس کے بیشتر دوست متفق تھے اور وہ سب مل کر عموماً دور دراز کے مقامات پر وقت گزارنے جایا کرتے تھے۔ اس نے اپنے دوستوں کو وارننگ دے رکھی تھی کہ جب وہ تفریح کے ارادے سے نکلیں، تب وہ اسکول، تعلیم اور بچوں کے مستقبل جیسے فرسودہ موضوعات پر بحث نہ کریں۔ ورنہ تفریح کا لطف جاتا رہے گا۔ اسے پہاڑی مقامات، ندیوں کے دہانوں اور گھنے جنگلات میں بسے ادی واسیوں کی زندگی سے بے پناہ محبت تھی۔ اس محبت کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ان کی زندگی کو 'حسین زندگی' سمجھنے کی حماقت کرتا تھا بلکہ اسے ان کی

زبوں حالی، تنگ دستی، سیاسی و معاشی استحصال، اور ان کی سمٹی ہوئی زندگی کا دکھ تھا۔ ان کے جسم کا دبلا پن، ان کے بچوں کی کسمپرسی اور ان کی عورتوں کی نیم برہنگی اس کے سینے میں کپکپی لیتی۔ وہ اس طبقے کی اس حالت پر احتجاج کرنا چاہتا تھا۔ لیکن سرکاری ملازمت میں احتجاج اتنا آسان نہیں تھا۔ اسے اپنی یہ مجبوری گلے کے ناسور کی طرح مہلک لگتی تھی۔

ایک دفعہ اپنے تین دوستوں کے ساتھ وہ بمبئی سے ستراسی کلو میٹر دور سپالے نامی ایک مقام پر بھٹک رہا تھا۔ ان کے واٹر بیگ کا پانی ختم ہو گیا تھا۔ کچھ دور جھاڑیوں اور مٹی سے بنے ہوئے دو جھونپڑے نظر آئے۔ حالانکہ کچھ مزید فاصلے پر پندرہ بیس اور مکانات بھی تھے لیکن اس نے سوچا پانی تو یہاں بھی مل جائے گا۔ یہ چاروں اس مٹی سے بنے جھونپڑے کے پاس پہنچے۔ اس مکان کا دروازہ لکڑیوں کا ایک کواڑ تھا شاید شب میں اسے دیوار کی بانس کے ساتھ باندھ لیا جاتا ہے۔

''ارے کوئی ہے؟''

''اندر کوئی ہے؟''

اندر سے ایک نحیف آواز:

''کون پاہجے۔'' (کون چاہیے)

''ارے باہر آؤ۔ ہم شہر سے آئے ہیں۔''

ایک نحیف آدمی نمودار ہوا۔

''ساہب کائے پاہجے۔۔''

''پانی آہیکا۔'' (پانی ہے کیا)

نحیف آدمی کے چہرے پر مایوسی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے

چاروں کو کھنگالنے والی نگاہوں سے دیکھا۔ اپنا سر کھجایا، پھر کہا:

''کائے منٹھلے ساہب'' (کیا کہا جناب)

''پانی پاہجے پانی، پینیا کرتا۔'' (پانی چاہیے پانی، پینے کے لیے)

اس کے چہرے پر ابھری ہوئی اداسی یکا یک غائب ہوگئی۔ ایک مسکراہٹ: زندگی کے انبساط سے لبریز مسکراہٹ۔۔ اس کے لبوں پر، اس کی روح کے کواڑ کھول کر چلی آئی۔ صدیوں سے اجتماعی تحت الشعور کے تہہ خانے میں مقید اس کی آنکھوں کی چمک دوبارہ اس کی آنکھوں کے آنگن میں لوٹ آئی۔

''صاحب ایک منٹ۔'' کہہ کر وہ اپنے جھونپڑے میں چلا گیا۔

چاروں وہیں کھڑے باتیں کرتے رہے۔

کچھ دیر بعد ایک نے دروازے میں سے گردن جھکا کر اندر دیکھا تو اسے کوئی نظر نہ آیا۔

ارے وہ آدی واسی تو اندر نہیں ہے۔

سب نے باری باری اندر جھانکا۔

جھونپڑے کے عقب سے بھی ایک دروازہ تھا۔ وہ وہاں سے نکل کر غائب ہوگیا تھا۔

یہ چاروں جھونپڑی کے احاطے کو پار کر کے پیچھے کی طرف گئے۔ وہ کہیں نظر نہ آیا۔ یہ اسے نظریں جمائے یہاں وہاں دیکھتے رہے۔

(دس منٹ بعد)

دور ایک چھوٹی سی بستی تھی اس طرف سے وہ دوڑتا ہوا ان کی طرف آرہا تھا۔ ایک پگڈنڈی پر ہانپتا کانپتا اس کا سیاہ رنگ ہیولا دھوپ کی لہروں میں ڈول رہا تھا۔ یہ پگڈنڈی اس کے لیے پل صراط سے کم نہ ہوگی۔

چاروں اس ہیولے کو آدمی میں بدلتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

وہ قریب پہنچا تو اس کی نحیف پسلیوں میں غبارے پھولے ہوئے تھے۔ اس نے کہا: 'ساہب شما کراہاں۔۔وشیر جھالا' (صاحب معاف کیجئے، دیر ہوگئی)

اس کے ہاتھ میں ایک جھولا تھا۔ وہ اس جھولے کو لے کر اندر داخل ہوا اور فوراً مٹکا لیے باہر نکلا۔ اس نے جھولے سے شیشے کے دو گلاس نکالے۔

چاروں 'ایک حیران تماشائی' میں بدل گئے تھے۔

اس نے گلاس دھوئے اور پانی پیش کیا۔

عبدالسلام اور ایک دوست نے پانی پیا اور گلاس واپس کیا۔

عبدالسلام یہ دیکھ کر حیران ہوگیا کہ اس آدی واسی کی صدیوں سے خشک آنکھوں میں تشکر کی نمی نمودار ہوئی۔ جانے کتنی صدیوں سے اس کے اندر یہ بادل بن کر امڈ رہے ہوں گے۔

عبدالسلام نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس کے نحیف بدن میں ارتعاش ہوا اور وہ بادل پھٹ پڑے۔ وہ زار زار رونے لگ گیا۔

چاروں حیران کھڑے رہے۔

عبدالسلام نے بالآخر اُس سے پوچھا۔

’’رڑتوس کشالا‘‘ (روکیوں رہے ہو۔)

اس نے دوبارہ کہا۔

’’ارے پن کائے جھالا‘‘ (بھئی ہوا کیا ہے۔) ایک نے پوچھا۔

’ساہب امچا ہاتانی کونی ہی پانی پت نائی۔ آج جیونات پیلیان دا تماس پانی دینیاچہ اوسر بھیٹلا۔ کائے چمتکار جھالا۔ امالا تمی مانوس سمجھتاؤ۔ می آنندی جھالو۔ (صاحب ہمارے ہاتھوں سے کوئی پانی نہیں پیتا، آج زندگی میں پہلی بار آپ کو پانی پلانے کا موقع ملا۔ معجزہ ہوگیا، آپ ہمیں انسان سمجھتے ہیں۔۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے۔) رندھی ہوئی آواز سے اس نے کہا۔

عبدالسلام بات سمجھ گیا تھا۔ صدیوں کے استحصال اور عدم مساوات نے اس آدی واسی کی زندگی میں جس ابدی تنہائی اور سکوت کو جنم دیا تھا آج پہلی بار اس میں ایک پل کے لیے سہی حرکت ہوئی تھی۔ کسی نے اسے انسان سمجھ کر اس سے کسی چیز کا تقاضا کیا تھا ورنہ اعلیٰ ذات کے افراد ان کے گھروں، برتنوں، یہاں تک کہ ان کے سایوں سے بھی دور رہتے آئے ہیں۔ اسی لیے خوشی کی ترنگ میں عقبی دروازے سے نکل کر وہ آدی واسیوں کی اس بستی میں گیا تھا جہاں چند لوگ شیشے کے گلاس استعمال کرتے تھے۔ وہ خود پلاسٹک کے گلاس میں پانی پیا کرتا تھا۔ اپنی زندگی کے اس یادگار دن وہ ہمیں کس طرح پلاسٹک کے گلاس میں پانی پیش

کرتا۔

عبدالسلام نے تھوڑے توقف کے بعد اس سے کہا۔

''بابا زرتی پاٹاٹ پانی دلا استہ، تری چالالا استا۔'' (اگر تم نے لوٹے میں پانی دیا ہوتا تب بھی چل جاتا)

وہ اس کے ساتھ بہت دیر بیٹھے رہے۔ اس کی کہانیاں، جنگل کے واقعات اور نچلی ذات کے لوگوں کی زندگی کے متعلق اس کی باتیں سنتے رہے۔ اسے اپنا اَتا پتا ایک کاغذ پر مراٹھی میں لکھ کر دیا اور کہا جب بھی شہر آئے تو ان سے ملے۔ مگر وہ شہر کبھی نہیں آیا۔

عبدالسلام جب بھی اخباروں میں بھوک سے خودکشی کرنے والے آدی واسیوں کی خبریں پڑھتا، تب اس کے سامنے اس لاغر، نحیف بدن والے آدی واسی کا چہرہ آجاتا۔ وہ سوچتا: کیا بھوک کی آگ میں وہ بھی جل گیا ہوگا؟ کیا بھوک نے اسے جنت کی آرزو میں دنیا کو خیرباد کہہ کر خودکشی کرنے پر مجبور کیا ہوگا؟

عبدالسلام آسمان کی جانب مغموم نگاہوں سے دیکھتا، کچھ کہہ نہ پاتا۔ صدیوں کی عدم مساوات کا احتجاج الفاظ سے کہاں ممکن تھا۔ ایسے اذیت ناک لمحوں میں وہ اکثر گھر سے نکل جاتا۔ بھیڑ میں بے ربط بھٹکتا۔ ''بسم اللہ پان شاپ'' پر پہنچتا: 'عابد

ایک بھولا، کتری، سپاری اسٹار مار کر۔'

کیا صرف ماوا کھانے سے اس کے اندر کی اذیت اور افسردگی کم ہوتی ہوگی؟

اس کی اسکول میں ایک دن:

اسکول میں 'بزم ادب' کا جلسہ منعقد کرنا تھا۔

عبدالسلام کو اس طرح کی سرگرمیوں میں دلچسپی تھی۔ وہ طلبہ کی تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھانا اپنی ذمے داری سمجھتا تھا۔ اس نے بڑھ چڑھ کر اس تقریب میں حصّہ لینا چاہا۔ یہ واقعہ اس کی تدریسی زندگی کے ابتدائی برسوں کا ہے۔ طلبہ کا انتخاب کیا گیا۔ بزم کے عہدے تفویض کئے گئے۔ طلبہ نے بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ نقشِ دیوار کے لیے ان کی تخلیقات جمع کی گئیں۔ تین چار اساتذہ جن کا ادب سے کوئی علاقہ نہ تھا، وہ بھی پیش پیش رہے۔ نامور ادیبوں اور شعراء سے رابطہ کیا گیا۔ پروگرام طے ہونے کے بعد ادارے کے ٹرسٹی کو بتایا گیا کہ اسکول ادبی وثقافتی پروگرام منعقد کررہی ہے جس میں مشہور شخصیتوں کو مدعو کیا گیا ہے۔ انھیں صدارتی خطبہ دینا ہوگا۔ ٹرسٹی کو ادب یا ثقافتی پروگرامز سے کوئی نسبت نہیں تھی لیکن اس کے باوجود وہ فوراً تیار ہو گئے۔ شاید انھیں ایسا لگا ہو کہ یہ کوئی ایسی سرگرمی ہوگی جس سے آخر میں انھیں فیض پہنچے گا۔ سلام کو بھی ان کی شخصیت کا پورا علم نہیں تھا۔ خیر! 'بزمِ ادب' کا جلسہ شروع ہوا اور ختم ہوا۔ طلبہ نے شعراء کا کلام توجہ اور گرم جوشی سے سنا۔ ان کے آٹو گراف

لئے ۔آٹو گراف دیتے ہوئے شعرائے کرام کے چہروں پر کیسی شادمانی نظر آتی ہے اس بات کا احساس سلام کو اس دن ہوا۔ایک نوجوان شاعر جس نے پہلی بار آٹو گراف دیا تھا وہ بہت مسرور لگ رہا تھا۔طعام کے بعد اسے بیت الخلاء کی حاجت ہوئی۔ جہاں بیٹھے بیٹھے تصور کی دنیا میں وہ خود کو اتنی بار آٹو گراف دیتے ہوئے دیکھتا رہا کہ اس کی آنکھ لگ گئی ۔خواب میں اس نے امیتابھ بچن، من موہن سنگھ، رابندر ناتھ ٹیگور، علامہ اقبال اور ٹارزن کو آٹو گراف دیے ۔ یہ سب ایک عالمی مشاعرے کے بعد قطار میں کھڑے ہو کر اس سے آٹو گراف لے رہے تھے۔سب سے آخر میں نریندر مودی تھے ۔ان کی آٹو گراف بک کا رنگ کیسری تھا۔نوجوان شاعر نے ایک نظر ان کی تل چاؤلی داڑھی پر ڈالی اور آٹو گراف بک میں دستخط کرتے ہوئے اسے ایک شعر سنایا:

خود دار ہوں کیوں آؤں درِ اہل کرم پر
کھیتی کبھی خود چل کے گھٹا تک نہیں آتی

مشاعرے کے بعد ابھی وہ ان اہم شخصیات کے ساتھ طعام کے لیے بیٹھنے ہی والا تھا کہ بیت الخلاء کے دروازے پر دستک ہوئی اور اس کا خواب ٹوٹ گیا۔ نوجوان شاعر فوراً بیت الخلاء سے باہر نکلا۔اس کے سامنے دو سنیئر شاعر کھڑے تھے۔

ایک نے کہا: ’کیا کر رہے تھے آدھے گھنٹے سے یار ...‘

نوجوان شاعر نے آنکھ ملتے ہوئے کہا: جو رہی سو بے خبری رہی۔‘ اور بے نیازی سے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

دوسرے سنیئر شاعر نے فوراً اسے ٹوکتے ہوئے کہا: ’محترم! پائجامہ درست کیجئے ۔۔ورنہ مصرعہ بحر سے باہر آجائے گا۔‘

نوجوان شاعر نے تذبذب میں سنیئر شاعر کی انگلی کے اشارے کی طرف دیکھا۔ بے خبری کا نشہ کافور ہو گیا۔ شرمندگی کے عالم میں اس نے ایک طرف منہ کیا اور کرتا پائجامہ درست کیا۔ دراصل عجلت میں اس کے کرتے کا آدھا حصہ پائجامے کے اندر پھنس گیا تھا اور وہ پائجامے کا ایک بٹن لگانا بھی بھول گیا تھا۔

مشاعرے سے قبل ٹرسٹی صاحب نے ایک لمبی اور اکتاہٹ بھری تقریر کی تھی جس کا علم، تعلیم اور عملی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں تھا بلکہ مستقبل کی ان تجاویز کا تفصیلی بیان تھا جس سے ان کے ٹرسٹ کی مالی حیثیت مزید مستحکم ہونے والی تھی۔ اس بات کو چھپانے کے لیے وہ مذہبی تعلیم کے فروغ پر بھی زور دے رہے تھے۔ عبدالسلام کو ایک لمحے کے لیے ایسا لگا کہ یہ آدمی واقعی قوم کا ہمدرد ہے۔ مسلمانوں کو تعلیم کے زیور سے مزین کرنا چاہتا ہے۔ اس وقت تک اسے معلوم نہیں تھا کہ اس قبیل کے لوگ محض سننے والوں کو رجھانے بھر کے مسلمان ہوتے ہیں۔

غزلوں کی ترنگ اور طلبہ کی امنگ نے خوب سماں باندھا تھا لیکن ٹرسٹی کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نظر نہ آئی تھی۔ ان کے چہرے پر حیرانی کا ایک رنگ واضح تھا، جسے پرانے اسٹاف نے پہلے بھی کئی بار ان کے چہرے پر ضرور دیکھا ہوگا۔

محفل کی برخاستگی کے بعد اساتذہ اور ٹرسٹی کی میٹنگ تھی۔ بیشتر اساتذہ کو ایسا لگا تھا کہ اتنے اچھے پروگرام پر ٹرسٹی صاحب خوشی کا اظہار اور حوصلہ افزائی کریں گے۔ مہمانوں کے چلے جانے کے بعد میٹنگ کے لیے سب اسٹاف روم میں اکٹھا ہوئے۔ میٹنگ کی شروعات قرآن کی تلاوت سے ہوئی۔

تلاوت ختم ہوتے ہی ٹرسٹی بول پڑے۔ ''میں مسلمان ہوں۔ میں دینی تعلیم سے لوگوں کو اچھا مسلمان بنانا چاہتا ہوں۔ شاعری وائری سے مجھے نفرت ہے۔ یہ اپنے مجب کے خلاف ہے۔ تم لوگ بچوں کو بگاڑنے پے تلے ہو کیا؟''

عبدالسلام حیرانی کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔

ایک بزرگ معلم نے کہا: 'شاعری ۔۔۔ اردو زبان کی ثقافت اور نصاب کا حصہ ہے۔'

''جبان اور سکافت کے نام پر کاپھروں جیسے کام کون سی دین داری ہے۔'' ٹرسٹی نے طیش میں کہا۔

ایک خاتون معلمہ جن کے شوہر بھی شاعر تھے بیچ میں بول پڑیں: 'سر اس سے کافروں کا کیا تعلق ہے؟'

''کاپھر لوگ سے تالوک ہے۔ میرے مجب میں یہ سب نہیں ہے۔''

عبدالسلام سوچ رہا تھا کہ کہہ دے آپ کے مذہب میں مردوں اور عورتوں کا ایک ساتھ بیٹھ کر میٹنگ کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ اور وہ سارے کام بھی نہیں ہیں جن کے سبب آپ دولت مند ہوئے ہیں ۔۔۔ لیکن وہ کہہ نہ سکا۔ وہ اپنے سینئرز کو سنتا رہا۔

اردو کے ایک معلم نے کہا: 'سر اس طرح تو پوری اردو زبان کافروں کی ہو

جائے گی۔'

چیئرمین نے اس کی جانب دیکھا اور کہا: ''میں نے اردو زبان کا اسکول اس لیے کھلا کیوں کہ مجب کی زیادہ کتابیں اس میں ہیں۔ تم لوگ مجب کی کتابیں پڑھو۔''

عبدالسلام سوچ رہا تھا کہ کیا اس آدمی نے اپنی زندگی میں مذہب کے بارے میں ایک بھی کتاب پڑھی ہوگی۔

'مجھے معلوم نہیں تھا کہ مذہبی کتابیں پڑھنے کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کو پڑھنے کا مشورہ دینے کے لیے ہیں۔'

مذہب: عمل کرنے کے لیے نہیں، بلکہ شخصیت کو سنوارنے، سماج میں مرتبہ اور سیاسی مقاصد حاصل کرنے کا ایک شارٹ کٹ ہے۔

'مذہب لاٹھی ہے بینائی نہیں۔'

شاید یہ جملے' متفرق نوٹس کی ڈائری' میں سلام نے اسی پس منظر میں لکھے ہوں۔ ایک سال بعد کی تاریخ کے ساتھ اس میں مزید کچھ باتوں کا اندراج ملتا ہے مثلاً دولت مند افراد کا ایک بڑا طبقہ مذہب کو ایک نشہ آور گولی کی طرح استعمال کرتا ہے۔ بے ایمان، مفاد پرست، شخصیت پرست، دھوکے باز، اور بد اخلاق افراد بھی مذہب کی چادر اوڑھ کر اپنے سیاہ باطن اور ناسور زدہ ذہنیت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ دو تین عربی کلمات کو تقاریر کی تمہید اور اختتام میں استعمال کرتے ہیں جس سے بے علم اور رنادار مسلمان ان کو دین کا پاسدار سمجھنے کی غلطی کر بیٹھتا ہے۔

عبدالسلام کی شخصیت میں جو کجروی در آئی تھی اس کا سراغ اس طرح کے مزید واقعات کو پڑھ کر لگایا جا سکتا ہے۔ جن کو اس نے تفصیل کے ساتھ' متفرق نوٹس کی ڈائری' میں لکھا ہے۔ یہ واقعات ۳۳۰ صفحات پر پھیلے ہیں۔

اس کی ذات کا کنواں:

عبدالسلام کو کنویں سے بہت ڈر لگتا تھا۔

اس کے بچپن کا ایک واقعہ ہے۔ وہ ہم جھولیوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ کافی وقت گزرنے پر ان میں سے دو دوستوں کو پیاس لگی۔ پانی پینے کے ارادے سے وہ ایک کنویں پر پہنچے۔ ایک دوست ڈول ڈال کر پانی نکالتا اور دوسرا دونوں ہاتھوں کو کٹوری بنا کر پیتا۔ جب عبدالسلام نے کنویں میں ڈول پھینکا تو یکا یک اس کے ہاتھ سے رسی چھوٹ گئی اور ڈول کنویں میں گر گیا۔ کنویں کی دیوار سے جھانک کر اس نے دیکھنا چاہا کہ ڈول کہاں ہے۔۔۔وہ دیر تک بے حس وحرکت کنویں کی دیوار سے چمٹا رہا۔ آخر کار ایک دوست نے اسے چھو کر پوچھا: ''ابھے اتنے دیر سے کیا دیکھ رہا ہے۔''

عبدالسلام چونک کر مڑا۔ اس کی آنکھوں میں کنویں کا گہرا اندھیرا اتر گیا تھا۔

ایک دوست نے کہا: 'کسی نے دیکھا نہیں ہے۔۔وٹ لو ادھر سے۔'

دوسرا بولا: 'ڈول تو ہاتھ سے چھوٹتے رہتے ہیں۔۔۔ناراج کائے کو ہوتا

ہے،کوئی اور آئے گا تو نکال لے گا۔'

عبدالسلام کے چہرے پر یکایک چھائی ہوئی اداسی کو دور کرنے کی دوستوں نے کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئے۔تب استہزائیہ انداز میں ایک نے کہا۔''ابھے کنویں میں بھوت تھا کیا۔''

عبدالسلام نے اس دوست کی طرح مڑ کر دیکھا۔دونوں کی آنکھیں ملیں۔ عبدالسلام کی آنکھوں میں اداسی کی وجہ سے ایک خاص قوت در آئی تھی جس کا احساس ہوتے ہی اس کے دوست نے آنکھیں جھکا لیں۔

دوسرے دوست نے کہا''سالے بتائے گا؟''

عبدالسلام نے کہا:''کنواں بہت گہرا تھا۔اتنا گہرا کنواں میں نے کبھی نہیں دیکھا۔''

ایک نے کہا:۔پچر جیسا ڈائیلوگ مت مار۔''

دوسرا بولا:''ابھے سسپنس مارتا ہے۔''

عبدالسلام کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اس نے کنویں میں جو کچھ دیکھا ہے اس پر کوئی یقین نہیں کرسکتا اور اس کے علاوہ کوئی اور وہ دیکھ بھی نہیں سکتا جو اس نے دیکھا ہے۔اس شام کی رات عبدالسلام نے کھانا نہیں کھایا۔ بہانا بنا کر جلدی لیٹ گیا۔ چادر میں اس نے آنکھیں کھولیں،تو ڈر گیا۔اسے لگا وہ خود اس کنویں میں ہے۔اس کے اطراف اندھیرا ہے۔اس کی نگاہ سفر کرتی جاتی ہے لیکن کنویں کی گہرائی کا خاتمہ نہیں ہوتا۔گویا کنواں کبھی نہ ختم ہونے والی ایک سرنگ ہو۔بے انت اندھیری سرنگ۔تاریک سرنگ میں جو چیز ڈول رہی تھی،وہ ڈول نہیں تھا۔وہ غالباً اس کے والد کا چہرہ تھا۔اس سرنگ میں اس کے والد کا چہرہ

کہاں سے در آیا۔ سرخ تمتماتا ہوا چہرہ، موٹی سوجی ہوئیں آنکھیں۔ چوڑی پیشانی جس پر کوئی لکیر نہیں تھی۔ پتلے پھیلے ہوئے ہونٹ۔ ان ہونٹوں سے الفاظ ایسی ہی بے ترتیبی سے ادا ہو رہے تھے جس طرح اس کے والد ادا کرتے تھے، جب وہ شراب اور چرس کے نشے میں مدہوش ہو کر گھر لوٹتے تھے۔ اور پھر۔۔۔ بات بے بات گھر میں ہنگامہ ہوا کرتا۔ نشہ اپنے آخری اظہار کے طور پر اس کی والدہ پر ٹوٹتا۔ والدہ کا غم زدہ چہرہ والد کی مار پیٹ سے متورّم ہو جاتا۔ اتفاق سے وہ بھی سرنگ کے ایک کونے میں لٹک رہا تھا۔ جس پر کچھ دیر بعد اس کی نظر پڑی تھی۔

اس کے بڑے بھائی کا چہرہ جو والد کے ظلم سے تنگ آ کر کئی بار گھر چھوڑ کر بھاگ چکا تھا اور ہر بار ماں کی محبت اسے دوسرے تیسرے دن گھر لے آتی تھی۔ آج وہ حیران تھا۔ اس کے گھر میں واقع ہونے والے سارے واقعات پل بھر میں اس تاریک کنویں میں کہاں سے در آئے۔ خدا جانے! لیکن ان واقعات نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔ سراسیمگی کے عالم میں اس نے کچھ دیر خود کلامی کی جو اسے بعد میں یاد نہیں رہی۔

فراموشی کی دلدل میں وہ ان واقعات کو دفن کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس واقعے کے بعد کنویں کا ڈر اس کی روح میں بیٹھ گیا تھا۔ کنواں اس کے المناک تحت الشعور کے تحرک کی نشانی بن گیا تھا۔

عبدالسلام نے نجی ڈائری میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ اپنے والد کی شراب نوشی اور تباہ حالی سے بہت دل برداشتہ تھا جس کی وجہ سے اس کی ذات میں بھی ایک چھید ہو گیا تھا جس میں وہ جب بھی جھانکتا اسے کسمساتے ہوئے اندھیرے میں کچھ چیزوں کے رینگنے کا احساس ہوتا لیکن وہ کبھی سمجھ نہیں پاتا وہ کیا

یا کون ہیں ۔اس کی روح جس قدر اس کی ذات کے چھید کی گہرائی اور پراسراریت کی پیمائش کرنا چاہتی ،اس کا احاطہ پھیلتا اور وہ مزید گہرا ہوتا چلا جاتا۔اس احاطے میں وہ اپنے بچپن کی یادوں کی سنگلاخی کو دیکھ سکتا تھا۔اس کی والدہ کی سیاہ بے نور آنکھیں نظر آتیں جن میں شوہر کے ظلم سے پیدا ہونے والی ویرانی تھی۔کبھی کبھی اسے ایسا لگتا شدتِ درد سے اس کی والدہ کی آنکھیں پھٹ جائیں گی اور اس کے چہرے پر ان آنکھوں کے اندر کا مواد آ گرے گا۔ان آنکھوں نے جو خواب دیکھے تھے وہ وہیں پڑے پڑے مر گئے تھے اس کی بو وہ اپنے ناک میں محسوس کرتا۔اسے اپنی ماں کا چہرہ بغیر آنکھوں کے دکھائی دیتا جن میں آنکھوں کے سوکیٹ کی جگہ دو سیاہ داغ نظر آتے تھے۔ان مردہ سیاروں میں بہت کششِ ثقل تھی۔اس کے اطراف کی ساری اشیاء خود بہ خود ان میں گر کر اپنا وجود گنوا دیتیں۔اس طرح کے احساسات کو زائل کرنے کے لیے وہ گھنٹوں سرگشتہ و درماندہ بھٹکتا رہتا۔۔۔ مزید براں اس کی یہ کوشش بھی ہوتی کہ وہ گھر کی چار دیواری میں جاری تلخی اور ناآسودگیوں کے سبب پیدا ہونے والی افسردگی کو کسی طرح بھول جائے۔۔۔

والد کی جانب سے کربناک حد تک نظر انداز کئے جانے اور اس کرب پر نہ بہائے ہوئے آنسو اس کی ذات کے چھید میں قطرہ قطرہ گرتے رہتے۔(اس عمیق باطنی کنویں میں پھینکی گئی یادوں کی صلیبیں وقت کی حدت سے نابود ہو جائیں گی۔ اس کا یہ گمان اس کی بہت بڑی بھول تھی۔)۔عبدالسلام کو ایسا لگتا تھا وہ دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان ہے جس کے پاس 'فراموشی کے لیے یادداشت ہے'۔ شاید یہ بہت بڑا تضاد تھا جو اس کی شخصیت کو دو متساوی خانوں میں تقسیم کرتا تھا۔ اسے معلوم تھا اس کے دل میں ایک نادیدہ کنواں ہے اور وہ یہ بھی جانتا تھا اسی

بات کو چھپانے کی جد و جہد میں وہ زندگی کی دیگر سرگرمیوں میں گرفتار ہے۔تعلقات، محبتیں، تنازعات اور کامیابیاں، درحقیقت: روح کے اس بے نت اندھیرے سے چشم پوشی کے بہانے تھے۔اسی لیے وہ خود کو ہمیشہ سرگرم اور مصروف رکھا کرتا تھا۔کیا وہ واقعی یہ بھول گیا تھا کہ وہ بہت ساری حقیقتوں کا قبرستان ہے۔یادوں کے مہیب قبرستان میں بدلنا آدمی کا مقدر کیوں ہے؟

ایک روز جب وہ صفیہ کے نیشنل پارک میں بیٹھ کر محبت اور سماج کے موضوع پر گفتگو کر رہا تھا تب صفیہ نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا تھا۔باتوں میں وقت بتانے سے بہتر ہے۔۔۔وہاں ایک پرانا کنواں ہے، چلو اسے دیکھ آتے ہیں۔ اس وقت اس کے منہ سے برجستہ نکلا تھا:'یہاں بھی پرانا کنواں!' اس دن پل بھر کے لیے اسے یہ احساس ہوا تھا کہ وہ جس بات کو بھول چکا ہوتا ہے، وہ باتیں اسے زیادہ یاد رہتی ہیں۔

صفیہ کے اس جملے پر دھیان نہیں دیا تھا۔اس وقت وہ کسی بات پر دھیان دینے کی حالت میں یوں بھی نہیں تھی۔عبدالسلام کا ہاتھ پکڑ کر، اسے کھینچ کر، وہ اسے کچھ دور لے گئی۔جہاں زیادہ گھنی جھاڑیاں تھیں۔ایک سایہ دار پیڑ تھا۔وہ درخت کے تنے سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئے۔صفیہ نے اس کے کندھے پر اپنا سر رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔عبدالسلام نے ایک نظر ارد گرد دیکھا اور پھر کہا:'تو بولی تھی ادھر باوڑی ہے۔کدھر ہے؟'

صفیہ نے پلکیں کھولتے ہوئے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا۔''بدّھو! پیار کے ٹوپک پے لیکچر دے رہے تھے۔۔۔پر اتنا نہیں جانتے۔۔۔پیار بولنے کا نہیں کرنے کا نام ہے۔''

عبدالسلام مسکرایا۔ اس نے قدرِ متانت سے کہا: ''مائے گوڈ! love کے معاملے میں تو expert لگتی ہے۔''

صفیہ نے بمبئ کی بولی میں جواب دیا جس کا مطلب تھا: ''یہ عورتوں کا میدان ہے۔ اور اس معاملے میں ہم زیادہ practical ہیں۔''

''اور مرد کیا ہوتا ہے؟

''مرد۔۔۔عورتوں کا خیال ہے کہ experimental ہوتا ہے۔''

اس گفتگو کے بعد صفیہ practical ہوگئی اور عبدالسلام exprimental ہو گیا۔

عبدالسلام نے جب صفیہ کی روداد اپنی ڈائری میں لکھی تو اس واقعے پر اس نے ایک رمارک بھی لکھا۔ وہ کچھ یوں ہے کہ: ''محبت نہ ہو تو آدمی دل کے پراسرار کنویں میں گر کر مر جائے گا۔''

اسی صفحے پر چھ سال بعد اس نے ایک اور جملہ لکھا: 'خدا کے بغیر اتنی تنہا اور بے معنی زندگی میں، سوائے محبت۔۔۔اور کون معنی پیدا کرسکتا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی اور جھوٹی سے جھوٹی محبت بھی اپنا ذائقہ، اپنا لطف، اپنی شادابی اور اپنے رنگ رکھتی ہے۔ اس کے بغیر زندگی بھی خدا کی طرح بے رنگ اور نرا کار ہو جائے گی۔''

ایک دن ایسا بھی آنے والا تھا جب عبدالسلام کو اپنی ذات کے سب سے بڑے خوف کا سامنا کرنا تھا۔ اسے کنویں میں کودنا تھا۔ جو مرکز اس کی روح کی المناکی کا سبب تھا جس نے اس کی زندگی کو ایک تجربہ بنا دیا تھا اس گہرے چھید میں ایک دن اس کو چھلانگ لگانا تھی۔

ہوا یوں کہ اسکول کی الوداعی پارٹی جاری تھی۔ شام کے سات بجے ہوں گے۔ طلبہ و طالبات جوش و خروش میں تھے۔ غزلیں اور فلمی نغمے گائے جا رہے تھے۔ تقاریر ہو رہی تھیں۔ دوسری طرف اسکول کی دیوار سے ملحق میدان میں ایک طالبہ بیٹھی اپنے عاشق کے نام آخری خط لکھ رہی تھی۔ شاید اس کی شادی اس کے والدین نے قبل از وقت اس کی مرضی کے خلاف کہیں طے کی ہوگی یا اس کے عاشق کا دل کسی اور پر آ گیا ہوگا۔ وہ اس طالبہ کے ناک نقشے سے واقف تھا۔ کھڑکی کے شیشوں سے یوں ہی بے خیالی میں جب اس نے باہر جھانکا تو اسے جھٹ پٹے میں سرسراتا ہوا ایک سایہ دکھائی دیا۔ اس نے سائے پر نظریں مرکوز کیں۔ بغور

دیکھا اور پھر پروگرام میں بیٹھے طلبہ پر ایک اچٹتی نظر دوڑائی۔ روحانہ کو وہاں نہ پا کر اسے حیرت ہوئی۔

دوسرے منزلے سے اتر کر اسکول کا احاطہ عبور کر کے وہ سرعت سے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ جہاں روحانہ کے سائے کو اس نے دیکھا تھا۔ وہیں کچھ فاصلے پر کنواں بھی تھا۔ اس دوران روحانہ نے بائیں ہاتھ کی ایک انگلی کو تیز دھار دار بلیڈ سے کاٹا اور تازہ خون سے کاغذ پر لکھا: صمد تم میری دنیا تھے جس دنیا میں تم نہیں اس دنیا میں مجھے بھی نہیں رہنا خدا حافظ۔

کاغذ کو اس نے زمین پر رکھا اور کنویں کی طرف بڑی۔

اس کا کنویں تک پہنچنا تھا کہ عبدالسلام احاطے کو عبور کر چکا تھا۔ اس کی نظروں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ فوراً اس کے پیچھے دوڑا۔ تب تک وہ کنویں میں چھلانگ لگا چکی تھی۔ عبدالسلام کے پاس شاید اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ چلا کر بھیڑ جمع کرتا اور پھر کسی اور کو کنویں میں کودنے کیلئے کہتا۔ کنویں کے قریب پہنچتے ہی ایک طلسمی طاقت نے اسے ایک پل کے لیے زمین سے جکڑ لیا۔ وہ رکا۔ اس نے خود کو یادداشت اور فراموشی کے پل صراط پر کھڑا پایا۔ اس نے ماضی کے الوہی عذاب کے دکھ کے ساتھ فلک شگاف آواز میں اسکول کے دیگر اساتذہ کو پکارا اور کنویں میں کود پڑا۔ آواز محفل گاہ کی کھڑکیوں سے ٹکرا کر اندر داخل ہوئی۔ بعض طلبہ اور اساتذہ استعجاب کے ساتھ دوڑ پڑے۔ اس بیچ کنویں کی تنہائی میں عبدالسلام روحانہ کو اپنے کندھوں پر اٹھائے، سر آسمان کی طرف کئے دوستوں کو آواز دے رہا تھا۔

سب وہاں پہنچے۔

روحانہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی البتہ حیرانی اور بے یقینی سے اس کی زبان گنگ ہوگئی تھی۔ وہیں کسی کی نظر اس کاغذ پر پڑی۔

دو خاتون ٹیچروں نے روحانہ کو اٹھایا اور فوراً دواخانے کی طرف لے دوڑیں۔ عبدالسلام نے ایک گھونٹ پانی پیا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ پھر کھڑا ہوا۔ اس کے قدم کنویں کی جانب بڑھے۔ کنویں کی دیوار پر ہاتھ رکھ کر اس نے کنویں میں جھانکا۔ وہاں اس کے والد کا سرخ کوئلوں کی طرح دہکتا ہوا چہرہ سیمابی اندھیرے میں لہرا رہا تھا۔ ایک کونے میں اس کی ماں کی تھکی افسردہ آنکھوں کی اداسی اونگھ رہی تھی۔ آج کنویں میں اسے یہ دیکھ کر مزید حیرانی ہوئی کہ نیلے آسمانی رنگ کے ساتھ ایک اور چہرہ وہاں لہرا رہا تھا جس سے اس نے بے پناہ محبت کی تھی لیکن جس کی کہانی وہ کبھی قلم بند نہیں کر سکا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ جسے وہ آج تک کنواں سمجھتا آیا ہے۔ وہ کنواں نہیں اس کا دل ہے۔ کنواں تو وہ تھا جس میں روحانہ نے چھلانگ لگائی تھی۔

اس کی آنکھیں پرنم ہوگئیں۔

وہ مڑا اور کنویں کی دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ فشارِ خون سے اس آنکھیں شعلے کی طرح دمک رہی تھیں۔ اسے اس بات کا شدید احساس ہوا کہ اس کی اب تک کی زندگی، اس کی خود سے آویزش اور خود سے حریفانہ کشمکش کی کہانی تھی۔ اس احساس نے اسے شدید حزنیہ کیفیت میں مبتلا کیا جس نے اس کے دل کے ناسور کو پھاڑ دیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو یا لیکن آنسو اس کی آنکھوں میں نہیں تھے۔ اس وقت اس کی جیب میں بھولا کتری سپاری والا ماوا بھی نہیں تھا۔

اس واقعے کے تین دن بعد پولیس نے اس کے گھر سے اس کی لاش برآمد

کی۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق فشارِ خون سے اس کے دماغ کی رگیں پھٹ گئیں تھیں۔ بعد از مرگ بھی اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ آخر وہ دنیا کو دیکھنے کا اس قدر آرزومند کیوں تھا؟ کوئی نہ جان سکا۔

انتساب

ان تمام محبتوں کے نام جنھیں سماج، مذہب اور اخلاقیات
کے خودساختہ دائرے قبول کرنے سے ڈرتے آئے ہیں۔
ان ادیبوں کے نام جو برصغیر کی مجموعی ثقافتی روایت کے
دفاع میں سرگرم ہیں۔

"For they lived long enough to know that love was always love, anytime, anyplace, but it was more solid the closer it came to death."

—Gabriel Garcia Marquez

Love in the Time of Cholera-page-345

"The worst thing is not that the world is unfree, but that people have unlearned their liberty."

—Milan Kundera

Life is elsewhere-page-46

ابواب

۱۔ باب اول : میں کیا کہوں میرے دل کا ورق تو سادہ تھا۔
۲۔ باب دوم : مگر وہ پھول سا چہرہ نظر نہ آتا تھا۔
۳۔ باب سوم : کہ زیرِ سنگ خنک پانیوں کا چشمہ تھا۔
۴۔ باب چہارم : میں اپنی گونج تھا اور گنبدوں میں رہتا تھا۔
۵۔ باب پنجم : ہر ایک طرف سے مجھے آسماں نے گھیرا تھا۔
۶۔ باب ششم : سنا نہیں جو کسی نے ہوا کا نوحہ تھا۔
۷۔ باب ہفتم : وہ نیلی جھیل تھی یا آسماں کا ٹکڑا تھا۔
۸۔ باب ہشتم : وہاں بھی تیری صدا کا غبار پھیلا تھا۔
۹۔ باب نہم : کہیں کہیں پہ کوئی روشنی کا دھبا تھا۔

☆☆

باب اول

میں کیا کہوں میرے دل کا ورق تو سادہ تھا

مئی مہینے کے آخری دن تھے۔ دن بھر گرم ہوا چلتی رہتی، البتہ شام ہوتے ہوتے سمندر کی طرف سے آنے والی ہواؤں کے ساتھ ٹھنڈے جھونکے بھی آجاتے اور ماحول قابل برداشت ہوجاتا۔ دن بھر کی گرمی میں پکے ہوئے آموں اور کاجو کے پھلوں کی مہک شام کے ان جھونکوں میں زیادہ اچھی لگتی۔ کوکن گرم مرطوب آب وہوا کا خطہ ہے جس کے کنارے کنارے بحرعرب کی لہریں صدیوں سے ایک تاریخ کا قبرستان اپنے ساتھ لیے موجزن ہیں۔ ایک ایسا سمندر جس کا دوسرا کنارا دوسری دنیاؤں کی پراسرار تہذیب سے جاملتا ہے۔ بعض پرانے لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ موہن جودارو سے ممنوع محبت کرنے والے جس گھرانے کو شہر بدر کیا گیا تھا دراصل سب سے پہلے وہی اس خطے میں آبسا۔ خلاف معمول اس شام ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں ایک پراسرار گرم لہر تحلیل

ہوگئی تھی۔ بحرِعرب سے آنے والی ہواؤں سے زیادہ سندھ کی تپش کا ایک احساس اس لہر میں پوشیدہ تھا، جس میں بجائے آم اور کاجو کی مہک جنگلی پیڑوں کی بو زیادہ تھی۔

بہت سارے رشتے داروں اور پڑوسیوں کی آمد سے آنگن میں آوازیں رینگ رہی تھیں اور جامن کا پیڑ چپ چاپ حیران نگاہوں سے ادا ہونے والے جملوں کو سننے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ قہقہوں اور سرگوشیوں کے درمیان عبدالعزیز کے چچا کو مہندی لگائی جانے والی تھی۔ شام سے پہلے ہی آنگن میں لگے مہندی کے پیڑ کی پتیاں نکال کر پاٹے پر مصالحے کی طرح پیس پیس کر مہندی تیار کی گئی تھی۔ اب ایک طرف اندھیرے میں کھڑا برہنہ مہندی کا پیڑ سوکھے ہوئے بیر کے پیڑ کی طرح افسردگی میں ڈوبا لگ رہا تھا اور اس کے تنے کے پاس سو رہی چھوئی موئی شرمائی ہوئی تھی کہ بہت جلد سرخ دلہن کے ہاتھ آ کر کس پیار سے اس کے گالوں کے ساتھ چھڑ چھاڑ کریں گے۔

عبدالعزیز نے اسکول سے ہفتے بھر کی چھٹی لے رکھی تھی۔ مہمانوں کو چائے پلانے کی ذمہ داری اسے سونپی گئی تھی اور اس کام میں اسے بھی بہت مزہ آ رہا تھا۔ وہاں ایک ساتھ کئی لوگ آ جاتے تو ایک بڑی پلیٹ میں بہت سارے کپ لیے دھیرے دھیرے چلنے میں اس کا تن اور من دونوں ایک باہمی ارتباط ظاہر کرنے لگ جاتے۔ گویا وہ کرتب بتا رہا ہو۔ اور ہاں۔۔۔ جہاں کوئی لڑکی کسی کونے میں اسے نظر آتی جسے اس نے پہلے نہ دیکھا ہو تو اس کی نظریں، لمحہ بھر سہی، اس پر ٹھہر جاتیں۔ وہ آگے بھی اگر بڑھ جاتا، تو اس کی آنکھیں وہیں پیچھے رہ جاتیں۔ وہ مسکراتا اور سوچتا۔۔۔ خدا جانے وہ کیا سوچے گی؟'' باوجود اس خیال کے وہ خود کو روک نہ پاتا۔ اس روز بالخصوص اپنی مصروفیات کے درمیان انھیں دیکھنا کچھ زیادہ ہی بھلا لگ رہا تھا۔ مانا کہ ابھی اس نے عمر کی وہ سرحد پار نہیں کی تھی، جہاں اس کا جسم ان کی اہمیت سے واقف ہوتا۔ لیکن مسرت کا ایک سرچشمہ اسے اپنے اندر بیکراں محسوس ہوتا تھا گویا اوپر کی زمین تیار ہوگئی

تھی کہ برسوں سے اندر ہی اندر پریشاں چشمہ ایک تمازت سے پھوٹ پڑے اور ندی میں ضم ہونے کے لئے پتھروں، جھاڑیوں اور کنکروں کو عبور کرنے کا سفر شروع کرے۔ شاید یہی سبب تھا کہ ایک دفعہ اس کی نظر اس لڑکی پر پڑتے ہی اس کے قدم لڑکھڑائے اور لبالب بھرے کپ آپس میں ٹکرائے اور ''ٹرررررے'' کی آواز پھیلی۔۔ کسی نے کہا ارے کیا ہوا۔۔۔ تو اس نے فوراً خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔۔۔ ''چائے گرم ہے نا؟''

﴿۲﴾

شام دبے پاؤں آئی اور جھٹ سے کویلوں کی چھتوں پر لیٹ گئی جو موسم کی تبدیلیوں اور وقت کے بہاؤ کے ساتھ سیاہ پڑ گئے تھے۔ کوکن کی راتیں تنہا اور اداس عورت کے نوحے کی طرح ہوتی ہیں۔ تاریکی میں لوگ لالٹین اور ٹارچ لے کر نکلتے ہیں۔ عبدالعزیز کے گاؤ سورل میں بجلی کے کھمبے تو لگائے گئے ہیں مگر تاریں لگنے میں چند مہینوں کا وقت باقی تھا۔ آنگن میں گھانسلیٹ کے دیے جل رہے تھے۔

مغرب کی اذان کا وقت ہوا تو چند بوڑھے مسجد کی طرف چل پڑے۔ عبدالعزیز کے گھر سے قریب ہی ایک چھوٹی سی مسجد تھی، جو پچاس لوگوں کے لئے کافی تھی اور اتنے لوگ صرف جمعہ کی جماعت میں ہی مسجد میں اکٹھا ہوتے تھے۔ عام طور پر لوگ نماز کے پابند نہیں تھے۔ اب تو پھر بھی فجر کی نماز میں پانچ دس لوگ مسجد پہنچ جاتے ہیں، ورنہ دس پندرہ سال پہلے تو صرف امام اور موذن ہی نمازی تھے۔ بعض اوقات تو یہ دونوں بھی خوابوں کی بارگاہ سے نکلنے کی زحمت نہ کرتے۔

نماز بعد اجتماعی کھانا ہوا جس میں گاؤں کی جماعت کے اراکین نے کھانا بنایا۔ دال گوشت اور بیگن بٹاٹے کی سبزی کے ساتھ آم کا اچار اور ایک پاپڑ۔۔۔ ایک پلیٹ

میں گوشت کی دو بوٹیاں۔۔۔ سالن اور چاول پر کوئی پابندی نہ تھی۔ گھر کے اندر اور منگیلدار (پچھواڑے) میں عورتوں کے کھانے کا اہتمام تھا، جہاں گانو کے لڑکے ہی کھانا تقسیم کرتے رہے۔ کھانے کے بعد پھر چائے کا ایک دور چلا۔۔۔ چائے تقسیم کرنے کی ذمہ داری عبدالعزیز کی تھی۔ جب لوگ زیادہ ہوگئے تو اس کے ہم عمر دوست رفیق اور صابر اس کا ہاتھ بٹانے لگ گئے۔

بلآخر بعد عشاء دُلہے کو آنگن میں کرسی پر بٹھایا گیا اور مہندی کی رسم شروع ہوئی۔ دلہے کے ہاتھ پر خاندان کی لڑکیوں اور عورتوں نے مہندی لگائی۔ اس دوران گانو کی عورتوں نے خوب گیت گائے۔ عبدالعزیز ایک کونے میں کھڑے ہوکر ان گیتوں کو سن رہا تھا۔ اسے گیت سننا بے حد پسند تھا۔ کئی گیتوں کے مکھڑے اسے یاد بھی تھے۔ ہاں! اس رات اسے معلوم نہ تھا کہ ایک دن یہ سُن کر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑیں گے کہ ''گیت گانا حرام ہے۔''

وہاں گیت کی محفل شباب پر آئی اور یہاں اندر سے اس کی پڑوسن نے اسے بُلا بھیجا کہ چائے اور پان لے جاؤ اور گیت گانے والی عورتوں میں پہلے تقسیم کرو۔ وہ پھرتی اور چستی کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا اور اسی بہانے پڑوس کے گانو سے آئی ہوئی لڑکیوں کو قریب جاکر دیکھنا بھی۔۔۔ لیکن اسے حیرت اس سمئے ہوئی جب اس سے بڑی عمر کی لڑکیوں نے اسے بار بار بلاکر اس سے پان مانگا۔ ایک جو چوبیس پچیس سال کی تھی اس نے اس کو قریب بلا کر کہا: تُجا چوُ نیات، مجا موپ یتے۔۔'' [ترے چونے میں مزہ بہت آتا ہے۔]

اس نے پڑی (پڑی کوکن کے دسیع وعریض مکانوں میں کیچن کے طور پر استعمال ہونے والے کمرے کو کہتے ہیں۔ اکثر یہ گھر کے پچھواڑے کے دروازے سے لگ کر ہوتی ہے اور عام طور پر ایک طرف موری بھی ہوتی ہے۔ بعض علاقوں میں اسے پڑوی

بھی کہتے ہیں۔) سے چھلانگ لگائی اور منچا وٹے (درمیانی کمرے) میں رکھے ہوئے آئینے میں خود کو ایک نظر دیکھا۔۔۔وہ آگے نکل گیا مگر اس کا عکس وہیں آئینے میں رہ گیا۔ حیران!! کہ یہ لڑکا جوانی کی دہلیز پر کس قدر محوذات ہو گیا ہے کے مجھے بھی ساتھ لے جانا بھول گیا۔ اس سے پیشتر کہ وہ عکس آئینے میں تحلیل ہوتا، وہ پان تقسیم کر رہا تھا۔ ۔۔اور یہ دیکھ کر خوش تھا کہ بڑی عمر کی لڑکی کے چہرے پر چونا ملتے ہی کیسی مسکراہٹ ابھری تھی۔ لڑکیوں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا جس کی شیرینی اس کے کانوں میں پگھل گئی تھی اور دل کی دُنیا میں ایک اُجالا ہوا تھا اور اس اجالے کی روشنی میں وہ محفل کی عورتوں اور گیت گانے والی لڑکیوں میں پان تقسیم کر رہا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ لڑکیوں نے ایک دوسرے سے کیا کہا اور ایک دوسرے کو کہنیاں مار کر انہوں نے کس بات پر قہقہہ لگایا۔ وہ بس اتنا جانتا تھا کہ اس نے ان کا دل جیتا ہے۔ لڑکیوں کے دل میں اس کے لئے جگہ ہے۔ اس وقت اس نے اسکول کی خاکی رنگ کی ہاف پتلون پہن رکھی تھی اسے ایسا بھی لگا کہ اب شاید وہ اتنا چھوٹا نہیں ہے کہ بڑی لڑکیوں کے سامنے ہاف پتلون پہنے۔ کہیں وہ اس کی پتلون پر تو نہیں ہنسی تھیں۔۔۔ایسا کیوں ہوگا؟ وہ تو روزانہ اسی پتلون میں گانو بھر میں گھومتا ہے، مگر دوسری طرف جوں جوں وہ پان تقسیم کرتا، ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچا، اس کے دل نے اس سے کہا اب شاید اسے اپنی رانیں ڈھانکنا چاہیے کیوں کہ اب جب وہ کسی عورت کے پیر ٹخنوں تک بھی دیکھتا ہے تو عجیب طرح کی کیفیت اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ دیکھتا رہے۔۔۔دیکھتا رہے، اور اس قدر محو ہو کر دیکھتا رہے کہ ساری دنیا مٹ جائے اور تب بھی وہ دیکھتا رہے۔ اس پاگل پن پر اسے ہنسی تو آتی، مگر اس کیفیت کی لذّت سے جو نور اس کے ذہن میں پیدا ہوتا اس کے راز کو وہ پھر بھی نہ سمجھ پایا۔

وہ چاہتا تھا فوراً جا کر ماں کی پیٹی کھولے اور ازار نکال کر پہن لے پھر آ کر آرام

سے بیٹھ کر گیت سنے۔ اتنے میں آنگن کے گڑ گے (پتھر کی دیوار جو پرانے طرز کے مکانوں کے اطراف فصیل کا کام دیتی تھی۔ دیوار کا لفظ غلط فہمی پیدا کر سکتا ہے اس لئے یہ بتانا مناسب ہوگا کہ صرف پتھر ہیئت کی مناسبت سے ایک پر ایک رکھے ہوئے ہوتے۔ سمنٹ کا استعمال نہیں ہوتا تھا۔ البتہ بعض اوقات سہارے کے لئے گاڑھی مٹی استعمال بھی ہوتی۔) پر رکھی ہوئی گیس بتی مدھم پڑ گئی۔۔۔۔۔''ارے عبدالعزیز۔۔۔۔اس بتی کو اندر لے جا اور دوسری۔۔۔'' ایک آواز آئی۔

اس نے فوراً گیس بتی اٹھائی اور پڑی کی طرف چلا گیا جہاں رمضان گیس بتی والا دوسری بتیاں روشن کر رہا تھا۔ چوں کہ گاؤں میں ابھی بجلی آئی نہیں تھی اس لئے رمضان گیس بتی والے کی بڑی اہمیت تھی، اہم تقریبات پر وہ گیس بتی کرائے پر دیتا تھا اور اسی پر اس کا گزر بسر ہوتا تھا۔

﴿۳﴾

سورل پہاڑی پر بسا ہوا چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اطراف گھنا جنگل، جس میں کئی طرح کہ جانور اور پیڑ پودے ہیں جن کے نام اور فوائد سے یہاں کے لوگ واقف ہیں۔ یہاں کی ثقافت مجموعی ہندستان کی ثقافت سے ملتی جلتی ہونے کے باوجود اپنی جداگانہ پہچان رکھتی ہے۔ آبادی کم ہے اور زیادہ تر لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ عورتیں ساڑی پہنتی ہیں اور اس پر چولی، مرد پتلون کا استعمال خاص موقعوں پر کرتے ہیں، ورنہ لنگی پہنا کرتے ہیں۔ بوڑھے مرد دھوتی بھی پہنتے ہیں۔ دھوتی پہننے والے مسلمانوں کی یہ آخری نسل تھی۔ اس کے بعد چند ہی برسوں میں دھوتی کو (کافروں کے لباس سے مشابہت رکھنے کی بناء پر) مکروہ قرار دیا گیا۔

عبدالعزیز گیس بتی لے کر دوبارہ آنگن میں آیا۔ اس کے چچا کے دونوں ہاتھوں پر خوب مہندی لیپی جا چکی تھی۔ کونے میں خاموش کھڑا مہندی کا برہنہ پیڑ اب بھی جاگ

رہا تھا اور اس رسم کو دیکھ کر اپنا غم مندمل کر رہا تھا جو اس کی شاخوں سے پتوں کے توڑ لیے جانے سے اس کی جڑوں اور ڈنٹھلوں کو ہوا تھا۔ دوران گیت جب اس کی پتیوں کا ذکر ہوا تب اسے واقعی خوشی ہوئی۔ اس خوشی میں ایک شاخ نے جھوک کر چوئی موئی سے کہا۔ ''ہم لٹ کر بھی ضائع نہیں ہوتے۔۔۔'' چھوئی موئی سے کچھ کہا نہ گیا۔ وہ خود کو اور سکیڑ کر اپنے بھیتر سما گئی۔

عبدالعزیز کچھ دیر کے لئے دروازے سے لگ کر کھڑا رہا۔ جہاں منڈوے کا رنگ برنگی کاغذوں سے سجا ہوا کھمبا تھا۔ کوکن کی شادی میں مانڈوے کی اہمیت بہت ہے جسے باوٹوں ہنڈیوں اور پتانوں سے سجایا جاتا ہے۔ اس کے دائیں پیر کے پاس ہی شمع جل رہی تھی جس میں تازہ گھی ڈالا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ لوگ مانڈوے کے باہر بیڑی پینے نکل رہے تھے پھر دو دو تین تین وہیں سے ہاتھ ہلا کر، فانوس کی روشنی میں اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔

پگڈنڈی کے اطراف چاول کے سوکھے ہوئے کھیتوں کے قطعے ہیں جن کو چھوٹے پتھروں اور گاڑھی سرخ مٹی سے الگ کیا گیا ہے، ان میں بے شمار چوہوں کے بل بھی ہیں مگر کئی بلوں پر زہریلے سانپوں کا قبضہ ہے۔ آئے دن ناگ، گھوس، پھرساں، کھڑے ناگ، رات اور نہ معلوم کتنے ہرے، چاکلیٹی اور خوبصورت فیتوں والے سانپوں پر لوگوں کی نظر پڑتی ہے، اگر سانپ دور ہو۔ تو خاموش کھڑے رہ جاتے ہیں۔ مارتے نہیں ہیں۔ البتہ گھر کے کسی حصے یا آنگن میں گھس آئے تب اسے مارنے سے گریز نہیں کرتے۔ اس لئے فانوس کے بغیر رات میں یہاں گھر سے باہر نکلنے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ چند برسوں سے سیل پر چلنے والی ٹارچ بھی عام ہوگئی ہے مگر

پرانے وضع کے لوگ اب بھی ایک ہاتھ میں فانوس اور دوسرے ہاتھ میں لاٹھی لئے نظر آتے ہیں۔

اب دلہے کے گرد صرف عورتیں، لڑکیاں اور بچیاں بچی تھیں۔ گیت کی آوازیں مدھم پڑ گئی تھیں، بعض عورتیں گفتگو میں محو تھیں۔ دلہے کی آنکھوں میں نیند صاف نظر آ رہی تھی۔ گیت کا شور مدھم ہوا تو اطراف کے جنگل کا احساس گہرا ہوا۔ اطراف کے گھروں کے دیے بجھ گئے تو رات کی ویرانی بھی بولنے لگی۔ عبدالعزیز کو ان باتوں کا احساس نہ تھا اس کی نظریں ایک نوخیز لڑکی پر محیط تھیں جو اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی تھی اور پاندان سے سپاری کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لے کر چبا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں روشن اور بال لمبے تھے، سیدھی ناک اور گورے گال جن پر پھاپرے (کچے کاجو کا عرق جلد پر لگنے سے سیاہ نشان بن جاتے ہیں جو کئی دنوں تک رہتے ہیں۔ اس نشان کو پھانپراں یا پھاپرے کہتے ہیں۔) کے نشان پڑ گئے تھے۔ رات کے اس پہر اور گیس بتی کی بڑھتی گھٹتی روشنی میں وہ نشان۔۔۔۔ عبدالعزیز کے دل میں گداز اور کیف پیدا کرنے لگے تھے۔ وہ چاہتا تھا اسے دیکھتا رہے۔ کچھ نہ کہے اس سے کبھی نہ ملے، اس سے کبھی بات نہ کرے مگر ساری عمر وہ وہیں رہے، اسی طرح۔۔۔ اور وہ نشان اسے خوشی دیتا رہے جو خوشی اس پل وہ محسوس کر رہا تھا۔

اس کی نظر لڑکی کے چہرے پر پڑی اور وہیں ٹھہر گئی تھی اس کے دل میں جو سرور پیدا ہوا تھا اس کا تعلق چہرے سے ہی تھا بدن کی اہمیت سے ابھی وہ پوری طرح واقف بھی نہیں تھا۔ حالانکہ یہاں چند مہینوں سے بڑی عورتوں کے حسین جسم کو دیکھتے ہی وہ آنکھیں دوسری طرف کرنے لگ گیا تھا اسے کچھ ہو جاتا تھا جوں ہی اس کی نظر بھری بھری چولی کی اور اٹھتی تھی اس کی آنکھوں میں ارتعاش سا ہوتا تھا اور ایک مقناطیسی

طاقت اسے زیر کر دیتی تھی۔ ان لمحوں اس کا جی چاہتا کہ وہ دھودھیے پر جا کر لمبی چھلانگ لگائے اور زیر آب جا کر اپنے اندر محسوس تبدیلی کی الجھن کو سرد کرے۔ دھودھیا گاؤں کے شمال میں ایک چھوٹا سا آبشار تھا جو بارش کے موسم میں زیادہ رفتار سے بہتا۔ پھر ندی کی صورت میں بہتا جاتا تھا۔ جہاں آبشار گرتا تھا وہاں گہرائی تھی۔ تیراک سارا سارا دن اس میں تیرتے رہتے تھے۔ کوکن کے لڑکے محبت کرنے سے پہلے تیرنا سیکھ لیتے ہیں۔ آنکھوں میں ہونے والے ارتعاش کے بارے میں وہ سوچتا۔ ''مجھے ہی ایسا لگتا ہے یا سب کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ وہاں ایسا کیا ہے کہ میری آنکھیں بدن میں کبھی نا محسوس کیا گیا ذائقہ پھیلا دیتی ہیں اور میں لڑکھڑا جاتا ہوں۔ ایک بادل میرے ذہن پر سایہ پھیلا دیتا ہے اور۔۔اور میں خود میں کھو جاتا ہوں۔۔۔ مجھے جنگل میں موسلا دھار بارش میں بھیگنے جیسا مزہ آتا ہے، خاص کر جب گرم پانی کی ایک لکیر میری پتلون سے بہہ پڑتی ہے۔ شاید کسی اور کو میری یہ بات گندی لگے لیکن مجھے تو اس میں مزہ آتا ہے۔''

اس کے چہرے کا پھانپرے کا نشان عبدالعزیز کی آنکھوں میں پھیل گیا تھا اور اس نشے میں اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب اس کا ہاتھ کھمبے سے سرک کر شمعی کی لو سے جالگا وہ جھٹ سے چونکا اس کی ایک انگلی پر ہلکا سا جلنے کا نشان بن گیا تھا۔ اس کی زبان سے ''۔۔۔اوووو۔۔۔۔۔۔'' نکلا، چند عورتوں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرایا اور انگلی کو پشت پر چھپاتے ہوئے اس نے کہا۔۔۔۔۔ ''کچھ نہیں۔۔۔۔ موٹو کیڑو ہوتو۔۔۔'' (بڑا سا کوئی کیڑا تھا۔۔۔۔)

کوکن چونکہ جنگلوں سے اٹا ہوا ہے اس لئے شام ہوتے ہی روشنی کے گرد طرح طرح کے کیڑے مکوڑے رقص کرنے چلے آتے ہیں۔ بعض جھینگر سے بھی بڑے اور خوبصورت ہوتے ہیں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے کاٹنے سے گہرا سبز نشان جلد پر

بن جاتا ہے اور ارد گرد کا حصہ سوج جاتا ہے درد بھی شدید ہوتا ہے۔عموماً صبح دیے کے اطراف یہ بڑے اور خوبصورت کیڑے مرے پڑے ہوے ملتے ہیں جنھیں بچے شیشے کی بوتلوں میں بھر لیتے ہیں اور قیلولے کے وقت جب بڑے آرام کر رہے ہوتے ہیں بچے ان کیڑوں کو فخر سے ایک دوسرے کو بتاتے ہیں۔

عبدالعزیز دلہے کی طرف بڑھا اور اس کے پیروں کے پاس رکھی ہوئی پان کی تھالی اٹھالی، جو خالی ہو چکی تھی۔ اٹھتے وقت اس نے اس لڑکی کو قریب سے دیکھا وہ داغ واقعی گہرا تھا۔ وہ اٹھ کر گھر کے اندر گیا وہ داغ اس لڑکی کے گال سے اس کے دیدوں میں منتقل ہو گیا۔

۴

آخری گیت ختم ہوا اور پڑوس کی عورتیں اپنے بچوں کے ساتھ یا پڑوسیوں کے ساتھ اپنے گھروں کی طرف چل پڑیں۔ وہ مہمان جو دور سے آئے تھے گھر کے اندر چلے گئے۔اس کے والد نے پڑوسی کے مکان میں سبھی مہمانوں کے ٹھہرنے کا انتظام کر رکھا تھا۔چار پانچ ضعیف لوگ جو دوسرے گانو سے آئے ہوئے تھے وہ عبدالعزیز کے ساتھ ہو لیے۔عبدالعزیز نے کندھے پر تین چار گوجڑیاں رکھ لیں۔ (ہاتھوں کی سلی ہوئی گودڑیاں اہل کوکن اوڑھنے اور بچھانے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔کوکنی عورتیں انھیں سینے میں مہارت رکھتی ہیں۔ یہاں کی گوجڑیاں عمدہ ہوتی ہیں) پڑوس کے مکان کے وٹے دار (دالان) میں اس نے ان کے لئے گوجڑیاں بچھائی۔ بوڑھوں کی پلکوں پر نیند منجمد تھی وہ فوراً بستر پر لیٹ گئے۔،عبدالعزیز فانوس کی روشنی میں گھر کی طرف واپس ہو رہا تھا کہ منگیلدار کے باڑھے کے پاس چنواری (بانس کوٹی) کی بھول بھولیوں میں اسے سرسراہٹ محسوس ہوئی۔اس نے آنکھیں راستے پر مرکوز رکھیں اور کان آواز کی اور۔ ۔ ۔سرسراہٹ لمحے بھر میں خاموشی میں بدل گئی اور

فوراً بلی کی میاؤں میاؤں اس کے کانوں پر پڑی اس نے پھر بھی مڑ کر نہیں دیکھا۔ابھی وہ دس قدم آگے بڑھا تھا کہ پگڈنڈی سے متصل ہرلے (نالہ) میں فانوس کی روشنی پڑی اور ایک بھورے رنگ کا خرگوش چھلانگ لگا کر اندھرے میں دوسرے کھیت میں گھس گیا۔عبدالعزیز خاموش کھڑا رہا۔ وہ بچپن سے سنتا آیا تھا کہ اسی طرح گمراہ کر کے چڑیلیں بچوں کو بھگا لے جاتی ہیں۔اور پھر انھیں بے ہوش کر کے چنواریوں میں پھینک دیتی ہیں۔ان پر جادو بھی کرتی ہیں۔

اس کی نظر میں اس کا گھر تھا جہاں اب بھی آنگن میں چند لوگ بیٹھے تھے اور گیس بتی جل رہی تھی وہیں شمعی روشن تھی۔لوگوں کا عقیدہ تھا شمعی کی روشنی مقدس ہے۔اس کی لو جہاں تک نظر آتی ہے وہاں تک کسی بدروح کا سحر کام نہیں کرتا۔ وہ لمبے لمبے قدم بھرتا ہوا آنگن میں پہنچا۔فانوس کو اس نے دیوار کے پاس رکھا اور گھر میں داخل ہوا۔

پڑی میں اس کی ماں، کچھ رشتہ دار عورتیں اور وہ نوخیز لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ کسی موضوع پر بات چیت ہو رہی تھی۔ وہ بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ پہلے وہ اپنی خالہ زاد بہن صادقہ سے بات کرتا رہا اس کے ہاتھوں کی مہندی کی تعریف کرتا رہا۔نوخیز لڑکی آگے بڑھی اور اسے اپنے ہاتھوں کی مہندی بتانے لگی۔عبدالعزیز نے اس کے ہاتھوں پر نکالے گئے پھولوں کو دیکھتے ہوئے اس سے اس کا نام پوچھا۔

عبدالعزیز نے اس بار اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کیے بغیر یہ جان لیا تھا کہ اس کا نام شریفہ یونس پاؤسکر ہے، وہ چپلون سے آئی ہے۔ان کی عمر میں زیادہ فرق نہ تھا وہ ساتویں جماعت میں پڑھتی تھی۔

عبدالعزیز نے اسے بتایا ہمارے ڈرائینگ ماسٹر پاگل ہیں، ان کی داڑھی سفید ہے اور جب وہ ہمیں سزا دیتے ہیں تو ہمارے ہاتھوں کی انگلیوں میں پینسل پھنسا کر اتنا زور لگاتے ہیں کہ آنسو نکل آتے ہیں۔ اور ہمارے حساب کے سر کو ہم لوگ

''پوپٹ[طوطا]۔۔۔'' پکارتے ہیں۔ پرنسپل صاحب کو ''ڈیگ'' کہتے ہیں کیوں کہ ان کا پیٹ کسی دیگچی کی طرح باہر نکل آیا ہے۔ وہ بہت ہنستی رہی۔ عبدالعزیز بھی ہنستا رہا۔ وہ چاہتا تھا شریفہ رات بھر یوں ہی ہنستی رہے اور وہیں بیٹھا اسے اپنے استادوں کے پاگل پن کے قصّے سناتا رہے۔ اس دوران اس نے اس کے چہرے کی اور ایک بار بھی نہیں دیکھا۔ وہ جانتا تھا وہ چہرا کیسا ہے۔ اس کے گال پر وہ سیاہ چھاپرے کا نشان کیسا ہے اور اگر اس کی نگاہ اس پر پڑے گی تو وہ کہہ کچھ بھی نہ پائے گا۔ اسے کچھ ہو جائے گا اس کی سانس میں ایک ہلکا سا ارتعاش ہوگا اور اس کا نظام تنفس بگڑ جائے گا۔ وہ زیادہ تر اس کے ہاتھ پر کاڑے گئے پھول کو دیکھتا رہا اور اس سے باتیں کرتا رہا۔ وہ پھول بھی ویسا ہی تھا جیسے عام طور پر ادیواسیوں کی گوبر سے لیپی گئی گھاس پھوس کی دیواروں پر چونے سے کاڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان جنگلوں میں ادیواسیوں کی بہت ساری بستیاں ہیں جن کی تہذیب محفوظ ہے۔ یہ لوگ عام طور پر کھیتوں میں روزانہ کی اُجرت پر کام کرتے ہیں۔ ان کی عورتیں گھروں میں پانی بھرتی ہیں، کپڑے دھوتی ہیں اور بچوں کو سنبھالتی ہیں۔ مسلمان عورتوں کا رویہ ان کے ساتھ اچھا ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ چھوت چھات اس طرح برتی نہیں جاتی جس طرح سے ان کے ہم مذہب لوگ ان کے اپنے گاؤوں میں ان کے ساتھ کرتے ہیں۔ باوجود اس کے ایک فاصلہ ضرور درمیان میں رہتا ہے۔ سارے انسان مساوی تو ہیں مگر یکساں مساوی نہیں ہیں۔ یہ ان کی سوچ ہے۔

❦

صبح سب کو سورج کے ساتھ جاگنا تھا۔ (ویسے بھی یہاں سورج اپنی مرضی سے نہیں بلکہ مرغوں کی بانگ کے ساتھ طلوع ہوتا ہے۔ جنگل سے پرندوں کے جھنڈ اجتماعی راگ آلاپنے لگ جاتے ہیں۔ آنگن سے مویشیوں کا ترانہ اور ڈربوں سے مرغیوں کی

فریاد۔۔۔۔ایک عجیب سماں ہوتا ہے۔) اس لئے بالآخر عبدالعزیز کی ماں نے اسے ڈانٹنے والے لہجے میں کہا؛ ''چل بیٹا۔۔۔۔اب ہم لوگ یہاں سو رہے ہیں تو بھی مالے پر جا اور سو۔۔۔۔وہاں جگہ نہ ہو تو دادر وٹے میں سو جانا۔'' شریفہ کا ہاتھ اتنی دیر سے اس کے ہاتھ میں تھا اس بات کا احساس اسے اس وقت ہوا جب ماں کے ٹوکتے ہی وہ جھٹ سے کھڑا ہو گیا اور اس کی مہندی اچانک اس کی انگلیوں کی رگڑ سے بکھر گئی۔۔۔۔وہ لمحہ بھر کے لئے ششدر رہ گیا۔۔۔۔شریفہ کی آنکھوں میں مہندی کے نکل جانے سے زیادہ باتوں کے ختم ہونے کا افسوس تھا۔ جسے سننے میں اسے بہت مزہ آ رہا تھا۔عبدالعزیز کی نظریں اس بار شریفہ سے ملیں اور اسے ایسا لگا اسے جلدی سے بڑا ہو جانا چاہئے۔اس کے بازو میں طاقت اور چہرے پر مونچھ ہو اور وہ کبھی ہاف پتلون نہ پہنے۔اس کی شادی ہو اور اس کے ہاتھوں پر گانو کی ساری عورتیں مل کر مہندی لگائیں۔

اس کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری، شریفہ بھی مسکرائی۔دونوں نہیں جانتے تھے کہ اس مسکراہٹ کا مفہوم کیا ہے۔ وہ پڑی سے نکل کر منچاوٹن میں آیا۔ جہاں ایک کمرہ ہے۔ پاس ہی مالے پر جانے کے لئے لکڑی کی سیڑھی تھی۔ وہ آکر ٹھہر گیا، اسے ایسا لگا شریفہ کی مسکراہٹ اس کے تعاقب میں ہے۔ اس نے لمحہ بھر کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔پلکیں بند ہوئیں تو اس نے دیکھا وہ چہرہ اب چاند میں بدل گیا ہے۔ جس کی ٹھنڈک میں ایک ابدی سکون ہے۔ وہ آنگن میں آیا تو وہاں بچھائے گئے پالے اٹھا لیے گئے تھے۔ وہاں صرف شمعی جل رہی تھی۔ باہر اندھیرا اچھل گیا تھا۔اور حشرات کی نغمگی ہر سو بہہ رہی تھی۔ فضا میں جو گرم لہر تحلیل ہو گئی تھی وہ ختم ہوا چاہتی تھی۔

اس نے ماں کے کباٹ سے ایک پرانی گوجڑی نکالی اور مالے کی طرف بڑھا۔۔۔مالے کی سیڑھی کے پاس سکینہ لیٹی ہوئی تھی۔ابھی وہ جاگ رہی تھی۔سیڑھی کے پاس

چار عورتوں کے سونے کی جگہ تھی مگر وہ اکیلی یہاں سو رہی تھی۔ اس کی بغل میں اس کی پڑوسن کی بچی سو رہی تھی جس کی عمر چھ سال تھی۔ عبدالعزیز نے اسے سلام کیا۔ مالے کی سیڑھی پار کر کے وہ مالے پر پہنچا۔۔۔۔ ایک کونے میں ایک بتی جل رہی تھی اور دس پندرہ محلے کی عورتیں پہلے ہی وہاں پیر پھیلا چکی تھیں۔ عبدالعزیز واپس مڑ گیا۔ ابھی وہ اترا ہی تھا کہ سکینہ نے اس سے پوچھا؛ ''کیا ہوا تم واپس آ گئے!''

''آپا!! اوپر عورتیں پہلے سے سوئی ہوئی ہیں۔'' اس نے کہا۔

سکینہ کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔ اس نے کہا؛ ''ارے عزیز! ادھر بہت جگہ ہے۔ تو یہاں سو سکتا ہے۔'' اتنا کہتے ہوئے وہ ذرا سرک گئی اور پاس لیٹی بچی کو سیدھا کیا، جو گہری نیند میں تھی۔ چوں کہ بہت جگہ تھی اس لیے عبدالعزیز نے اپنی گوجڑی اس چٹائی پر بچھا دی جس پر سکینہ کی گوجڑی تھی۔ دیوار کے ''بولے'' میں ایک چھوٹا سا چراغ جل رہا تھا۔ اس کے اوپر دیوار میں ایک روزن تھا جس سے دن میں روشنی اس کمرے میں آتی تھی۔ آج اسی روزن سے چاند کی مدھم شعاع کمرے میں آ رہی تھی۔ ابھی عبدالعزیز لیٹا ہی تھا کہ سکینہ نے اس سے کہا۔ ''باہر سے چاند کی روشنی کمرے میں آ رہی ہے بتی بجھا دو۔'' اس نے سکینہ کے فرمان کے مطابق بتی بجھا دی اور بستر پر لیٹ گیا۔

۵

سکینہ کی عمر قریب ستائیس سال ہوگی۔ (اس کے والد سلیمان عمر نوسورل سے دو کلو میٹر دور واقع گانو شیرل کے سرپنچ تھے۔) بڑے گھر کی لڑکی تھی اور جس گھر میں بیاہی گئی تھی وہ بھی ایک متوسط گھرانہ تھا۔ پرکھوں کی بہت زمین تھی۔ اس کے شوہر مجاور حسین شریف آدمی تھے۔ چند برسوں سے گانو کی جماعت کے اہم رکن تھے۔ شادی کو چھ سال ہو گئے تھے مگر سکینہ کی گود اب تک بھری نہ تھی۔ انھیں اس بات کی زیادہ فکر بھی نہ

تھی۔ان کا یقین اپنے رب پر بہت تھا۔وہ گاؤں کے ایسے چند لوگوں میں سے تھے جو نمازی تھے اور دوسروں کی مدد بھی کیا کرتے تھے۔بمبئی ان کا آنا جانا بہت ہوتا تھا اور وہیں انھیں ایک مسجد میں نماز کے بعد اس بات کا علم ہوا تھا کہ ایک جماعت ہے جو مسجدوں میں بعد نماز اجتماع کا اہتمام کرتی ہے اور مذہب کی بنیادی باتوں کو عوام الناس تک پہنچانے کی کوشش کرتی ہے۔انھیں یہ بات بے حد بھلی لگی تھی پھر انہوں نے ایک مرتبہ تین دن جماعت میں گزارے۔ان کا تاثر عقیدت میں بدل گیا۔۔۔ انھیں علم ہوا کہ تبلیغ جماعت سارے ملک میں متحرک ہے اور مسلمانوں کے عقاید کی اصلاح کرتی ہے۔اسی قیام میں انھیں دین کی بہت ساری معلومات ہوئی۔اپنی غفلت کا اندازہ ہوا تو ان کی آنکھ بھر آئی۔ان کا دل اس درد سے بھی بھر گیا کہ ''میرے گاؤں کے لوگ دین سے کس قدر دور ہیں اور اگر یہ بات مجھ تک پہنچی ہے تو میرا پہلا فرض ہے کہ میں اپنے لوگوں کی آنکھوں سے جاہلیت کا پردہ ہٹاؤں اور انھیں دین حق کے قریب لے آؤں۔۔،ورنہ اپنے رب کو کیا منہ دکھاؤں گا۔'' یہ جذبہ روز بہ روز ان کے دل میں پروان چڑھتا گیا۔تبلیغ جماعت کی تعلیمات اور اسلامی تحریک کو وہی گاؤں لے آئے تھے۔اس کام کے لیے انہوں نے شہر کی اسی مسجد کے امام کی مدد لی، جنہوں نے دس دن کے لیے ایک جماعت کو گاؤں بھیجا۔مجاور حسین نے ان کے رہنے کا انتظام اپنے مکان کے خالی کمرے میں کیا۔ جمعہ کی نماز کے بعد گاؤں کی مسجد میں امیر جماعت کی ایک تقریر ہوئی۔۔۔مگر اس وقت لوگ پوری طرح سے اس بات کے لیے سنجیدہ نہ تھے یہ سلسلہ بہت ہی سست رہا مگر آنے والے برسوں میں اس کی برکت سے ہی معاشرے کا احیاء قدامت پرستی کی جانب ہونے والا تھا۔

سکینہ بھی نماز پڑھنے لگی۔مغرب کی نماز کے بعد مجاور حسین خود تبلیغی نصاب پڑھ کر

سناتے تھے۔ اس وقت بہت کم لوگ تھے جنہیں اردو ٹھیک سے پڑھنے آتی تھی۔ البتہ مراٹھی زبان پر لوگوں کو عبور حاصل تھا۔ بلکہ وہ لوگ بھی جو ضلع پریشد کی اسکول سے ساتویں جماعت تک کی تعلیم اردو میں حاصل کر چکے تھے خط و کتابت کے لئے مراٹھی کو ترجیح دیتے تھے۔ اردو کا اس علاقے کی لسانی ترجیحات کے ساتھ میل نہ تھا۔ اردو اس علاقے کے لوگوں کی مادری زبان نہ بن پائی ہے اور نہ ہی مراٹھی کے مزاج کو کم کر پائی ہے۔ اردو ایک تھوپی ہوئی زبان لگتی ہے جسے ذہنی طور پر مفلوج و محکوم لوگوں نے مذہبی جذباتیت کے سبب قبول کیا ہے۔ سکینہ کو اردو سننے سے ہی چڑ تھی۔ اسے ہنسی آتی تھی۔ لیکن مجاور حسین کا دل بہت نرم تھا وہ سکینہ کو ڈانٹتے نہ تھے بلکہ کوئی میں وضاحت کرتے اور سمجھاتے۔ وہ جانتے تھے مقصود تو معنی ہے زبان تو ذریعہ ہے۔ انہوں نے اردو میں کئی کتابیں پڑھی تھیں۔ ایک شاعری کا انتخاب بھی پڑھا تھا جس میں انہیں وہ سارے اشعار اچھے لگے تھے جن کے نیچے شاعر کے تخلص کے طور پر ''نا معلوم'' لکھا ہوا تھا۔ مجاور حسین کا گمان تھا 'نا معلوم' اردو کے بہت ہی مشہور شاعر ہوں گے کیونکہ اس انتخاب میں سب سے زیادہ اشعار انہی کے تھے۔ وہ اردو کی شیرینی کے قائل تھے اور کوشش کرتے تھے، ٹھہر ٹھہر کر صاف اردو لہجے میں بات کریں۔ جب کبھی سکینہ ان کی اردو کا مذاق اڑاتی وہ مسکراتے اور دل میں کہتے۔ ''۔گدھا کیا جانے زعفران کی قدر۔۔۔۔''

سکینہ اپنے والدین کی اکلوتی لڑکی تھی اور ٹھاٹ باٹ کی زندگی کی عادی تھی۔ ساتویں جماعت تک مراٹھی میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد گانو کی ایک عورت سے اس نے قرآن پڑھنا بھی سیکھ لیا تھا۔ وہ ہر جماعت میں اول نمبر سے کامیاب ہوئی تھی، اس سال بھی جب ملیریا کی وجہ سے اس کے دو پرچے رہ گئے تھے۔ اسکول ماسٹر نے بعد میں اس کا امتحان الگ سے لیا۔ بعض افراد کا ماننا ہے کہ وہ پرچے ہیڈ ماسٹر نے خود ہی لکھے تھے۔ اسی اسکول کے ایک معلم کا دعوی ہے کہ سکینہ کے تمام پرچے سابق

ہیڈ ماسٹر ہی لکھا کرتے تھے۔ اور اس کے عوض سکینہ کے والد نے انھیں دو آم کے پیڑ تحفے کے طور پر دیئے تھے۔ وہ چاہتے تھے ان کی بیٹی ہمیشہ سب سے آگے رہے۔

سکینہ کے والد اس کی تعلیم کا سلسلہ برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن سکینڈری اسکول دس بارہ کلومیٹر دور تھا اور اپنی نورِ نظر کو وہ روزانہ اتنی تکلیف دینا نہیں چاہتے تھے۔ پھر شاید ان کے دل میں یہ بھی ڈر تھا کہ ''اتنی دور جا کر اگر وہ اوّل نمبر سے پاس نہ ہوئی تو لوگ کیا سوچیں گے؟''

''لوگ کیا سوچیں گے۔ ۔ ۔'' اس بات کا ڈر یہاں مردوں کو بہت رہتا ہے مگر عورتیں اس خیال سے خود کو آزاد محسوس کرتی ہیں۔ سکینہ ایسی ہی آزاد طبیعت لڑکی تھی۔ سکینہ گھر کے ملازم فخر الدین ڈانگے کو بہت پسند کرتی تھی۔ ڈانگے چودہ سال کا تھا جب سکینہ پیدا ہوئی تھی۔ وہ اسے اٹھائے کندھوں پر سارے گانو میں گھوما کرتا۔ سکینہ کو نہلاتا، اس کے کپڑے بدلتا۔ پاؤڈر لگاتا اور پھر گوجڑلے پر اسے سلاتا اور گرمی کے دنوں میں اسے پنکھا دیتا۔ اسے اسکول لے جانے اور لانے کی ذمہ داری اسی کی تھی اور جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی فخر الدین سے اس کا لگاؤ بھی بڑھتا گیا۔

جب فخر الدین کی شادی ہوئی اس وقت وہ آٹھ سال کی ہو چکی تھی۔ اس کی بیوی کو عجیب نظروں سے اس نے دیکھا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی فخر الدین کسی اور کے ساتھ وقت گزارے۔ شادی کے بعد ہفتے بھر فخر الدین چھٹی پر رہا تو وہ مضطرب ہو گئی۔ والد سے ضد کرنے لگی کہ فخر الدین کے گھر چلیں۔ بالآخر والد کے ساتھ فخر الدین کے گھر پہنچی اور اس کے سامنے روٹھ کر بیٹھ گئی۔ فخر الدین نے اسے بہت منایا تب اس نے اپنی جیب سے ایک شیشے کی بوتل نکالی۔ بوتل میں ایک بہت ہی خوبصورت تتلی تھی، سرمئی سرخ اور جامنی رنگ کے امتزاج کا حسین نمونہ...... ''مردہ تتلی'' ...... فخر الدین نے حیرت سے دیکھا اور کہا۔ ''یہ کیا

......بیٹا تم نے تو اس ننھی جان کو مار دیا۔

''یہ آپ کے لیے ہے۔''

''مردہ تتلی......''

''ہاں......اس میں میرا پیغام ہے۔''

''کیا ہے'' سکینہ کے والد نے حیرت سے پوچھا۔

''اگر فخرو چچا کل سے کام پر نہیں آئیں گے تو......''

''تو کیا؟'' فخر الدین نے سوال کیا۔

''میں بھی اس تتلی کی طرح مردہ ہو جاؤں گی......''

فخر الدین نے سکینہ کے والد کی نظروں میں جھانکا اور کہا......''میری بیٹی گندی باتیں نہیں سوچتے......''

''پھر اتنے دن سے آپ آئے کیوں نہیں؟''

''ارے بیٹا میری شادی ہوئی ہے نا۔! کچھ رشتے داروں کے یہاں دعوت تھی۔ہاں......کل سے میں آرہا ہوں۔تو بے فکر ہو جا۔''

وہ مسکرائی اور اپنے والد کی جانب دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔''بابا شادی کرنے کے بعد رشتے دار دعوت دیتے ہیں۔؟''

سکینہ کے والد نے قہقہہ لگایا اور کہا۔''ہاں بیٹا......سب کو ملتی ہے۔جب تیری ہو گی تو تجھے بھی ملے گی......خوش!!''

''ٹھیک ہے......کل سے آنا ہاں......''

پھر یہاں وہاں کی باتیں ہوئیں۔فخر الدین ڈانگے کوئی غیر نہ تھا۔قریبی گانو کا ہی رہنے والا تھا۔غریب گھر کا انتہائی محنتی اور ایمان دار لڑکا تھا۔اس کے دل میں سکینہ کے

لیے اب ایسی ہی شفقت تھی جیسی اپنی بیٹی سے ہوتی ہے۔

﴿٦﴾

سکینہ جب سولہویں سال کی دہلیز پر پہنچی تو اس کے دل میں عجیب سی بے قراری ہوا کرنے لگی۔ سکینہ کی حویلی کے اطراف بہت بڑا کمپاؤنڈ تھا۔ گھر میں یکسوئی رہتی تھی اور اکیلا پن اسے سینے پر رکھے ہوئے بھاری پتھر کی طرح جان پڑتا۔ کمپاؤنڈ میں آم کے کئی پیڑ تھے۔ اطراف کی زمین میں چاول کی فصل بھی ہوتی تھی۔ تین باڑھے تھے جن میں گائے، بکریاں اور جلانے والی لکڑیاں رکھی جاتی تھیں۔ مکان کے پچھواڑے بیگن، بھنڈی اور توسے (ککڑیوں کی ایک قسم ہے یہ عام ککڑیوں سے بڑی ہوتی ہیں) اگائے جاتے تھے۔

سکینہ کی ماں کی کمر میں اکثر درد رہتا تھا اس لیے وہ بستر سے کم اٹھا کرتی۔ زیادہ باتیں بھی نہیں کرتی تھی۔ بالآخر سکینہ فخر الدین کے پاس جاکر اس کے کام میں اس کا ہاتھ بٹاتی اور اس سے باتیں کیا کرتی۔ وہ سارے گانو اور آس پاس کے گانوؤں کی خبریں اسے سناتا رہتا۔ رات ریڈیو پر سنی گئی خبریں اسے سناتا۔ دلّی، کلکتہ، بمبئی، حیدرآباد میں کیا ہوا۔۔۔ کہاں زلزلہ آیا، کہاں پلیگ پھیلا، کہاں طوفان نے تباہی مچائی، کس لیڈر کا قتل ہوا، حکومت نے غریبوں کے لیے کیا کیا اعلانات کئے۔۔۔ ساری کی ساری باتیں وہ سکینہ کو سناتا رہتا۔۔۔ اور سکینہ اس سے پوچھتی یہ سب مقامات کہاں ہیں۔۔۔ وہاں کے لوگ کیسے ہیں۔۔۔ کیا سب جگہ ایک جیسے انسان ہیں یا ان کی شکلیں الگ ہیں۔ فخر الدین بہت ہنستا۔ سکینہ کی باتوں میں معصومیت کی ایک روشنی تھی جس میں فخر الدین کی زندگی اسے زیادہ قابل برداشت لگنے لگی تھی......

یہاں کچھ مہینوں سے سکینہ کے دل کی بے قراری میں ایک طرح کی شدت آ گئی تھی۔ اس کے بدن کی تبدیلیوں نے اس کے اندر ایک عجیب طرح کی عدم تشفی بھردی

تھی۔ اسے ایسا لگتا اس کے اندر کوئی شئے راستا ڈھونڈتی ہے۔ اس کے اندر تتلیوں کے رنگ ہیں جو باہر آنا چاہتے ہیں۔ وہ زمین ہے جس کی اندرونی ندیوں میں طوفان اُٹھتے ہیں۔ زلزلے اس کی رگوں میں آتشی سیال پھیلا دیتے ہیں۔ من کا سونا پن ایک پلیگ ہے جو اس کی تارنفس کی میں تشنج اور کھینچاؤ پیدا کرتا۔ وہ تکیے کو اپنی بانہوں میں بھینچ کر آنکھیں موند لیتی، تو تکیہ اَن دیکھے سایوں میں بدل جاتا۔ وہ گوجڑی آنکھوں پر اُوڑھ کر اندھیرے میں نیند تلاش کرتی ہے تو سائے رنگین دائروں میں بدل جاتے اور اس کے گرد رقص کرنے لگ جاتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ رنگین سایہ دار دائرے برسات کی راتوں میں بستروں میں گھس آنے والے خوبصورت کیڑوں کی طرح اس کے جسم پر رینگنے لگ جاتے۔ اس کی بند آنکھوں پر دستک دیتے۔ جب وہ آنکھیں کھولتی تو گوجڑی کے اندر کا اندھیرا ایک رنگین شبستان کی طرح جگمگاتا۔ وہ خود سے پوچھتی۔
''وہ رنگ کب نظر آئے گا جو راستہ ڈھونڈ رہا ہے۔''

سکینہ بدن کی ان تبدیلیوں کو ابھی پوری طرح سمجھ نہ پائی تھی۔ اسے ایسا لگتا تھا وہ بیمار ہے، اس کی دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ جب کبھی کوئی اخبار یا مراٹھی رسالے میں خوب رؤ نوجوان کی تصویریں دیکھتی تو قینچی سے کتر کر پیٹی میں محفوظ کر لیتی اور جب گھر میں کوئی نہ ہوتا تو نکال کر ان کے خدوخال دیکھتی رہتی۔ اس طرح اس کی پیٹی میں کل اٹھارہ تصویریں جمع ہو گئی تھیں جن میں چار فٹ بال کھلاڑی، دو کرکٹ کھلاڑی، تین ہندی فلموں کے اداکار، دو اسمگلر، ایک ڈاکٹر، اور ایک باڈی بلڈر بطور خاص تھے۔ وہ سب کو ایک لائن میں قرینے سے رکھتی اور اوندھے منہ لیٹ کر حسرت و یاس سے انھیں دیکھا کرتی وہ سب بھی اس سے باتیں کیا کرتے تھے۔ سب اس کے ہونٹوں کو کوکم (ایک رس دار پھل جو ٹماٹر کی طرح نظر آتا ہے۔ بہت کھٹا ہوتا ہے، اہل کوکن اسے سوکھا کر اس کا استعمال سالن میں کھٹاس کے لیے کرتے ہیں۔) اور بالوں کو

کالے کالے ریشمی دھاگوں سے تشبیہہ دیتے۔ اس کے پاس ایک بہت خوبصورت گڑیا ہوا کرتی تھی جس کے کالے کالے بال بے حد خوبصورت تھے۔ گانو کی کسی لڑکی کے پاس اتنے چمک دار بالوں والی گڑیا نہ تھی بلکہ فخرالدین نے تو اس سے ایک بار یہ بھی کہا تھا: ''یہ گڑیا دنیا کی سب سے خوبصورت گڑیا ہے۔'' وہ اس سے کہتے کہ وہ اس گڑیا سے بھی خوبصورت ہے۔

وہ ان کی تعریف سے خوش ہوتی اور مسکراتی پھر انھیں اپنے والد کے جنگلوں، کھیتوں اور آم کے باغات کے بارے میں بتاتی۔ وہ انھیں اس کے مکان کے عقب سے بہنے والی ندی کے بارے میں بتاتی۔ وہ اس سے وعدہ کرنے لگے تھے کے جلدی ہی وہ اس سے ملنے آئیں گے۔ حالانکہ ابھی اس دور دراز گانو میں سڑکیں سرُخ مٹی کا پلندہ تھیں۔ اور پہاڑی ڈھلوانوں کے موڑ بہت ہی خطرناک تھے، بمبئی سے صرف چوبیس گھنٹے میں ایک ایس۔ ٹی آتی تھی۔ بہت کم لوگوں کے پاس ریڈیو تھے۔ بجلی کے صرف کھمبے بچے تھے جن پر کوّوں نے اپنے گھر بنا لیے تھے بعض جنگلی بیلوں نے انھیں یوں لپیٹ لیا تھا کہ دور سے دیکھنے پر لگتا کوئی پیڑ ہے۔ وہ لوگ جو بمبئی ہو آئے تھے صرف انھیں علم تھا: ایک ڈبہ ہے جس میں انسانوں کی تصویریں بولتی ہیں اور رقص بھی کرتی ہیں جسے ٹیلی ویژن کہتے ہیں۔۔۔ جب وہ یہ بات گانو کے بوڑھوں کو بتاتے تو وہ ہنستے رہتے۔۔۔ انھیں ایسا لگتا ان کو بدھو سمجھ کر ان کے ساتھ شرارت کی جا رہی ہے۔ ایسے بوڑھے بھی کھل کھلا کر ہنستے جن کے دانتوں نے مدّت ہوئی ان سے بے وفائی کی تھی۔۔۔

شاید ناہموار راستوں کے سبب وہ اس کے گھر پہنچنے سے قاصر تھے مگر خوابوں کی شاہراہ تو کھلی تھی۔ اس کے دیدار کے لیے اس کے خوابوں میں جھانکنے لگے۔ لمبی تاریک راتوں میں فانوس کی لو گل ہوتی اور اس کا کمرہ طلسمی نور سے بھر جاتا۔ تب ہاتھوں میں

مور کے پنکھ، چمپا کے گجرے، گلاب کی کلیاں، کاجو کی بنی ہوئی چکیاں یا ململ کے کپڑے لیے ان میں سے کوئی نہ کوئی اس سے ملاقات کے لیے آجاتا۔ وہ خوشی سے سورج مکھی بن جاتی اور اس کے گرد گردش کرنے لگ جاتی وہ اس کے نرم و نازک ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیتا اور اس سے باتیں کرتا رہتا۔۔۔اس کی ملائم انگلیاں چاندی کے روشن رنگ میں بدل جاتیں اور وہ سورج مکھی سے چھوئی موئی میں۔۔۔کہیں اس کی روح میں ایک محور تھا جس میں چھوئی موئی کی حیا سمٹ کر خوشبو میں تبدیل ہو جاتی اور مُشک کی ایک لہر اسے اپنے اطراف پھیلتی ہوئی محسوس ہوتی۔۔۔۔۔وہ صدیوں تک اس مہک کے راز کا تعاقب کرتی مگر سوائے حیرانی کے اس کے ہاتھ کچھ نہ لگتا۔ ایسی شب ایک ہزار صدیوں سے طویل ہوتی اور اس نا قابل پیمائش رات میں بھی وہ اپنی ذات کی انتہا کو چھو نہ پاتی۔ صبح جب ماں یا والد اسے نیند سے بیدار کرتے تو اس کی آنکھوں کے غلاف میں اٹکے ہوئے گلابی پیلے اور نیلے رنگ آہستگی سے تحلیل ہو جاتے۔ وہ آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہوتی اور اپنے چہرے کو آئینے میں ٹٹول کر دیکھتی اسے آئینے میں وہ لمس نظر آتے جو رات کے خواب میں اسے تحفے میں ملتے۔

وہ نہانے کے بعد جب آنگن میں کھڑے رہ کر اپنے بال جھٹکتی تب اسے یوں لگتا اب بھی اس کی زلفوں میں چمپا کے گجرے یا گلاب کی تازہ کلیوں کی خوشبو ہے۔ ان خوابوں نے بعض اوقات اسے لذّت کے ایسے بادلوں کی بھی سیر کرائی تھی جس کے سبب اس نے اپنے بدن کے احساس اور حدّت سے لطف اٹھایا تھا۔ ان خوابوں نے اس پر ایک راز منکشف کیا۔۔۔کہ وہ تنہا ہے۔

وہ اپنی ماں کے ساتھ سورل کسی رشتے دار کی شادی میں گئی تھی اور وہاں مجاور حسین کی والدہ کی نظر اس پر پڑی تھی۔ مذاق مذاق میں بات آگے بڑی اور جھٹ منگنی پٹ بیاہ کے لیے دونوں گھرانے راضی ہو گئے۔

عبدالعزیز بستر پر دراز ہوا۔ کمرے میں گہرا اندھیرا تھا۔ اوراس کی آنکھوں میں شریفہ کی مسکراہٹ۔ نیند کے بادل اس کے دیدوں میں سرایت کرنے کے لیے بار بار دستک دے رہے۔ دوسری طرف شریفہ کے چہرے کے تمام خطوط کو ذہن میں اُجاگر کرنے کے لیے وہ ایک کشمکش سے گزر رہا تھا۔ یوں نہ تھا کہ ایسا پہلی باراس کے ساتھ ہوا تھا۔ یہاں کئی مہینوں اس کے دل کے تار بڑے مقناطیسی ہو گئے تھے۔ جب کوئی خوبصورت لڑکی یا نوجوان عورت اس کے قریب سے گزرتی اسے کرنٹ سا لگ جاتا۔ وہ خاموش ہو جاتا اوراس کے بدن میں ہزار رنگ ایک دوسرے میں مدغم ہوتے۔ بہت پُرسکون اور پرفریب موسیقی کا ایک ٹکڑا اس کی بائیں پسلی سے بہہ کراس کے ناف میں آ کر ڈوب جاتا۔ اس کا ذہن ایک پر کیف جھیل میں بدل جاتا جسے کہرا کی تہوں نے گھیر رکھا ہو...... اس پوری کیفیت میں ایک راگ تھا، ایک نشہ تھا۔ یہ نشہ ہمیشہ اسے اردگرد کے شور سے بے بہرہ کر دیتا۔

ان دنوں اکثر اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ خود کو اپنی نگاہ سے دیکھے۔ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ اس نے خود کو ایک کمرے میں بند کر لیا اور الماری کے شیشے میں اپنے آپ کو بہ غور دیکھا کیا۔ اب اس کی پنڈلیوں میں گولائی، بازوں میں مچھلیاں نکلنے لگی تھیں۔ اس کی چھاتی پر ہلکے ہلکے بال پھیلنے لگے تھے۔ اس کا چہرہ بدل رہا تھا۔ آواز میں خراش پیدا ہوئی تھی، یہ خراش کبھی کبھی بھاری مردانہ آواز میں بدل جاتی۔ وہ چاہتا تھا اس کی آواز میں تحکمانہ رنگ نظر آئے۔ جس طرح اس کے والد کی آواز میں تھا۔ اس کے ہونٹ پتلے، نرم اور شربتی رنگ کے تھے۔ ان کے اوپر بالوں کی ریشمی پرت صاف دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ چاہتا تھا یہ ریشم جھٹ سے مونچھوں میں بدل جائے۔

وہ جب کبھی خود کو دیکھتا۔ دیکھتا ہی رہ جاتا۔ خود کو آپ مختلف زاویوں سے دیکھتا۔ خوش ہوتا۔ وہ روشنی کی شعاعوں میں خود کو دیکھتا۔ دیے کی طلسمی روشنی میں دیکھتا۔ نیم اندھیرے میں دیکھتا۔ وہ اپنے بدن کو چھوتا۔ اس کا اپنا لمس اس کے رگ وپے میں پھیلے مقناطیسی تاروں کو برقی رووٴں سے بھر دیتا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکا اندھیرا چھا جاتا۔ کمرے میں اجالا پھیل جاتا۔ اس کا عکس آئینے میں لہراتا اور ایک موج آئینے کی سطح سے بہتے بہتے ابتدائی زمانے تک چلی جاتی۔ وہ زمانہ جب انسان اپنے بدن کے اسرار سے پہلی بار واقف ہوا تھا۔

﴿۲﴾

رات بہت آہستہ صبح کی طرف سفر کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شریفہ کے چہرے کے نقوش مدھم پڑنے لگے اور نیند کا نشہ پلکوں کو بھاری کرنے لگا تھا۔ اس نے کروٹ بدلی تو دیکھا۔۔۔ سکینہ کی نظریں اس کی جانب مرکوز تھیں۔ اس کی زبان سے کوئی حرف ادا نہ ہوا۔ وہ ان آنکھوں کو دیکھتا رہا۔ رات کے اس پہر ہوا میں کچھ ٹھنڈ بڑھ گئی تھی اور باہر شاید سبھی سو گئے تھے۔ ساری آوازیں ڈوب گئی تھیں۔ اس ایکانت میں اسے اپنے دل کی دھڑکن گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح سنائی دے رہی تھی۔

"ٹھنڈ لگ رہی ہے کیا؟"

اس نے اقرار میں پلکیں جھپکائیں۔

سکینہ نے انتہائی آہستگی سے اپنی گوجڑی کو اوپر کھینچا اور اس کا سر اعبدالعزیز کے پیروں پر سرکا دیا۔ پھر پیار سے اس کے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اسے بہت اچھا لگا، یوں اس کی خالہ اس کے گالوں کو چھو کر اس کا بوسہ لیا کرتی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور چند ہی لمحوں میں نیند کی پریوں نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹنا شروع کر دیا۔ اس کے دیدوں میں نیند کا خمار پھیلنے لگا۔ پھر وہ خوابوں کی سیر گاہ میں تھا۔ وہ اس دنیا میں نہ

تھا جس دنیا میں خواب نہیں ہوتے ہیں۔

خدا ہی جانے رات کی رفتار کتنی تھی اور اندھیرا کتنا گہرا تھا۔

اس کے معصوم چہرے پر ایک کشش تھی اور یہی سکینہ کو مجبور کیے تھی۔ وہ اس کے چہرے کے ایک ایک خط کو بہت قریب سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی سیدھی ناک اور کشادہ پیشانی میں مردانہ وجاہت کے جوہر تھے۔ اس کی ناک اور ہونٹ کے درمیان کا حصّہ سکینہ کے دل کو چھو رہا تھا۔ اوپری ہونٹ کمان کی صورت ابھرا ہوا اور واضح تھا۔ اس کی جلد گندمی چمک دار تھی۔ بال سیاہ ریشمی تھے۔

سکینہ اس کو دیکھ رہی تھی اور وہ صرف اس کو نہیں دیکھ رہی تھی اس کے چہرے میں سکینہ کو کئی چہرے نظر آ رہے تھے۔ وہ کوئی دیو مالائی آئینہ تھا جس میں اس کے من میں محفوظ چہرے ایک ایک کر کے اُجاگر ہو رہے تھے اور ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے، ایک کولاج خلق کر رہے تھے۔ سکینہ اس کولاج کو بہت قریب سے دیکھنا چاہتی تھی۔ اس لیے وہ اس کی جانب سرک گئی۔ اب اس کی نیم گرم سانس کی آنچ کو وہ محسوس کر سکتی تھی۔ اس کی پلکیں لمبی تھیں اور پیشانی پر ایک ہلکا سا نشان تھا۔ شاید یہ کسی زخم کا نشان تھا۔ سکینہ اس نشان کو لمحوں دیکھتی رہی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ ایسا ہی ایک نشان اس کے دل پر بھی ہے،۔ جسے کوئی نہیں جانتا۔ جسے مجاور حسین نے کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اور وہ اپنی زبان سے اس کا تذکرہ کرنے کے خلاف بھی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ نشان اسے ہی نظر آتا ہے جس کے دل میں آپ کے لئے محبت ہو۔

﴿۳﴾

محبت تو وہ پہلی رات سے ہی مجاور حسین سے کرنے لگی تھی۔۔۔ اس کے باوجود کبھی کبھار مجاور حسین کے چہرے پر دوسرے چہرے کی شباہت اسے نظر آتی۔ خاص کر وہ چہرے جنھیں اس نے رسالوں اور اخباروں سے کاٹ کر اپنی پیٹی میں محفوظ کر رکھا تھا۔

وہ پیٹی تو اس کے والدین کے گھر ہی رہی مگر وہ چہرے اب اس کے دل دماغ میں اس طرح گہرا گئے ہیں جیسے پتھر پر کوئی نقش۔

محبت کا شجر جو اس نے پہلی رات کو لگایا تھا اب رفتہ رفتہ سوکھنے لگ گیا تھا۔ عورت مرد کی زمین ہے اور اگر مرد اسے جوت کر زرخیزی عطا نہ کرے۔ اسے سرسبز لہراتے کھیت میں نہ تبدیل کرے تو وہ بنجر صحرا میں بدل جاتی ہے۔ سکینہ خود کو ریگستان میں بدلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

اس کے ساتھ ساتھ اور آس پاس جتنی لڑکیوں کی شادیاں ہوئیں تھیں اب وہ دو تین بچّوں کی ماں بن چکی تھیں۔ بچّے ان کی دولت تھے۔ اور یہ سرمایہ سکینہ کے والد کی تمام جائداد سے زیادہ قیمتی اور انمول تھا۔ اس کی ایک سہیلی نے ایک بار اسے یہ باور بھی کرایا تھا۔ جب سکینہ نے اس کے بیٹے کو گود میں لیتے ہوئے کہا تھا: ارے! اب تو گھر کا خرچ بڑھ گیا ہوگا؟''

''سکینہ!'' اس کی سہیلی نے جواب میں کہا۔۔۔ ''بچوں سے بڑی دولت دنیا میں کیا ہے، ان کے لئے جان بھی قربان کی جاسکتی ہے۔''

سکینہ نے کچھ نہ کہا تھا۔۔ مگر گھر آ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ اسے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا تھا کہ وہ ادھوری ہے۔ اس کے والدین کی جس دولت پر اسے غرور تھا۔ وہ ہیچ ہے۔ عورت کی تکمیل اس کے ماں بننے میں ہے۔ وہ چاہتی تھی یہ بات خود اس کے شوہر اس سے کریں اور کسی اچھے حکیم یا وید سے کوئی دوا لے آئیں۔۔۔ گائو کے امام صاحب سے اچھی اچھی آیتوں کا دم کیا ہوا پانی لے آئیں۔ اگر اس پر کسی نے کوئی ٹونا کیا ہے تو اس کا توڑ نکالیں۔ غوث پاک کی درگاہ پر جا کر جو، گائو سے ۲۵ کلومیٹر دور ہے۔ منّت مانگ آئیں۔ غریب بچوں کو دس روز کھانا کھلا کر گھر سے نحوست کو دور کریں۔ وہ چاہتی تھی کسی طرح سے ماں بن جائے۔ غالباً دوبار اس نے اشارۃً کہنا

چاہا۔ مجاور حسین کا جواب تھا۔ اللہ کی دولت ہے۔ وہ جب چاہے گا عطا کرے گا۔

پھر سکینہ نے اس موضوع پر بات کرنا اپنی ہتک سمجھا۔ ہر ماہ جب وہ گھنے جنگلوں میں بسے اس گائو سے اوپر آسمان میں روشن پورے چاند کو دیکھتی تو اس کی آنکھیں بھر آتیں۔۔۔موری میں کپڑا بدلتے ہوئے اس کی روح پر محرومی کے گہن لگ جاتے۔ وہ اپنے بدن کی قید سے نکل کر کہیں دور بہہ جانے کا ارادہ کرتی۔ پورے چاند کی راتیں اسے صحرا کی نا آسودگی لگنے لگی تھیں۔ دیمک اس کی روح کو چاٹنے لگی تھی، جس کے سبب وہ اندر ہی اندر خود سے بے ربط ہونے لگی تھی۔ اسی لیے جب مجاور حسین نے گھر میں تبلیغی نصاب کی تعلیم شروع کی تو ان کی باتوں میں اس کا دل نہ لگتا تھا۔ وہ ایسے خدا سے روٹھ گئی تھی جو اس کی کوکھ کا دشمن تھا۔ مجاور حسین نے اسے ابراہیمؑ کی زندگی کے واقعات سنائے، تو وہ اکیلے میں جا کر بہت ہنستی رہی۔ اسے یقین ہی نہ آیا تھا کہ واقعی انھیں اس عمر میں اللہ نے اولاد سے سرفراز کیا ہوگا۔ لیکن جب اس نے مریمؑ کی زندگی کے واقعات سنئے، تو وہ سرد اگئی۔ اسے عیسیٰ کی کرشماتی ولادت پر حیرانی ہوئی۔ لیکن۔۔۔اس واقعے سے وہ اس قدر متاثر ہوئی کہ اس نے یہ مان ہی لیا کہ اللہ کی مرضی ہر بات میں شامل ہوتی ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اس کو اس دولت سے نوازتا ہے اور اگر اللہ چاہے تو چاند کو دو حصّوں میں تقسیم کر سکتا ہے۔ پتھر کے پہاڑوں کو سونے میں بدل سکتا ہے۔ گم راہ کو صراط مستقیم پر لا سکتا ہے۔

مریمؑ کی زندگی کو اپنے طور پر تصور کر کے وہ اس رات بہت روئی تھی۔ اپنے باطن کی فصیل میں مقید وہ مریم سے محبت کرنے لگ گئی تھی۔ جانے عدم تاریخیت کے وہ کیا اسرار تھے جسے بے دینی اور لاعلمی کے سبب وہ سمجھنے کی حماقت کر رہی تھی۔ وہ مجاور حسین سے مریمؑ کے بارے میں اور بھی جاننا چاہتی تھی مگر جس قدر وہ بیچارے جانتے تھے۔ اسے بتا چکے تھے۔ اس معلومات کی بنیاد پر اس نے مریمؑ کی ایک چھبی اپنے ذہن میں

بنائی تھی۔ جس کا عکس اس کے دل کے ایک کونے میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گیا تھا۔

کئی سال بعد جب گائو میں پہلا ٹیلی ویژن آیا اور ایک روز جب وہ اس پر ہندوستانی چرچ کے بارے میں ایک فلم دیکھ رہی تھی تب کسی نے بتایا۔

''دیکھو وہ ہیں مریمؑ ......عیسائیوں کے مطابق۔ لیکن اپنے مذہب میں تصویریں بنانا حرام ہے۔''

وہ اس مجسمے کو دیکھتی رہ گئی......وہ چاہتی تھی وہ فلم کبھی ختم نہ ہو......اور وہ صدیوں تک اس مجسمے کو دیکھتی رہے۔ یہاں تک کے ساری کائنات فنا ہو جائے......صرف مریمؑ کا مجسمہ باقی رہے......اس روز وہ بہت شاداں تھی۔ کیوں کہ اس کے من میں مریمؑ کا جو نقش تھا اتفاقاً ٹیلی ویژن پر بتائے گئے مجسمے سے ہو بہ ہو ملتا جلتا تھا۔

﴿۴﴾

عبدالعزیز کی آنکھ کے کواڑ اندھیرے میں اس وقت کھلے جب اسے لگا کوئی شئے اس کی چھاتی پر رینگ رہی ہے۔ کھلی آنکھوں کے باوجود اسے کچھ نہ دکھائی دیا۔ اسے احساس ہوا کہ گوجڑی اس کے پورے بدن پر ہے۔ اچانک بیداری سے، لمحے بھر کے لئے اس کا ذہن، نیم تاریک سیال میں بدلا ہوا تھا۔ اسے لگا اس کی چھاتی پر جھینگر یا کوئی دوسرا کیڑا تو نہیں رینگ رہا ہے۔ اس کے بائیں ہاتھ میں فطری جنبش ہوئی لیکن جھٹ سے دل نے اسے روک لیا۔ اس کی انگلیاں چھوئی موئی کی طرح سمٹ گئیں اور ذہن کی نیم تاریکی میں نیلی روشنی کی لہریں رواں ہوئیں۔ اس نے پلکوں کو بند کر لیا آنکھ کے رقبے میں ایک آئینہ روشن ہوا۔ جس میں وہ یہ دیکھ سکتا تھا کہ درحقیقت اس کی چھاتی پر سکینہ کی مخروطی انگلیاں ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کہیں ایسا تو نہ تھا کہ سکینہ کی آنکھ لگ گئی تھی اور نیند میں اس کا ہاتھ اس کی چھاتی پر پڑ گیا تھا؟ اگر

یوں ہوا تھا تو اس کے پورے بدن پر گوجڑی کیسے پھیل گئی؟ کہیں سکینہ نے یہ تو نہیں سوچا کہ اسے ٹھنڈ لگ رہی ہے۔ ویسے عام طور پر رات کے آخری پہروں میں اسے ٹھنڈ لگتی تھی۔ مگر آج کام زیادہ کرنے سے وہ اتنا تھک گیا تھا کہ ٹھنڈ لگنے کا سوال ہی نہ تھا۔ وہ حیران تھا۔ اس کا ذہن حیرانی کے سبب بہت تیزی سے خیالات کے بے شمار بھنور اس کے دل میں پیدا کر رہا تھا۔ خیالات کی رفتار کے ساتھ ابھی اس نے ہم آہنگی پیدا نہ کی تھی کہ اس نے محسوس کیا۔۔۔ رفتہ رفتہ ان مخروطی انگلیوں کا لمس اس کی گردن کے پاس سے ہوتا ہوا اس کے گالوں پر پھیلا۔ اس کی بند پلکوں کو ٹٹول کر وہ اس کے ہونٹوں کی لکیروں کو چھوتا رہا۔ ہونٹوں کی لکیروں کے تار اس کے سینے سے ملے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو پریشان جانا۔۔۔ دل کے اس ارتعاش سے وہ واقف تھا۔ یہ ایسا ہی اثر تھا جیسا اس پر اس وقت ہوتا تھا جب گانو کے کنویں پر ڈول کھینچتی ہوئی نوجوان لڑکیوں کے جھکے ہوئے جسم کو دیکھ کر اسے ہوتا تھا۔ ساڑی اور بلاؤز کے درمیان کے حصّے کو جب وہ یوں بھیگے کپڑوں میں دیکھتا تو آس پاس کا سارا ماحول شاداب لگنے لگتا۔ کپڑے دھوتے دھوتے جب کوئی لڑکی یا عورت یکا یک اٹھ کر ڈول کنویں میں پھینکتی اور جھک کر کھینچ رہی ہوتی، اس سمئے اگر ساڑی بدن سے چپکی ہوئی ہوتی تب ایک خم سا درمیان میں پڑ جاتا۔ جسے دیکھ کر اسے بے حد خوشی ہوتی۔ شروع شروع میں وہ نظریں چھپا کر یہاں وہاں دیکھنے کے بہانے جھٹ سے ایک نظر ہی اُچک پاتا تھا۔ پھر یہ نشہ۔۔۔ اُس میں گہرائی تک اتر گیا اور اس کے دیدے اس منظر کے متلاشی ہو گئے۔ یہاں چند مہینوں سے تو اس میں اس کیفیت کو دیکھنے کا جنوں سا پیدا ہو گیا تھا۔ اسی لئے تو وہ کسی نہ کسی بہانے کنویں پر چلا جاتا۔ بات بے بات، ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر بڑی عورتوں سے باتیں کرتا رہتا۔ کسی کو شبہ تک نہ ہوتا۔ اس کے دل میں کئی رنگ جاگ جاتے اور ایک گرم لہر اس کے اندر گردش کرنے لگ

جاتی۔۔۔ یہ وہ گرم لہر تو نہ تھی جس کا ذکر اس کی ٹیچر نے ایک بار کیا تھا ''بڑے بڑے سمندروں کو ایک گرم لہر تقسیم کرتی ہے۔''۔۔۔ وہ سمندر تھا اور یہ لہر اس کے لڑکپن کو نوجوانی میں تقسیم کرنے، اس کے اندر بیدار ہوئی تھی۔ وہ رنگ تھا اور لہر وہ سیال جو اس کے بدن میں مختلف رنگوں کی آمیزش سے ایک نئے دھنک کو ترتیب دے رہا تھا۔

دل کا ارتعاش بدن کے اندر نئے موسم کا سرور بھر دیتا تو اسے یوں لگتا آس پاس کے سارے پیڑوں پر بھنورآ گئے ہیں۔ جنگلی پودوں پر ان گنت رنگوں کے پھول کھل گئے ہیں۔ چاول کے کھیت کے قطعوں میں یکا یک فصل لہرا رہی ہے۔ ایک طرف کھڑا باولا (بجوکا)، ہاتھ ہلا ہلا کر اس کا استقبال کر رہا ہے۔ ایک طرف سے مور ناچتے ہوئے آئے ہیں اور کنویں کے اطراف رقص وسرور کا سماں بن گیا ہے۔ وہ کرشنا کے روپ میں ہاتھوں میں بانسری لئے کھڑا ہے۔ موسیقی کا عالم ہے کہ گاؤں کی ساری لڑکیاں اور عورتیں اس کے گرد چمپا اور چمیلی کی کلیوں کے ہار پہن کر رقص کر رہی ہیں۔ اسے ان سب سے محبت تھی مگر وہ بانسری کسی اور کے لئے ہی بجا رہا تھا۔۔۔ کیا وہ بانسری سکینہ کے اس لمس کے لئے بجایا کرتا تھا۔؟؟

لمحے بھر میں جاگتی آنکھ سے دیکھے منظر اور خواب اس کی نگاہ میں ابھرے اور سکینہ کے لمس کے احساس کے ساتھ ہی دوبارہ ذہن کی جھیل میں ڈوب گئے۔۔۔ سچ تو یہ تھا کہ سکینہ کو اس نے کبھی کنویں پر نہیں دیکھا تھا۔ اس کے گھر پانی بھرنے اور کپڑا دھونے کے لئے ایک نوکرانی تھی۔

سکینہ کی مخروطی انگلیوں کے لمس کی بازگشت اس کے بدن کی اندرونی فصیلوں میں پھیلی۔۔۔ پندرہ برس چار مہینے اور دس دنوں سے برفیلی ساکت جھیل کی سطح پر کرکرڑ کی آواز کے ساتھ دراڑیں نمایاں ہوئیں، اندر۔۔۔ یوں بھی چند برسوں سے ایک آنچ سی رہ رہ کر ابھرتی تھی جس نے گزشتہ سال سے ہلکی تپش کا روپ اختیار کرنا شروع کیا

تھا۔آج یہ تپش، کسی الہامی شرر کے سبب شعلگی میں بدلنے کے درپے تھی۔ برف پگھلنے والی تھی۔ کچھ لہریں اس کے دل میں یکا یک ابھریں اور بیٹھ گیئں۔اسے ایسالگا کہ یہ ناممکن ہے۔اس کے ذہن کا فتور ہے۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو، ایسے کئی خواب تو خود اسے بھی آتے ہیں۔عرصہ ہوااس نے خواب دیکھا تھا کہ پڑوس کی ایک لڑکی جو اس کی اسکول میں دسویں جماعت کی مانیٹر تھی۔اسے باتوں ہی باتوں میں گھنے جنگل میں لے گئی۔موسلا دھار بارش میں بیچ جنگل، ایک برگد کے بوڑھے پیڑ کے نیچے بیٹھا کر اپنے دل کی کہانی سناتی رہی۔ وہ دونوں بہت بھیگ گئے تھے مگر ان کے اندر ایک آلاؤ سا جل رہا تھا۔اس نے عبدالعزیز کی انگلیاں اپنی مٹھی میں دبائے رکھی تھیں۔ چوٹیاں سامنے کی طرف کر کے بالوں کو کھول دیا۔اس کا رنگ یوں تو سانولا تھا مگر خواب میں وہ برہمنوں کی طرح زرد سفید نظر آئی تھی۔ اس کی آنکھیں نیلی سبز مائل تھیں۔ یکا یک بہت ساری رنگ برنگی تتلیاں ان کے گرد منڈلانے لگیں۔ چند منٹوں بعد سب تتلیاں زمین پر پروں کو پھیلا کر بیٹھ گئیں۔ دوسرے ہی پل ان کے پر سبز پیلی اور نیم جامنی بیلوں میں بدل گئے۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتا بیلوں نے ان دونوں کو لپیٹ لیا۔ایک ساتھ۔۔۔وہ ایک ساتھ لپٹ گئے تو فوراً موسم بدل گیا۔اب بارش کی جگہ تیز طوفانی ہوا چل رہی تھی۔ٹھنڈ سے اس کا بدن کانپ گیا تھا لیکن لمحے بھر میں اس نے پھر محسوس کیا کہ ایک آنچ اس کے اندر رہے جو رفتہ رفتہ پھیل رہی تھی۔اس کے ہاتھ مانیٹر کے رخسار پر آہستہ آہستہ ایک خواب تلاش کر رہے تھے۔لطف کی پہلی تمازت میں بدن کی شرکت کا پہلا سرور۔۔۔تصورات کی دنیا کی لذت سے جبّلت کا پہلا انبساط۔۔۔ خیال کی دنیا میں کشید جسم کا پہلا ذائقہ......اس خواب کا اختتام الہامی اور عبدالعزیز کو اپنے ہی رازوں سے ہم کنار کرنے والا تھا۔ وہ خواب اسے مکمل طور پر کبھی یاد نہیں آتا۔البتہ اس خواب کے جو چند

ٹکڑے یادداشت میں محفوظ رہ گئے۔ انھیں وہ بار بار آنکھیں بندکر کے ذہن میں اجاگر کرتا رہا ہے۔ اس لئے نہیں کہ اسے ڈر تھا وہ انھیں بھول جائے گا بلکہ ایک لطف تھا جو ہر بار اس یادداشت کے ساتھ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس طرح کے حسین خواب اس کی روح کی گہرائی سے نیند کے اسٹیج پر ڈرامائی شطرنج بچھانے لگے تھے۔ وہ ہارتا جیتتا بساط شطرنج پر اکیلا فاتح تھا۔ اس کی شکست اس کی تمنا تھی اور اس کی جیت میں اس کی شکست۔

اس طرح کے خواب جو اس نے حالت نیند میں دیکھے تھے۔ گزشتہ چند مہینوں سے وہ جاگتے ہوئے بھی دیکھنے لگ گیا تھا۔ اب وہ اکیلا بیٹھا رہتا تب بھی تنہا نہ ہوتا اور جب وہ لوگوں کے درمیان ہوتا تب بھی اکیلا ہوتا۔ اس اکیلے پن کی حالت میں ایک طلسمی سیج اس کی دل کی دنیا میں سجا ہوتا۔ جس پر وہ راج کمار کی طرح ہیرے جواہرات کے بنے ملبوسات میں خود کو دیکھتا۔ اس کے گرد سبز گلابی سندور رنگ کی ساڑیوں میں ملبوس گاؤں کی چند حسین لڑکیاں بعض شادی شدہ عورتیں ہوتیں۔ ان کے ہاتھوں میں اس کے لئے گلاب کے پھول، مور پنکھ اور چاندی کے گلاس میں شربت ہوتا۔ ایک دفعہ اس کی مراٹھی کی ٹیچر، پاٹل میڈم بھی اس شبستاں میں جلوہ افروز ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں کہانیوں کی کتاب تھی۔ یہ وہی کتاب تھی جس میں شہزادے اور پریوں کی محبت کی کتھائیں تھیں۔ اسی مجموعے میں سے مہینے میں ایک کہانی وہ کلاس میں سنایا کرتی تھی۔ آج وہ خود پریوں کے لباس میں اس کے سامنے تھی۔ اس کے بال اس کی کمر پر پھیلے ہوئے تھے۔ پیشانی پر سندور بھی تھا۔ گلے میں منگل سوتر اور پیروں میں چاندی کی خوب صورت پائل...... وہ بیوی تو سنتوش پاٹل کی ہی تھی مگر اپنی محبت کے ہار عبدالعزیز کو پہنا رہی تھی۔ وہ اس کے بالوں کے ساتھ کھیلتا رہا۔ اس کے رخسار پر اپنی ہتھیلیاں رکھ کر اس کی آنکھوں میں پھیلنے والے سُرخ ریشوں کے جال کو دیکھتا رہا۔ اس کی سفید بڑی

بڑی آنکھوں میں اپنا عکس تلاش کرتا رہا اور اسکی کاجل بھری پلکوں کی جھلمل سے خوش ہوتا رہا۔ اس نے پاٹل میڈم کے تحفے قبول کیے۔ پھر شہزادے کی طرح ہاتھ پھیلا کر اسے اپنی سیج پر دراز ہونے کا اشارہ کیا۔ اس کی پائل کے گھنگروؤں کو کان لگا کر اس کے دل کی موسیقی کو سنتا رہا۔ وہ اس کی خوشبو کو اپنی قوّت سے کشید کرتا رہا۔

اس کے خواب میں جو بھی در آتا وہ اس سے باتیں کرتا رہتا۔ اس کی باتیں سنتا رہتا۔ وہ بہت اچھا سامع تھا۔ وہ چاہتا تھا سب [خاص طور پر بڑی عمر کی لڑکیاں اور شادی شدہ عورتیں] ان کی زندگی کی کہانیاں اسے سنائیں۔ شوہروں، بچوں اور شادی سے پہلے کی ادھوری محبتوں کی کہانیاں۔ وہ سنتا رہتا اور اسی سماعت کے دوران وہ ان کی محبت حاصل کرتا۔

بعض اوقات ایک ساتھ کئی عورتیں اس کی تصوراتی سیج پر وارد ہوتیں اور وہ ان سے محبت کے نغمے گانے کی خواہش ظاہر کرتا۔ یہ وہی گیت تھے جو اس نے شادیوں میں یا ریڈیو پر دو ایک بار سنے تھے۔ ایک گیت جو اس نے ریڈیو پر سنا تھا۔ اکثر وہ انھیں سناتا۔

پیار کیا کوئی چوری نہیں کی
چپ چپ آہیں بھرنا کیا
جب پیار کیا تو ڈرنا کیا
جب پیار کیا تو ڈرنا کیا

وہ سب اس کے آواز کی تعریف کرتیں اور اس کے پیار پر یکساں خلوص کے ساتھ اعتماد ظاہر کرتیں۔ وہ ان سے وعدہ کرتا کہ یہ ''محبت'' راز رہے گی۔ لڑکیوں کے والدین اور جن کی شادیاں ہو چکی ہیں ان کے شوہروں کو اس بات کا کبھی علم ہونے نہ دیا جائے گا۔ اس کے وعدے پر وہ ایمان لاتیں اور عبدالعزیز کی محبت میں اس کے ہونٹوں، انگلیوں اور پیشانی پر بوسہ لیتیں۔ ایک بار اس کے تصور میں ایک طلاق شدہ خاتون آئی

تھی وہ اس کی پیشانی پر بوسہ لے رہی تھی۔ عبدالعزیز نے اسے روک کر پوچھا۔ ''کہیں تمھیں، تمھارا بیٹا تو یاد نہیں آ رہا ہے۔''

اس عورت نے جواب دیا۔ ''نہیں عزیز! میں تمہارے اندر اپنے عاشق کو دیکھتی ہوں جس سے شادی سے پہلے میں بہت پیار کرتی تھی، مگر ماں باپ اس کے خلاف تھے اگر میری شادی اس سے ہوئی ہوتی تو میرا طلاق نہ ہوتا۔''

یہ جواب سُن کر عبدالعزیز کو اس سے عجیب سی انسیت ہو گئی تھی۔ اصل زندگی میں وہ طلاق شدہ خاتون اس کے گھر سے دس منٹ کے فاصلے پر رہتی تھی۔ عمر میں اس سے دس پندرہ سال بڑی تھی۔ اس تصوراتی اُنسیت نے عبدالعزیز کے دل پر کچھ ایسا اثر کیا تھا کہ وہ اس کے گھر جا کر اس سے ملتا اور اس کے کاموں میں اس کی مدد کرتا۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ اس کے تصّور میں آ کر عورتیں جو باتیں بتاتی ہیں وہ حقیقی اور سچّی ہوتی ہیں۔ علاوہ جو کچھ وہ روبرو بولتی ہیں وہ جھوٹ ہوتا ہے۔

من کی من سے بات ہی سچّی بات ہے اور اس کے لئے ایک من کی خود کلامی بھی درحقیقت دوسرے من کی حاضری ہی ہے۔ ایک ہی من میں کئی روحیں بسیرا کر سکتی ہیں اور کئی روحوں میں ایک من اپنی پیاس جگا سکتا ہے۔ یہ عجیب سی باتیں ہیں جنھیں ہماری زبان اور تعلیم گاہوں میں نفسیات اور فلسفے کے مضامین میں پڑھایا جاتا ہے، لیکن عبدالعزیز کی زندگی میں یہ باتیں اس کی جبلت کے نہاں خانے سے آئی تھیں۔

اس لئے وہ ابھی اس بات میں فرق نہیں کر پاتا تھا کہ آیا یہ تصّور ہے یا حقیقت؟ کیا واقعی سکینہ اس سے لگ کر سوئی ہوئی ہے اور اس کے ہاتھ کا لمس اس کی نیند کو کاٹ کر اسے بیدار کیے ہے یا ابھی وہ نیند میں ہے اور یہ خواب ہے، یا وہ ابھی سویا نہیں ہے اور یہ تصور ہے اور وہ یہ سوچ رہا ہے کہ وہ نیند میں ہے۔ وہ غلطاں و حیراں تھا۔ یہ حیرانی اسے غرق کیے تھی کہ کیا تصور کی سیج پر سے ایک منظر زمین کے بستر پر اتر سکتا ہے۔

﴿۵﴾

سکینہ نے اپنی اب تک زندگی میں سوائے مجاور حسین کسی اور جسم پر یوں پیار بھری چاہت سے اپنی انگلیاں نہ پھریں تھیں۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ کئی دفعہ مجاور حسین کے سینے پر سر رکھ کر جب اس نے ان کے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیری ہیں تو اسے یہ محسوس ہوا کہ مجاور حسین درحقیقت کوئی دوسرا آدمی ہے اور یوں اپنے ہی شوہر کے لمس میں اسے دوسرے چہروں اور ابدان کے لمس کا احساس ہوا ہے۔ سکینہ کی ایک سہیلی شبانہ نے ہی تو اسے بتایا تھا: ''عورت اپنے شوہر میں ایک دوسرے آدمی سے محبت کرتی ہے جو اسے کبھی نہیں ملتا اور ہر مرد اپنی عورت میں کئی عورتوں کو ڈھونڈتا ہے جن میں سے بعض سے وہ اکثر ملتا رہتا ہے۔''

سکینہ نے ہنس کر اس کی اس بات کو ٹال دیا تھا۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ وہ شادی کے بعد اپنے شوہر کو رادھا کی طرح، لیلیٰ کی طرح، شیریں کی طرح محبت کرے گی یہ نام گاؤ کے لوگ گیتوں میں اس نے سنے تھے۔ وہ سارے گندے خیالات جو اس کے دل میں آتے ہیں۔ انھیں وہ نکال دے گی۔ اپنی پوری زندگی اپنے شوہر کی محبت اور خوشنودی میں گزارے گی۔ وہ اس خیال کو گانٹھ باندھ کر اپنے دل میں رکھنا چاہتی تھی کہ وہ رام کی سیتا کی طرح ہے۔ اور ہر حال میں اور ہر مصیبت میں اپنے رام کا ساتھ دے گی۔ لیکن شادی کے چوتھے سال کے آخری مہینوں میں یہ احساس اس کے دل میں جگہ بنانے لگا کہ مجاور حسین اس کے رام نہیں ہیں۔ وہ اکیلی بن باس میں ہے۔ مجاور حسین کے ترکش میں اس کی روح کی تشنگی کو رام کرنے والے بان نہیں ہیں۔ ان کے پاس وہ مسکراہٹ، وہ ٹھہراؤ، وہ وجاہت، وہ مشاہدہ اور وہ نظر نہیں ہے جو اس کے گاؤ کے مندر میں بنی رام کی مورت میں دکھائی دیتی تھی۔ اس نے ہزار بار وہ مورت دیکھی تھی۔ جب بھی وہ آنکھیں موندھ لیتی ہے اس مورت سے نکل کر رام کی شبیہ اس

کے سامنے چلنے پھرنے لگتی۔ وہ ان کی آواز سُن سکتی ہے۔ ان کی مسکراہٹ کو محسوس کر سکتی ہے۔ ان کے کاندھے پر لٹکے چاندی کے ترکش میں دھاردار تیروں کے سروں کو دیکھ سکتی ہے۔ اس نے اپنی سہیلیوں سے رام کی شادی اور لنکا کو فتح کرنے کے قصّے سن رکھے تھے۔ اسے ان کی بہادری اور قربانی پر ناز تھا۔ گانو کے مندر میں جو رام کی مورت تھی، جانے وہ کس زمانے کے مورتی کار نے بنائی تھی۔ دیکھنے والے کو یوں لگتا وہ رام کو زندہ و جاوید کھڑا دیکھ رہے ہیں۔ جنھوں نے مورت دیکھی ہے۔ وہ رام کو اس کے بغیر تصور نہیں کر سکتے۔ اگر رام سورگ سے خود زمین پر آ کر کہیں کہ میں رام ہوں۔ لوگ انھیں ماننے سے انکار کر دیں گے اور کہیں گے۔ ''مورت والی صورت ہی رام کی ہو سکتی ہے۔'' یہ کمال تھا اس مورت کا اور یہی سبب تھا کہ سکینہ کو رام کی آنکھوں میں جو چمک اور پیار دکھائی دیتا تھا اس کا سایہ بھی مجاور حسین کی آنکھوں میں نہ تھا۔

شوہر سے مثالی محبت کرنے کی جو گانٹھ اس نے دل کی ایک شاخ پر باندھی تھی وہ رفتہ رفتہ ڈھیلی پڑ گئی۔ مجاور حسین کی سادہ مزاجی، توکل اور نرمی اس کے لئے وہ اسم اعظم نہ بن سکا جو اس کی مرکز گزیدہ نسائیت کی خلش کو بھر پاتا۔ اس کے اندر عدم تکمیلیت کا جو احساس تھا۔ اس کے اندر زندگی کی جو للک تھی۔۔۔۔۔۔ اس کے اندر سارے موسموں میں محبت کی بیلوں پر مچلنے کی جو ترنگ تھی۔۔ اس کے اندر محبت کی شیریں گفتگو میں ڈوبے رہنے کا جو نشہ تھا۔۔۔ اسے مجاور حسین کی دینی باتیں اور اصلاحی حکایات پورا کرنے سے قاصر تھیں۔

اس کی دلچسپی مجاور حسین میں کم ہو گئی، کسی اور میں بڑھی بھی نہ تھی۔ وہ ماننے لگی تھی کہ اس کا رام مجاور حسین نہیں ہے۔ اس کے باوجود اس نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ وہ مجاور حسین کے ہوتے ہوئے کسی غیر سے کوئی تعلق پیدا کرے گی۔ حالانکہ اس کے دل میں دوسری مٹی کی خوشبو سونگھنے کا خیال ابھرتا ضرور، لیکن ہر بار وہ مٹی اور وہ خوشبو مجاور حسین

کے بدن میں ضم ہو جاتی۔ چہرے اس کے ذہن کی پیٹی سے نکلتے اور اس کے سامنے اپنے تو اں جسم کی نمائش کرتے۔ لیکن پھر مجاور حسین کے بدن میں مدغم ہو جاتے۔ اس کا شوہر اس کے لیے ایک تالاب تھا جس میں اسے نہانا پسند نہ تھا مگر اپنے تمام اصنام کا وسرجن وہ اسی میں کرتی آئی تھی۔ اسے یوں لگنے لگا تھا، اس تالاب میں اب صرف وسرجن ہو سکتا ہے اس کے پانی میں وہ تازگی اور حیات بخش مادہ نہیں ہے جس کو پینے سے پیاس مٹ جائے اور قلب ماہیت سے چہرہ پر نور ہو جائے۔ یہ پانی شریانوں میں رقصاں خون کی حدت کے ساتھ گھلنے ملنے کی رمق کھو چکا تھا۔ یہ پانی کوکھ کی آتما کو نئے اوتار عطا کرنے کے فطری جوہر سے محروم ہے۔

آج کی رات جہاں اسے شبانہ کی بات یاد آئی تھی وہیں مریمؑ کی حکایت بھی۔ جن لوگوں کا خدا ان کی کوکھ میں مر جاتا ہے ان کے لئے تاریخ اور مذہب بھی بیساکھی کا کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ ان بیساکھیوں کے بغیر نفس کا سفر دشوار گزار ہو جاتا ہے۔ اور انسان ایک ایسی ڈور پر چلنے لگتا ہے جس میں ہر ان ایک داخلی دلدل میں گرنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ ایک ایسی دلدل جس کی کوئی تھاہ نہیں ہے۔ جس سے ابھرنے کا کوئی نشان نہیں ہے۔ خدا کی اس یکا یک موت سے روح، وجدان اور عرفان فانی ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ خدا کی یکا یک موت سے بدن کے قفل کھل جاتے ہیں اور خواہشوں کے نخلستان سر سبز ہو جاتے ہیں۔۔۔ کیا واقعی سکینہ کے خدا کی موت کی گھڑی قریب آ گئی تھی؟؟ خدا کی موت کا ماتم نفس کی تذلیل سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن اس تکلیف کے بغیر روح کی سرشاری اور تکمیل ذات کا دوسرا کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے۔ اس کیفیت سے کم لوگ گزرتے ہیں۔ زیادہ تر تو وہ ہیں جو اپنے نفس

کی خواہش کے دلدل میں گرتے ہیں اور پھر خدا کی لاش کو دل میں دفنائے خدا کی بزرگی کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ یہ منافق ہوتے ہیں۔ سکینہ منافق نہیں تھی خدا اسے بچپن میں تحفے میں ملا تھا اور جوانی میں اس کے لئے بے ربط ثابت ہو گیا۔ ایک ایسا ا خدا جو روح کا امین نہ تھا جو صرف انسان کے دل میں صدیوں سے بسا ایک احساس تھا۔۔۔ سکینہ اس احساس خدا کی موت کو قبول کرنا چاہتی تھی۔

جب سکینہ کی انگلیاں عبدالعزیز کے ہونٹوں پر تھیں تب اس کے دل میں ایک عجیب سی اُلجھن تھی اور وہ اس کشمکش میں تھی کہ وہ کون ہے؟ اس کا رام کون ہے؟ اس کا خدا کون ہے؟ اس کے اندر یہ کیا ہے۔ جو اسکی انگلیوں کو متحرک کیے ہے؟ شاید وہ صرف عبدالعزیز کو چھونا چاہتی تھی۔ اس کے خطوط کو قریب سے دیکھنا چاہتی تھی۔ اس خواہش نے اس کے اندر الجھن کے ساتھ جسارت کی ایک موج بھی پیدا کر دی۔ وہ اٹھی۔ اس نے اٹھ کر دروازے کا کواڑ آہستہ سے بند کر دیا۔

۶

گوجڑی کو اس نے عبدالعزیز کے پورے بدن پر پھیلا دیا اور کروٹ بدل کر اس کی طرف مڑ گئی۔ چند منٹوں تک وہ یوں ہی اندھیرے میں تکتی رہی۔ خاموشی کا عالم تھا کہ باہر درختوں کے پتوں کے ہوا کے ساتھ اتصال سے پیدا دھنوں کو وہ صاف طور پر سن پا رہی تھی۔ کسی کے چلنے یا دور تک بات کرنے کا کوئی شائبہ تک نہ تھا ''رات'' باہر چاندنی کی روشنی میں دلہن بن گئی تھی۔ یہ منظر صرف آسمان کی بلندی سے دیکھا جانا چاہیے۔ گھنے جنگل پر چاند کا نور یوں سایہ کیے تھا گویا کسی طلسمی ویرانے پر محبت کے خدا ''کام دیو'' نے اپنے سحر کو پھیلا دیا ہو۔ پیڑ خاموش مگر اندر ہی اندر ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے کام دیو کے اشارے پر محبت کی گفتگو میں محو تھے۔ جو، ایک

دوسرے سے کچھ فاصلے کی دوری پر تھے انھیں ہوائیں ایک دوسرے کی تڑپ کا پیغام پہنچارہی تھیں۔ جنھیں سن کر وہ فراق اور خواہش اتصال میں سسکتے تھے۔ شاخیں دوری کے درد سے چیختیں اور ایک نوحہ سارے جنگل میں گردش کرتا۔ جسے سن کر جنگلی سور، لومڑیاں اور بھینکراں (ہرن سا نظر آنے والا ایک جانور) روتے۔ ان کے رونے سے رات آسیب میں بدل جاتی۔ لیکن یہ شور گھنے جنگل کے درمیانی حصے میں جاری تھا، گائو کی سرحدوں سے بہت دور، اس لیے ان کی اذیت کا احساس یہاں کے لوگوں کو شاید کبھی نہ ہوا ہوگا۔ رات صدیوں کا سلسلہ تھی جس کی کوکھ میں اب تو کیڑے مکوڑے بھی سو چکے تھے۔

سکینہ نے ایک دھیمی لمبی سانس لی اور اپنا ہاتھ عبدالعزیز کی گردن پر ڈال دیا۔ اس کی کہنی عبدالعزیز کے سینے پر تھی جس کے نیچے پسلیوں کے پنجرے میں اس کا دل تھا۔ اس نے عبدالعزیز کے کانوں کی لو کو اپنی انگلیوں سے چھوا اور پھر آہستہ آہستہ اسکی ہتھیلی اس کے دل پر آ کر ٹھہر گئی، سینہ مجاور حسین کے سینے کی طرح پھیلا ہوا نہ تھا، لیکن اندر کی دھڑکن کو وہ محسوس کر رہی تھی۔ ایک ایسے دل کی دھڑکن جو ابھی ابھی محبت کے نشے سے معمور ہونے کے لئے، وحشی ہونے کے لئے تیار ہوا تھا۔ وہ اس دل میں اپنے جسم کی حرارت کو محفوظ کر سکتی تھی۔

۷

پہلے پہل وہ ان کے گھر اس کی ساس سے ملنے آیا کرتا تھا جو عبدالعزیز کی ماں کی رشتہ دار بھی تھی۔ گھر کے کاموں میں جٹ جاتا تھا۔ اس کی آواز اسے اچھی لگتی تھی۔ جب وہ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے کوئی محاورے استعمال کرتا تو سکینہ کے چہرے پر مسکراہٹ آجاتی تھی۔ سکینہ کے آنگن میں وہ اس کی نند کے لڑکے کے ساتھ گلی ڈنڈا، لنگوری، لنگڑی اور چڑیا اڑی کھیلا کرتا اور جب پڑوس کی لڑکیاں پھگڑی کھیلتیں تو

بچوں کے ساتھ بیٹھ کر خوب تالیاں بجا کر مسرور ہوتا تھا۔ دو تین بار سکینہ کے کہنے پر وہ جنگل کی سرحد پر جا کر اس کے لئے کروندے بھی لے آیا تھا۔ ایک بار سکینہ نے اسے گوجڑی سینے کا دھاگا لانے بازار بھیجا تھا۔ دو گھنٹے تک وہ واپس نہیں آیا۔ اسے پریشانی ہونے لگی تھی۔ بازار گاؤں سے ایک کلو میٹر دور تھا اور راستے میں قبرستان پڑتا تھا۔ چوں کہ قبرستان سے لگ کر ایک ولی کا مزار بھی تھا اس لئے بدروحوں کا ڈر نہیں تھا مگر سانپ اور بچھو بہت تھے۔

جب وہ نظر آیا تو اس کے چہرے پر پسینہ دیکھ کر سکینہ نے پوچھا: ''اتنی دیر کیوں کر دی، میں تو پریشان ہوگئی تھی۔''

اس نے دھاگوں کا بنڈل سکینہ کے ہاتھ میں رکھا، سانس لی پھر کہا: ''بازار میں مداری کھیل بتا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک جادوگر لڑکا بھی تھا۔ اس نے بہت سارے جادو بتائے۔ ایک آدمی کی جیب سے رومال نکال کر اسے اپنے ڈبّے میں رکھا اور منتر پڑھا۔۔۔ پھر کیا ہوا معلوم۔''

''کیا ہوا؟'' سکینہ نے حیرت سے پوچھا۔

''اس لڑکے نے مجھے آگے بلایا۔ میں بنداس گیا۔ اس نے ایک چھری میرے سر پر گھومائی اور میری جیب میں ہاتھ ڈال کر وہی رومال نکالا۔ میں حیران ہوگیا سب نے بہت تالیاں بجائیں۔ میرا اوپٹ ہوگیا۔''

سکینہ مسکرائی۔ وہ بھی مسکرایا۔

''سکینہ آپا جادو کیسے ہوتا ہے؟'' اس نے پوچھا

''جادوگروں کے پاس شاید جنّات لوگ ہوتے ہیں۔ وہ ان کے کہنے پر سب کام کرتے ہیں!'' سکینہ نے جواب دیا۔ جو اس نے بڑوں سے سنا تھا۔

''لیکن اس کے ساتھ تو جنات نہیں تھے۔''

''ارے بے وقوف جنّات نظر تھوڑی آتے ہیں۔ وہ صرف ان کو دیکھتے ہیں جن کے قابو میں ہوتے ہیں''

''جب دیکھتے نہیں تو قابو میں کیوں رہتے ہیں؟''

تب سکینہ کے پاس کوئی جواب نہ تھا وہ تھوڑی دیر خاموش رہی۔ اس نے اس طرح کے سوالات خود سے نہیں پوچھے تھے وہ سوچ میں پڑ گئی۔ عبدالعزیز کی معصومیت پر اسے مسکراہٹ بھی آئی۔ پھر اس نے جواب دیا تھا۔

''ایسا ہوتا ہے، جنّات جن سے پیار کرتے ہیں، ان کے قابو میں خود چلے آتے ہیں۔''

اس جواب سے وہ مزید حیران ہو گیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔

''سکینہ آپا۔ اگر کسی جن کو آپ سے پیار ہو گیا تو۔۔۔؟''

''تو میں بھی اس کو اپنے قابو میں کر لوں گی۔۔''

''پھر وہ آپ کے سب کام کرے گا نا؟''

''ہاں سب کام۔۔۔''

''لیکن یاد رکھنا۔۔۔ دھاگا لانا ہو تو اس کو مت بھیجنا میں آجاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔''

''اور میرا ایک کام۔۔۔ کیا وہ میرا کام کرے گا؟''

''میں بولوں گی۔۔ تو کرے گا۔۔۔ کیا کام ہے۔؟''

''میرا حساب بہت کھراب ہے۔ ماسٹر مرگا بناتے ہیں۔ اس کو بول کر، کر کے دے دینا چلے گا۔''

سکینہ مسکرائی اور بولی۔۔۔ ''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔، اس کو بول دو گی۔''

سکینہ کے چہرے پر ہلکی فطری اتراہٹ در آئی تھی۔ عبدالعزیز کو اسی سبب یہ لگا تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔ سکینہ جانتی تھی یہ صرف باتیں ہیں۔ اس کے باوجود جن کو قابو میں کرنے کا خیال اس پر اثر کر گیا تھا۔ وہ کبھی کبھی سوچتی۔ کاش! وہ کسی جن کو اپنے بس میں کرے یا کسی اچھے سے جن کو اس سے پیار ہو جائے۔ جو اس کے ساتھ بیٹھ کر اس کے دل کی باتوں کو سنے اور اسے دوسری دنیاؤں کے راز اور وہاں کی عورتوں کے دل کی حالت سنائے۔ لیکن ایسا ممکن نہ تھا۔ حالانکہ گانو میں عورتوں پر چڑیل سوار ہونے یا 'گرے' کے ذریعے پکڑے جانے کے واقعات تو صدیوں پرانے تھے۔ [گرا۔ درحقیقت بھوتوں کی ایک شکل تھی جو روپ بدلتے تھے جھٹ سے کایا کلپ کرتے تھے] ان کے اثر کو زائل کرنے کے لئے گانو کی سرحد پر ناریل کا چڑھاوا یا بکریوں کی بلی دینا لازمی تھا۔ جنّات کا تصور چند سال بعد تبلیغ جماعت کے فروغ کے بعد پروان چڑھا۔ تب چڑیلوں نے گانو چھوڑ دیا اور بعد کے سارے واقعات جنّاتوں کے نام درج ہونے لگے۔

دیکھتے دیکھتے عبدالعزیز اس کے سامنے سمجھدار ہو گیا اور اب وہ نوجوانی کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ جہاں سکینہ اس کی سانسوں کی آنچ سے اندر ہی اندر پگھل سکتی تھی۔ اس کے بدن نے پختہ خطوط پر تبدیلیوں کا اظہار کر دیا تھا۔ سکینہ بدن کی فطری تبدیلیوں سے گزر چکی تھی۔ جانتی تھی عمر کے اس حصے میں دل کا کیا حال ہوتا ہے۔ ایک ذرا سی آنچ بھی خوابیدہ آتش فشاں کو شعلوں میں بدل سکتی ہے اور اور ایک ذرا سا لمس بھی منجمد سمندر کو طوفان میں بدل سکتا ہے۔ ایسا طوفان جو ارادے کی مضبوطی کی ساری کشتیوں کو اپنے گرداب میں غرق کر لیتا ہے۔

سکینہ کے ذہن میں عبدالعزیز کی یادوں کے ننھے ننھے جگنو روشن ہوئے اور ان کے

اجالوں میں اس پر ایک جن کا سایہ ہوگیا۔اس سایے نے اس کے اندر عجیب رنگ بھر دیا۔اس کی ہتھیلی بہہ گئی اور وہ ساکت منجمد جھیل کے اس مرکز گزیدہ محور پر تھی جہاں طلسمی ٹھنڈ کے نیچے گرم رو تھی۔

﴿۸﴾

ایک روز جب دسویں جماعت میں اس کی جغرافیہ کی ٹیچر نے کہا''برف کی چٹانوں کے نیچے آتش فشاں ہوتا ہے،تب عبدالعزیز کے چہرے پر ایک الہامی مسکراٹ ابھری تھی اور یاد کا یہ ٹکڑا ذہن کی سب سے محفوظ فائل سے نکل کر اس کی آنکھوں کے سامنے تازہ دم ہوا تھا۔

نیند کے ہزار برسوں سے میٹھا ذائقہ اس وقت بند آنکھوں سے جا گنے میں تھا،آئندہ زندگی وہ اس ایک لمحے کو امانت کے طور پر اپنے من میں سمیٹ کر جیتا رہا اس رات کے بعد جو بھی ہونا تھا وہ اس دنیا کے کسی دوسرے انسان کے لئے شاید دلچسپی کا باعث نہ بنے مگر ان دونوں کے لئے ساری زندگی کا حاصل تھا۔

اس کے دیدوں میں سیال سا تحلیل ہوا دل کی دھڑکن اوفان پر تھی۔ بند آنکھوں سے یہ مادہ باہر کی روشنی میں آنا چاہتا مگر گوجڑی کے اندر اس قدر اندھیرا تھا کہ جب اس نے لمحے بھر کو پلکوں کو وا کیا تب بھی اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔اوپر چاند کو سیاہ بادلوں نے گھیر لیا جس کے سبب گانو پر ہلکا سایہ ہوگیا تھا۔۔۔نتیجتاً روزن سے داخل ہونے والی شعاعیں بھی معدوم ہوگئی تھیں۔

سکینہ اس کے دل کی تیز دھڑکن کو سن رہی تھی اور جانتی تھی اس دھڑکن میں خواہش کا نشہ کتنا گہرا ہے۔وہ چاند بن گئی اور عبدالعزیز اس کے نور میں روحِ کامل کی آفرینش کا راز دار۔۔۔

۹

جب صبح نیند سے بوجھل عبدالعزیز کی آنکھیں کھلیں تو گوجڑی میں صرف وہ تھا۔ پل بھر کو وہ چونکا۔ اس نے اپنی پلکوں پر ہاتھ پھیرا۔ کیا وہ خواب میں تھا۔ کیا خواب اتنے طاقتور ہوتے ہیں کہ ہمیں ایسا لگے یہی حقیقت میں ہوا ہے یا جو واقعی ہوتا ہے وہ اس قدر نا قابلِ یقین ہوتا ہے کہ ہمیں لگتا ہے ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے یہ خواب ہو گا۔ حقیقت اور خواب کے درمیان کتنا مہین پردہ ہے۔ وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا کہ تین چھوٹے بچّے جو ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے تھے آ کر دھڑام سے اس پر گر گئے۔ سب سے چھوٹا بلک بلک کر رونے لگا تو اندر سے دو چار عورتیں آئیں۔ ان میں ایک اس کی خالہ تھی۔ عبدالعزیز کو بستر پر دیکھ کر وہ برس پڑی۔ اس سے کچھ کہتے نہ بن پایا وہ اٹھ کر پڑی میں گیا۔ جہاں کچھ رشتہ دار سلیمانی چائے پی رہے تھے۔ اس کی ماں تمبا کو کی میسری سے دانت مانجھ رہی تھی۔ اس نے ماں کی ڈبیا سے تمبا کو لیا اور آنگن میں چلا گیا۔ وہ چاہتا تھا ایک طرف بیٹھ کر میسری لگائے اور رات کے خواب کو محسوس کرے۔ وہاں آنگن میں جوں ہی اس کے قدم پڑے اس کے چچا نے چائے کا خالی کپ اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور کہا اندر سے بیڑی بھی جلا کر لانا۔ بیڑی اور کپ کو لینے میں اس کی میسری گر گئی۔ اس پر چار آدمی جو وہاں بیٹھے تھے، خوب ہنسے اور اس کا مذاق اڑایا۔ وہ پڑی میں واپس آیا اور جلتے ہوے سرخ کوئلے سے بیڑی سلگائی اور لا کر چچا کے ہاتھ میں تھما دی۔

وہ واپس میسری لینے اندر آیا تو اس کی ماں کی نظر اس پر پڑی۔ ماں نے اندازہ لگایا کہ اس نے ابھی تک منہ نہیں دھویا ہے تو وہ بگڑی گئی۔ وجھٹ سے موری میں گھسا کہ منہ دھولے، پردے کے اس پار اس وقت کوئی نہا رہا تھا۔ اس نے اچھی ڈپٹ سنائی کہ موری میں گھسنے سے پہلے دیکھ تو لیتا اندر کوئی ہے یا نہیں۔

وہ فوراً اچک کر واپس باہر آنگن میں گیا اور پترے کے ڈرم سے لوٹے میں پانی لے کر وہیں بیٹھ کر اس نے ہاتھ منہ دھویا۔ پڑی میں اس نے خالہ کی پلیٹ میں سے روا کھایا اور چائے پی۔ ابھی اس نے چائے پوری طرح ختم بھی نہ کی تھی کہ خالو اور چچا نے اسے کاموں کی لمبی فہرست تھما دی۔ وہ اٹھا اور کام میں لگ گیا۔

دوپہر کے کھانے کے وقت جب وہ سارے باہر کے کام نپٹا کر واپس پڑی میں آیا تو اس کی ماں نے کہا۔ ''ابھی تک نہایا نہیں۔'' وہ منہ بنا کر رہ گیا۔ ماں نے اس کے چچا کو بلایا۔ چچا نے اپنی الماری سے ایک جوڑا نکال کر اسے دیا اور کہا۔ ''عصر بعد نکاح ہے، تب تک خراب مت کرنا۔'' اس کے چہرے پر خوشی پھیلی۔ نئے کپڑے اس نے ہاتھ میں لئے۔ قمیص کا رنگ اسے بہت اچھا لگا۔ لیکن پتلون کو دیکھ کر وہ مطمئن نہ تھا۔ اس کا چہرہ اتر گیا۔ یہ دیکھ کر چچا نے پوچھا 'کیا ہوا رے؟''

اس نے نظریں اُٹھائیں اور کہا: ''ہی چڈی ہے مالا پاٹلون ہاوے۔'' (یہ چڈی ہے مجھے پتلون چاہے۔) اس جواب پر سب ہنس پڑے۔ چچا نے ہنستے ہوئے پھر سوال کیا۔ ''کیوں پتلون؟ تیرے کو تو اسکول میں بھی چڈی پر ہی جانا ہوتا ہے نا؟۔''

''وہ سب ٹھیک ہے لیکن اب میں چھوٹا نہیں ہوں۔ بڑا ہو گیا ہوں۔''

اس پر ایک عورت جو یہ سُن رہی تھی اس نے بلند آواز میں کہا۔ ''گومہرون! تو جو پتوس بو لیتے تو موٹو جھیلو یے۔'' (مہرون! سنو تمہارا بیٹا کہہ رہا ہے اب وہ بڑا ہو گیا ہے۔)

ایک زوردار قہقہہ۔ چھوٹے بچوں کو موقعہ مل گیا وہ ایک آواز میں چلائے۔۔۔۔

''پوپٹ پوپٹ۔ عبدالعزیز چوژیلو پوپٹ۔''

وہ ان کو دیکھتا رہا۔ وہ ان کے درمیان تھا لیکن اس کا وجود ایک دوسری زیادہ وسیع کائنات میں تھا۔ وہ اپنے بدن سے باہر آزاد اور خود مکتفی ہو کر اس دنیا کی چھوٹی چھوٹی اکائیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے کچھ نہ کہا۔ وہ کپڑے لے کر مالے پر گیا۔ وہاں اس نے

لکڑی کی بڑی پیٹی کھولی اور اس میں رکھی ہوئی پتلون نکالی جو عید پر اس کے ابّا نے اس کے لئے خریدی تھی۔

وہ نیچے آیا تو اس کی ماں پڑی کے دروازے پر کھڑی تھی۔اس نے اس کے ہاتھ سے پتلون لی اور کہا۔''چچا نے نئ چڈی لائی ہے وہ کیوں نہیں پہنی۔''اس نے ماں کی جانب دیکھا اور کہا!''تجا سمجات نائے ینار۔۔۔انی ہاں اتاں تو مالا بار کیو چڈیونو کو گھینو۔۔۔می خالی موٹیو پاٹلونگوس گھالن۔''

(تم نہیں سمجھو گی اور ہاں !اب تم میرے لئے چھوٹی چڈیاں مت لینا میں صرف بڑی پتلونیں ہی پہنوں گا۔)

ماں اس کے راستہ سے ہٹ گئی۔آج پہلی بار اس نے اپنے شوہر کا تحکمانہ تیور اپنے بیٹے میں دیکھا تھا۔وہ یہ بات فوراً مان گئی کہ اب اس کا بیٹا بڑا ہو گیا ہے۔

باب دوم

مگر وہ پھول سا چہرہ نظر نہ آتا تھا

ملازمت کا عرصہ قید کے ہزار برسوں کی طرح اس پر گزرا۔ لیکن آج وہ آزاد پرندہ تھا۔ ہوائی جہاز نے اڑان بھری اور اس کے دل میں گانو کی یادیں کروٹیں لینے لگیں۔ اگر ماں نے اسے مجبور نہ کیا ہوتا تو وہ ہرگز کویت کے آباد ویرانے میں بینک آفیسر کی ملازمت کے لئے نہ گیا ہوتا۔ اس نے گلف ایرویز کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔۔۔ باہر دن کا اُجالا پھیلا ہوا تھا اور نیچے نیلے رنگ کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ پھر یکایک وہ چادر سفید دھوئیں میں بدل گئی۔ اس کی آنکھوں نے دن کے اجالے کو کہرا میں بدلتے ہوئے محسوس کیا۔ آج اس کا دل ایک تہہ خانے میں بدل گیا تھا جس میں ہزاروں رنگ رقصاں تھے اور یہ سارے رنگ ہلکے زرد سفید رنگ سے متشکل ہوئے تھے، جو سکینہ کا رنگ تھا۔ اس رات کی یاد دل کے ایک کونے سے ابھر کر اس کی آنکھوں کے سامنے

آ گئی جب سکینہ نے اسے محبت کے سرور سے سرشار کر دیا تھا۔ اس کے بچپن کو اس کی ناف سے کاٹ کر اسے جوان لڑکے میں بدل دیا تھا۔

﴿۲﴾

دوسرے دن وہ کس بے قراری سے شادی کے منڈوے میں سکینہ کو تلاش کر رہا تھا۔ اس نے اپنے گھر کے علاوہ آس پاس کے مکانات، جہاں کچھ مہمان گپ شپ کر رہے تھے، وہاں بھی اسے تلاش کیا۔ مگر وہ کہیں نہ تھی۔ وہ حیران تھا۔ بس اس کی ایک جھلک دیکھنا چاہتا تھا تاکہ اسے اس بات کا یقین ہو کہ رات اس نے خواب نہیں دیکھا تھا۔ سکینہ کو ہر جگہ تلاش کرنے کے بعد وہ مایوس ہو گیا۔ قاضی نکاح سے پہلے بعض آیتوں کی قرآت کر رہا تھا۔ لوگ دھیان سے سن رہے تھے۔ قرآت ایک ایسی زبان میں ہو رہی تھی جس سے وہ نابلد تھے۔ بہت کم لوگ تھے جو اس وقت عربی زبان سمجھنے کی لیاقت رکھتے تھے۔ خیر!! سمجھ تو وہ قاضی صاحب بھی نہیں رہے تھے جو جھول جھول کر گردن گھما گھما کر، آواز کی زیر و بم کے ساتھ قرات کر رہے تھے۔

دس بارہ سال بعد جب گانو کے کچھ لڑکے ایک مدرسے سے فارغ ہو کر آئے تب یہ راز کھلا کہ قاضی صاحب قرآن کی آیات نہیں بلکہ کسی عربی شاعر کا لکھا ہوا قصیدہ پڑھا کرتے تھے جو ان کے والد نے نکاح نامے کی بیاض کے صفحہ اول پر کہیں سے اتار رکھا تھا اور عنوان کی جگہ اردو میں لکھا تھا ''دولہا دلہن کی فریاد در زبان عربی'' ایک لڑکے نے اس قصیدے کا تجزیہ کر کے یہ ثابت کیا کہ یہ عہد جاہلیت کی فحش شاعری کا نمونہ تھا۔ اسی بناء پر عربی سے واقف ان طلبہ نے قاضی صاحب کا بائیکاٹ کیا اور مستقبل کے نکاح پڑھانے کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لی۔

مجمع قاضی صاحب کی قرأت میں گم تھا لیکن عبدالعزیز کا دل سکینہ کے دیدار کے لئے وحشی ہو گیا تھا۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر پڑی میں گیا اور وہاں سے پتھروں کی دیوار کو پھلانگ کر...... چند مکانوں کے پیچھے سے ہوتا ہوا وہ عام راستے پر آ گیا۔ اب سکینہ کے گھر کی طرف اس کے قدم بڑھ رہے تھے۔ عصر کا وقت تھا اور سورج کے اطراف سفید زرد بادل مختلف شکلوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ بادلوں کی شکلیں بدلتی ہوئی ایک دوسرے سے ٹکرا کر نئی شکلیں بنا رہی تھیں۔ عبدالعزیز کی نظریں بادلوں کے کھیل دیکھ رہی تھیں۔ یہاں چند بادل ملے اور زرد رنگ میں شرابی مائل روشنی کی شعاعیں تحلیل ہوتیں اور فوراً ایک دل کی شبیہہ بنی۔ جس کے درمیان گہرا گلابی رنگ اور اطراف میں ہلکا نیلا پن جھلک رہا تھا۔ عبدالعزیز بادلوں کو سمجھنے لگا تھا۔ اسے ہمیشہ سے ایسا لگتا تھا کہ بادل خدا کی زبان میں باتیں کرتے ہیں۔ یہ وہ اشارے ہیں جو پیش آنے والے واقعات سے آپ کو آگاہ کر سکتے ہیں۔ وہ املی کے پیڑ کے پاس ایک لمحے کے لئے رکا۔ اس کے تنے پر اس نے اپنی ہتھیلی رکھی۔ نظریں املی کی پھیلی ہوئی شاخوں پر مرکوز کیں۔ اس نے کچھ نہ کہا۔ مگر املی کا پیڑ رو پڑا۔ املی کا پیڑ اس گانو کا سب سے پُرانا پیڑ تھا اور گانو کی چھ سو سالہ تاریخ کا امین۔۔۔ بلکہ ایک نجومی، اشعر ابن نجومی ابن اشعر ابن نجومی نے یہاں تک کہا تھا کہ ''یہ پیڑ نہ صرف ماضی بلکہ مستقبل سے بھی واقف ہے۔''

املی کے پیڑ کو دلوں اور نصیبوں کا حال معلوم تھا۔ دراصل اس کی ایک شاخ پر گزشتہ ستّر سال سے ایک محروم روح نے پناہ لے رکھی تھی۔ اس سے پہلے بعض بے ضرر مگر مستقبل اور ماضی کے واقعات کا علم رکھنے والے پاک جنوں کا ایک کنبہ رہتا تھا جو اس محروم و مجبور روح کی آہ و زاری سے اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ گھنے جنگل میں چلا گیا۔ تب سے اس پیڑ پر اسی کی حکمرانی ہے۔ جن لوگوں نے املی کے پیڑ کی شاخوں سے رونے کی آواز سُنی ہے۔ انہوں نے یہ افواہ پھیلائی کہ یہ کسی چڑیل کی شرارت ہے۔

جو لوگوں کو ڈرانے کے لئے جانوروں کی آواز میں روتی ہے۔

وہ محروم روح شگفتہ کی تھی، جو عبدالعزیز کے دادا شبیر حسین کی خالہ زاد بہن تھی۔ اس کی موت فطری نہ تھی بلکہ فطری عمل کو غیر فطری قرار دیے جانے کا نتیجہ تھی۔ ایک منصوبہ تھا۔ بے رحمی سے کیا گیا قتل تھا۔ ہوا یوں تھا کہ سولہویں سال میں قدم رکھنے سے چند ماہ قبل ہی وہ محبت کرنے کی خطا کر بیٹھی تھی۔ اس وقت گانو کے لوگ چاول کی کھیتی کیا کرتے تھے۔ آس پاس ہندؤں کے بھی کھیت تھے۔ سب آپس میں گھل مل کر کھیتیاں کیا کرتے تھے۔ مذہب یادداشت کا حصّہ تھا مگر تفریق کا جواز نہ تھا۔ باوجود اس کے ،حقیقت یہ بھی ہے کہ ان کے درمیان ایک فاصلہ بھی تھا۔

شگفتہ بدنصیب تھی۔ بارش کا موسم ختم ہوا چاول کے کھیت لہلہانے لگے تھے اور دوسری طرف اس کا بدن آنکھ مچولی کے راز اُگلنے لگا تھا۔ وہ گم صم اپنے بدن کے محور کی تبدیلیوں میں کھوئے رہنے لگی۔ کسی کو اس راز میں شریک نہیں کیا۔ وقت سے پہلے اگر کسی سہیلی سے بات کر لیتی تو رات کے اندھیرے میں بدن کے اندر سے اس زہریلے ناگ کو جڑی بوٹیوں کی مہک سونگھا کر باہر نکال لیا جاتا۔ وہ جانے کس آکاش میں، کس نظام شمسی کے کس سیارے کی مکیں تھی کہ شرم، ڈر اور حیرانی سے بے زبان بنی رہی۔ اس بے زبانی نے رفتہ رفتہ اسے نہ گفتہ موت کے مدار میں ڈھکیل دیا۔ اس کی رگیں تننے لگیں اور سوکھی ہوئی مچھلی کی بو سے اسے ابکائی آنے لگی۔۔۔ پہلے تو بدہضمی سمجھ کر نظر انداز کیا گیا مگر جب اسے پیڑوں کے سایوں اور چاول کے کھیت کو کاٹتے وقت چکر آنے شروع ہوئے تو اس کی ماں نے بھانپ لیا۔

ماں بلا آخر ایک عورت ہوتی ہے جو بیٹی کی غلطی کو اپنی جوانی کے آئنے میں جھانک

کر دیکھتی ہے۔ شگفتہ کی ماں نے اسے کچھ نہ کہا بلکہ خود صدمے سے گھنٹوں بیٹھتی روتی رہی۔ جب آنسوؤں نے مزید بہنے سے انکار کر دیا تو اس کے دماغ نے کام کرنا شروع کیا۔ اس نے جنگل سے دو تین جنگلی پیڑوں کے پھل لائے اور پپیتے کے بیجوں کے ساتھ پیس کر اس کا عرق اسے تین روز تک نہار پیٹ پلایا۔ اس عرق سے گہرائی میں چھپ کر بیٹھے ہوئے سانپ کو بھی بل سے باہر نکالنے میں پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ لیکن پانچ مہینے گزر جانے کے بعد اس عرق کا اثر کام نہیں کرتا یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ چوں کہ اس مرحلے میں اس کا استعمال پہلے نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے بے چاری ماں پر اُمید تھی۔ جب وہ ہار گئی اور اس کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں تو اس نے یہ بات اپنے شوہر کو بتادی۔

مرد کے اندر باپ کے علاوہ ایک آدمی بھی رہتا ہے۔ جو صدیوں سے ایک جیسا ہے۔ ہر مرد کے اندر ایک بچھو، دو ناگ اور ایک شیطان رہتا ہے۔

﴿۳﴾

شگفتہ کی لاش کو گانو کے قبرستان کی بجائے گانو کی سرحد کے پاس جنگل کے ابتدائی حصّے میں دفنایا گیا۔

یہ بات مشہور کی گئی کہ اسے ناسور ہو گیا تھا اور ایک پاگل کتے نے اسے کاٹ لیا تھا چنانچہ اسے ایک کمرے میں بند کر کے چھت پر سے اس پر ابلتے پانی کو انڈیلا گیا۔ سارا گانو خاموش سو رہا تھا البتہ گانو کے سارے کتّے بے تحاشہ رو رہے تھے۔ چمگادڑوں کا ایک دستہ اس کمرے کے اوپر منڈلاتا رہا۔ اس کی ماں ایک کونے میں پاگلوں کی طرح ماتم کرتی رہی۔ پانچ روز پہلے شگفتہ کو اس منصوبہ کی بھنک لگ گئی تھی اسی سبب وہ چیخ چیخ کر رونے بلکنے لگی تھی۔ گھر کے مردوں پر حملہ کیا کرتی اور انھیں نوچتے ہوئے کچھ بڑ بڑاتی۔ اس کی تدفین کے بعد ان لوگوں نے میت میں آئے

لوگوں کو اپنے گلے سینے اور چہرے پر پڑے اس کے ناخن کی کھرونچ بتائی اور کہا۔
''ایسا لگتا تھا اس کے پیٹ میں کتّے کے بچے بلکنے لگے تھے۔''

لیکن شگفتہ مرنے کے بعد بھی مری نہیں تھی۔ وہ زندہ ہے۔ اس کے اندر جو محبت کی نشانی تھی اس کی کوئی واضح شکل نہ تھی مگر وہ بھی زندہ ہے۔ کہتے ہیں اس کی قبر کے پاس ہر بارش میں کئی مور آتے ہیں اور اپنے پروں کو پھیلا کر اس بے ہیت روح کا جی بہلاتے ہیں۔ پورے چاند کی رات شگفتہ اسے ملنے وہاں چلی جاتی ہے۔ اس رات املی کے پیڑ کے نیچے اشعرابن نجومی ابن اشعرابن نجومی بے اولاد عورتوں، عشق میں ہارے ہوئے لاچاروں اور پریشان حال لوگوں کی مراد پوری ہونے کے لئے آسمانی آیتوں کا ورد کرتا ہے۔ چڑھاوا چڑھاتا ہے یہ کام اگر وہ کسی اور رات کرے تو شاید شگفتہ اسے موت کے گھاٹ اُتار دیتی یا دیوانہ بنا دیتی۔

جب عبدالعزیز نے املی کے تاریخی پیڑ کے تنے پر اپنی ہتھیلی رکھی تو شگفتہ نے اس کے دل پر تحریر اس کے بدن کی بے قراری کو پڑھ لیا۔۔۔ وہ جانتی تھی بدن کی لذّت ایک سراب ہے جو موت کی وادی کی طرف لے جاتا ہے۔ اس نے لمحے بھر میں سدرۃ المنتہی پر چھلانگ لگائی اور لوح محفوظ سے چرائے ہوئے دفتروں کو بزرگ جناتوں کے ہاتھوں سے چھین کر اس میں عبدالعزیز کی قسمت کا صفحہ تلاش کیا۔ آسمانی دفاتر کی زبان میں الفاظ کا استعمال نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی علامات کا۔ یہ زبان خالی عبارتوں کا عکس لاتفسیر ہے۔ جب ان پر روح کا عکس پڑتا ہے تب واقعے کی نوعیت زمان ومکان کے ساتھ دکھائی دیتی ہے لیکن ہر روح کے عکس سے یہ صفحات منوّر نہیں ہوتے۔

شگفتہ کو یہ بات کام دیو کے ایک خاص راز دار نے بتائی تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق ہمالیہ کی ایک وادی میں ایک روز لمبی سفید داڑھی والے بزرگوں کا ایک قافلہ

تفریح کے لئے آیا ہوا تھا۔ تب کام دیو کے اس خاص راز دار نے انھیں اپسراؤں کا رقص بتایا۔ پھر انھیں شراب پلائی۔ یہ شراب کام دیو کی خاص شراب تھی۔ اس کی مہک سے حوا کے دل میں خواہش کا دائرہ پھیلا تھا۔ ان بزرگوں نے جب اس شراب کا ذائقہ چکھا تو ان کی ہیئت میں عجیب نشے کی ترنگ پھیلی۔ اور وہ مزید شراب کا تقاضا کرنے لگے۔ بہت ضد کرنے پر کام دیو نے اشارے سے اپنے راز دار سے کہا۔ ''ان سے پتہ کرو۔ لوح محفوظ کی تحریروں کو پڑھنے کا اصول کیا ہے۔'' پہلے تو بزرگوں نے انکار کیا مگر جوں جوں نشہ ان کی روح میں پھیلتا گیا ان کی روح کی بے احساس فضا میں انھیں ایک متحرک خالی پن محسوس ہونے لگا۔ اس بے نشاں احساسِ نشان کو صرف اور صرف اسی شراب سے پُر کیا جاسکتا تھا۔ وہ بے بس ہو گئے۔ راز دار ان کی اس حالت پر مسکراتا رہا۔ بالآخر شراب کی ایک جھیل کا پتہ جاننے کی لالچ میں انہوں نے بتایا ''لوح محفوظ کی زبان کو صرف وہی روح پڑھ سکتی ہے۔ جو محبت سے معمور ہو'' ...... اسے جنات اور فرشتے پڑھ نہیں پاتے۔ چُرا لیتے ہیں، مگر پھر اپنا ہی سر پھوڑتے رہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ صفحات ان کے لئے ہمیشہ خالی صفحات ہی ہوتے ہیں۔ جس طرح ان کا وجود ان کے لئے وجودی حالت میں بھی بے وجود رہتا ہے۔

''آپ اس راز کو کب سے جانتے ہیں......'' کام دیو کی شئے پر راز دار نے پوچھا۔

''ہم اس راز کو صدیوں سے جانتے تھے۔'' سفید داڑھی والے بزرگ نے جواب دیا۔

''پھر آپ نے آج ہمیں بتانے سے انکار کیوں نہیں کیا......'' راز دار نے پوچھا۔

''آج ہم وہ نہیں رہے جو آج تک ہم تھے......'' سب سے بزرگ نے کہا جسے اندازہ ہو گیا تھا کہ آج اس سے کون سی خطا ہوئی ہے۔

اتنا کہنا تھا کہ ایک دھواں پھیلا۔ سارے بزرگ پلک جھپکتے ہی برف کی چٹانوں میں بدل گئے۔ کام دیو اور اس کا راز دار برف کی گپھاوں میں چالیس سال تک

قید رہے۔ چوں کہ یہ بات انہوں نے دوسرے دیوتاوں کو نہیں بتائی تھی اس لیے اس کا ذکر پرانوں میں بھی نہیں ملتا۔ اس راز کو کام دیو کے راز دار نے شگفتہ کو بتایا تھا۔ اس کا دل اس وقت پگھل گیا تھا جب اس کے رشتے دار محبت کی سزا دینے کے لیے اس پر گرم پانی انڈیل رہے تھے۔

جب عبدالعزیز سکینہ کی دہلیز پر پہنچا اس وقت سورج شفق پر پہنچ گیا تھا۔ اطراف کا سارا منظر گلابی زرد روشنی سے الہامی سا لگ رہا تھا۔ آنگن میں پیپل کا پیڑ مکان کی چھت پر بانہیں ڈالے کھڑا تھا۔ اس کے سایے میں امرود کا پیڑ تھا اور امرود کے تنے سے قریب چائے میں ڈالی جانے والی گھاس تھی جسے ''پات'' کہا جاتا ہے۔ پات کی جڑوں کے پاس چڑیا شام کا گیت گا رہی تھی۔ اس پرندے کی گردن چاکلیٹی اور دم سفید ہوتی ہے۔ کوئل سے ملتا جلتا یہ پرندہ سنہری رنگ کے انڈے دیتا ہے۔ جن کا استعمال جادو ٹونا کے لئے بہ طور خاص کیا جاتا ہے۔ سورل کے لوگ اسے ''ہوٹوٹی'' کہتے ہیں۔

عبدالعزیز نے ایک نظر چڑیا کو دیکھا اور دروازے پر دستک دی۔ دستک پر اندر سے کوئی جواب نہ آیا مگر چڑیا بھر سے اڑ گئی۔ اس کی پتلی سی چونچ سے ایک سوکھا ہوا تنکا گر گیا اور ہوا میں لہراتا ہوا دائروں میں تیرتا ہوا زمین پر آگرا۔ چڑیا نے ایک بار مایوسی سے مڑ کر دیکھا اور پھر پیپل کی لمبی شاخوں کے درمیان کہیں غائب ہوگئی۔

عبدالعزیز نے دروازے پر دوبارہ دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے دروازے سے ملحق آنگن کی دیوار کو عبور کیا اور منکیدار کے دروازے پر جا کر دستک دی۔ لوہے کی کڑی کو ابھی اس نے کھینچا ہی تھا کہ اسے اندازہ ہوا کڑی اندر سے لگائی ہوئی نہیں ہے۔ اس نے پکارا......

''سکینہ آ......آپا......''

''سکینہ آپا......''

''اے سکینہ آپا......''

غالباً سکینہ کی آنکھ لگ گئی تھی۔ عبدالعزیز کی آواز پر وہ چونک کر اٹھی۔ اس نے اپنی ساڑی ٹھیک کی ......اور پلنگ کے پاس رکھے ہوئے آئینے میں جھانک کر بال سیدھے کئے۔

''سکینہ آپا......تمی گھرات ہاؤں کی نایے......؟'' (آپ گھر میں ہو یا نہیں؟)

سکینہ نے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا۔ اس کا چہرہ اسے ایک اجنبی چہرہ لگا۔ صبح سے شام تک وہ اپنے آپ سے ہزاروں سوالات پوچھ چکی تھی۔ بار بار خود کو آئینے میں دیکھ کر اپنے چہرے سے بھی اس نے کئی جواب مانگے تھے۔ حالانکہ جن جوابات کی اسے تلاش تھی وہ کہیں موجود نہ تھے۔ وہ پریشان حال اور مضمحل تھی۔ خود سے ناراض اور نفس کے فریب سے مجروح۔ وہ سراب بن گئی تھی۔ اپنے بہاو میں خود بہتا ہوا دریا بن گئی تھی۔ وہ جس کہرا میں کھوگئی تھی۔ وہ کہرا بھی، خود ہی تھی۔ وہ جس سیلاب کی جھیج بن گئی تھی وہ سیلاب اسی میں مقید تھا۔ وہ رفتار چاہتی تھی اور اس کے آنسو اس کے مژگاں سے روٹھ گئے تھے۔ وہ چیخنا چاہتی تھی مگر اس کی حلق میں آواز کی پیٹی غائب تھی۔ وہ خود کو ایذا پہنچانا چاہتی تھی مگر اس کا جسم اسے نظر نہ آتا تھا۔ ۔ وہ جو عورت تھی اب وہ عورت اسی میں گم شدہ عورت کی تلاش تھی۔ ''آیلوں۔ ۔ ۔ایک منٹ!''

اس کی زبان سے ادا ہوا۔ یہ جملہ اس نے ہرگز ہرگز ادا نہ کیا تھا۔ عبدالعزیز سے نہ وہ ملنا چاہتی تھی نہ اسے دیکھنا۔ کس منہ سے کس ناطے سے اس کے سامنے کھڑے رہ کر ،اس سے بات کرے گی۔ وہ بچہ تھا اور اس کے سامنے جوانی کے مدار میں داخل ہوا تھا۔ وہ اپنے آپ سے شرمندہ تھی۔ ناراض تھی۔ پھر یہ جواب اس کی خلق سے کیسے ادا ہوا۔ اس کے اندر اس سے فریب کرتا ہوا کون تھا؟؟؟

اس کی آواز جوں ہی عبدالعزیز کے کانوں پر پڑی اس کے ذہن میں شہید گھل گئی۔ اس کی مغموم آنکھوں میں ایک چمک پھیلی۔ اس کی رگوں میں پھیلا انتظار اس کے دل کا تشنج اور رات کے خواب کا اسرار پگھل کر اس کے بدن میں ایک کیف بن گیا۔ وہ پُر کیف نگاہوں سے اس کے دیدار کا منتظر تھا۔ وہ چاہتا تھا انتظار کے اس لمحے میں گرفتار رہے۔ اس انتظار میں ایک مبہم نشہ تھا۔ اور یہ لطف اس لئے بھی اضافی تھا کیونکہ ابھی وہ اس بات پر ایمان نہیں لا سکا تھا کہ گذشتہ رات کے خواب میں سکینہ بھی شریک تھی۔

سکینہ مڑی تو آئینے میں اس کا عکس مسکرایا اور اس کے سابقہ تحلیل شدہ عکس سے کہنے لگا۔۔۔ ''اس عورت کو محبت ہو گئی ہے۔''

سکینہ کو ایسا لگا کہ کہیں کوئی سرگوشی ہوئی ہے۔ وہ مڑی اور مڑ کر سارے کمرے کو دوبارہ دیکھا۔ جب اس نے آئینہ کی طرف دیکھا تو وہ عکس تحلیل ہو گیا اور اس کی جگہ ایک دوسرا عکس تھا جو سکینہ سے بہت مانوس تھا۔ وہ اپنے عکس کو آئینے میں دیکھ کر مسکرائی۔ وہ جانتی تھی اس کے ساتھ ساتھ وہ عکس کیوں مسکرا رہا ہے۔

﴿۴﴾
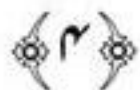
وہ باہر آئی تو عبدالعزیز منگیلدار کے دروازے سے لگا کھڑا تھا۔ پڑی کے ہنبٹے پر رک گئی۔ عبدالعزیز نے اسے دیکھا تو اس کے پیروں تلے کی زمین میں ایک طرح کا زلزلہ اسے محسوس ہوا۔ اس نے نظریں اپنے پیروں پر مرکوز کیں......وہ جاننا چاہتا تھا کہ واقعی زمین میں ہلچل ہو رہی ہے۔ یا محض اس کے پیر لڑکھڑا رہے ہیں؟

سکینہ خاموش تھی۔ اس خاموشی میں اس کے دل کی دھڑکن بھی شریک ہو گئی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان کی حیرانی کا مرحلہ یہ بھی ہو کہ اس میں اس کا دل بھی حصّہ لے۔ اس نے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو اپنی چھاتی پر آہستہ سے رکھا اور دماغ کو پل بھر کے لیے اس طرف متوجہ کیا۔ واقعی اندر کے گھمسان میں سکون بھی تھا۔ اس کا دل بے حرکت

اور بے شور تھا۔ اتنے برسوں سے متلاطم موجوں کی صورت متحرک رہنے والے دل میں آج چپ کا وقفہ اتنا طاقت ور تھا کہ اس کی آنکھوں میں سرخ ریشوں کا ایک جال پھیلا اور مژگاں میں ایک گلابی قطرہ چمکا۔ اس سے پہلے کہ عبدالعزیز کی نظر اٹھتی اور اس گلابی آنسو کو دیکھ لیتی وہ گلابی پنکھڑی بن کر جھٹپٹے کی سیاہی میں غائب ہوگیا۔ دونوں کی نظریں ایک ساتھ یکساں قوت نفس ایک دوسرے سے ٹکرائیں...... لمحے بھر میں دونوں نے اندر کی قوت کو یکساں رفتار سے زائل ہوتے محسوس کیا۔

سکینہ ہنبٹے کی پاری پر بیٹھ گئی۔ عبدالعزیز نے دروازے سے اپنی پیٹھ ہٹائی۔ ذرا آگے جھکا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ سکینہ کی جھکی گردن پر جوں ہی اس کی نظریں ٹھہریں وہ اپنا سوال بھول گیا۔ اس کے بال ایک طرف تھے اور سبز مائل بلاؤز کا اوپری سرا زیادہ جھک گیا تھا۔ گردن کی ہڈی کا ایک منکا ابھر کر اپنی علحدہ خوبصورتی کا اظہار کر رہا تھا۔ عبدالعزیز کو اس پل سے پہلے یہ معلوم نہ تھا کہ گردن کا ابھار ایک خاص لمحے میں اس قدر کشش کا سبب بن سکتا ہے۔ اس ایک مختصر پل میں اس نے گردن کے ہزار طواف کئے اور اپنی بندگی کا اظہار کیا۔ وہ آگے بڑھ کر عقیدت مند کی طرح اس ابھری ہوئی ہڈی کو اپنی آنکھوں سے چومنا چاہتا تھا۔ گویا وہ شفاف جھیل کی سطح پر ایک کنول تھا جس کو آنکھوں سے لگانے سے سینے کی جلن کم ہوجائے اور روح کو بینائی مل جائے۔ جب قیام کویت میں اس نے بچوں کو ایک ایسے کھلونے سے کھیلتے دیکھا جس کے بٹن دبانے سے مقدس مقامات اس میں نظر آتے۔ تب وہ مغموم ہوگیا تھا۔ اس کیمرا نما کھلونے میں سعودی اور فلسطین کے اہم مقامات تھے۔ ایک سبز سیاہ پتھر کو ایک عورت بوسہ لے رہی تھی۔ اس نے جب یہ فریم دیکھی اس وقت گویا اس کے دل کے ٹکڑے ہوگئے۔ اسے سکینہ کی یکایک یاد آگئی تھی۔ سکینہ کی گردن اس کے لیے اسی مقدس مقام کی طرح تھی۔

آج تو اسے معلوم نہ تھا ایک روز یہی گردن کی ہڈی اسے کرب میں مبتلا کرے گی۔ اس کے باوجود جانے کیوں اس کے پیر آگے نہ بڑھے۔ زمین کی روح نے اسے جکڑ رکھا تھا۔

سکینہ نے گردن اٹھائی تو شفاف جھیل کی سطح مرصع آئینے میں بدل گئی۔اس کا چہرہ ہلکا گلابی ہوگیا تھا۔دن بھر وہ جس اندرونی ہیجان اور بے سکونی کی حالت سے گذری تھی اس کی زردی نے گلابی رنگ کو زیادہ پُرکشش بنا دیا تھا۔''آپ صبح سے کہیں پر بھی دکھائی نہیں دیۓ۔اس لئے میں آپ کو دیکھنے چلا آیا۔''

سکینہ نے کچھ نہیں کہا۔

''کیا ہوا؟ آپ کی تبیت تو کھراب نہیں ہے؟''

سکینہ نے کچھ نہیں کہا۔

''پھر آپ نکاح میں کیوں نہیں آئے۔''

سکینہ نے کچھ نہیں کہا۔

''ارے آپ اتنے چپ کیوں ہیں......؟''

''کچھ نہیں۔ابھی مغرب کا وقت ہونے آیا ہے''......اتنا کہہ کر وہ چپ ہوگئی۔

''مغرب کا ٹائم ہوا تو کیا ہوا......؟''

''کچھ نہیں......تو چلے جا......''

اتنا کہہ کر وہ اٹھی اور اندر چلی گئی۔اس نے کباٹ سے ماچس کی ڈبیا نکالی اور تمام کمروں کے دیے روشن کیۓ۔عبدالعزیز کچھ دیر وہاں کھڑا رہا۔پھر باہر نکل گیا۔سکینہ نے تمام کمروں کو روشن کیا اور کھڑکی کے پاس کھڑے ہوکر آسمان سے اترتی رات کو دیکھنے لگی۔وہ جانتی تھی اس کے خالی کمرے کا دیا جلا کر عبدالعزیز اندھیرے میں کس

سمت چلا جا رہا ہے۔

﴿۵﴾

وہ راستے بدلتا رہا تا کہ اندھیرا گہرا ہو جائے اور اس کے چہرے کی پژمردگی رات کی تہوں میں جانی پہچانی نگاہوں کو نظر نہ آئے۔ گھر پہنچ کر وہ کاموں میں جٹ گیا۔ اسے منہمک دیکھ کر مہرون نے سوچا آج چچا کی شادی کی خوشی میں یہ کس قدر خوش ہے کہ بغیر کہے سارے کام خود ہی کر رہا ہے۔ اس نے مسجد سے لائی ہوئی دریوں کو جھٹک کر اکھٹا کیا۔ خالی کپ جمع کر کے پڑی میں موری کے پاس رکھّے۔ آنگن میں جھاڑو لگائی۔ بچوں کی اچھل کود سے جو رنگ برنگی باوٹے کے کاغذ بکھرے تھے انھیں اٹھا کر ایک چھوٹی بچی کو دیے جو، انھیں پا کر خوشی سے بہت دیر تک ایک کونے میں بیٹھ کر ان سے کھیلتی رہی۔

وہ سب سے نگاہیں چراتا رہا۔ وہ جانتا تھا گانو کے لوگ آنکھوں کو دیکھ کر دل کا حال پڑھ لیتے ہیں۔ اس کے دل میں درد تھا۔ یہ درد محبت کی علامت تھی۔ یہ درد سکینہ کے لیے اس کے دل میں بیدار محبت کے سبب تھا۔ محبت کا درد آنکھ کے دائرے میں پھیل جاتا ہے اور مشک کی خوشبو کی طرح سارے ماحول میں اپنے وجود کا اظہار کرتا ہے۔ اس خوشبو کو اطراف کی تمام روحیں محسوس کر سکتی ہیں خاص کر وہ روحیں جو محبت سے محروم ہوں۔ محبت سے محروم روحیں محبت کو گناہ کہتی ہیں، اور پوری طاقت سے دوسرے کو بھی اس دولت روحانی سے محروم کرنے کی سازش رچنے لگتی ہیں۔

اسے احساس تھا یہ محبت جو اس کے دل میں بیدار ہو رہی ہے اس کا اظہار وہ کسی سے نہ کر پائے گا اور اگر یہ بات عام ہو جائے تو وہ جی نہ سکے گا۔

سارے کام نپٹا کر وہ مالے پر چلا گیا۔ چٹائی بچھائی اور لیٹ گیا۔ نیند اس کی آنکھوں میں نہ تھی، یہ اسے پتہ تھا۔ لیکن وہ ڈرا ہوا تھا، یہ اسے معلوم نہ تھا۔ اس کی حلق میں ایک

وزنی پتھر پھنس گیا تھا جس نے اس گلے کو تنگ کر دیا تھا۔ اگر وہ کسی سے بات کرتا تو اس کے حلق سے بس ایک روہانسی آواز نکلتی اور دل کی پریشانی اس کے چہرے کو زرد کاغذ میں بدل دیتی۔

وہ یکسوئی کا متلاشی تھا۔ یکسوئی جو محبت کی پناہ گاہ ہے۔ محبت کے کرب کا تریاق ہے۔ وہ خودکلامی کے لئے تنہائی کا متلاشی تھا۔ تنہائی جو خودکلامی کی آلاؤ ہے۔ جس میں روح بدن کی شرکت کے بغیر بدن سے مکالمہ کرتی ہے۔ جس میں تن اور من کے درمیان کا باندھ ٹوٹ جاتا ہے اور آدمی اپنی موجودگی کے باوصف خود سے بیگانہ رہتا ہے۔ اسی بیگانگی میں محبت کا کرب داخلی تاریکی کو منور کرتا ہے۔

عبدالعزیز نے اپنے گھٹنوں کو سینے کے قریب موڑ کر دونوں ہاتھوں سے کس کر دبایا۔ یہ حالت ایسی ہی تھی جیسی حمل میں نئی زندگی کی ہوتی ہے۔ وہ آدمی کم اور ایک بدلی ہوئی حالت زیادہ تھا۔ وہ کیڑا مکوڑا نہیں تھا اس کے بدن میں اس کا دل تھا جس میں ایک شرر تھا یہ شرر سکینہ کے لمس سے ایک آبشار میں بدل گیا تھا اس آبشار میں اس کی ذات شرابور تھی۔ وہ خود کو سمیٹ کر سکینہ کی محبت کا مسافر بننے کے لئے خود کو تیار کر رہا تھا۔ وہ بیتی ہوئی رات کو خواب کی طرح فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا یہ خواب اس کی ساری زندگی کو نیند میں بدل دے وہ بار بار سکینہ کے چہرے کو اپنی بند آنکھوں میں اُجاگر کرتا رہا مگر ہر بار یہ چہرہ بننے سے پہلے بکھر جاتا آنکھ اور یادداشت دونوں اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے وہ سکینہ کے من موہک چہرے کو اپنی آنکھیں بند کر کے گھنٹوں پیار کرنا چاہتا تھا مگر ادھورے لمس اس کی تشنگی میں اضافہ کرتے تھے۔ ہر بار اس کا اصل چہرہ ابھرتے ہی اس کا زرد سرخ چہرہ درمیان میں آ کر شام کے سرد روے کی یاد کو تازہ کر دیتا۔ یہ ایک تضاد تھا۔ جسے سمجھنے کی ہر کوشش میں وہ ناکام تھا۔ اس کے ملال کا ایک سبب یہ بھی تھا۔

کیا وہ مجھ سے پیار کرنے کے بعد میرے ساتھ ایسا سلوک کرسکتی ہے؟ کیوں اس نے مجھے واپس جانے کے لئے کہا؟ وہاں تو کوئی اور نہ تھا؟ کیا وہ مجھے پھر سے پیار نہیں کرے گی؟ اس کے چہرے پر اتنی اداسی کیوں تھی؟ کس بے رخی سے اس نے کہا:

''کچھ نہیں۔۔۔تو چلے جا۔۔۔''

یہ سوالات اسے پریشان کئے ہوئے تھے۔اس کے پاس ان کے جواب نہیں تھے۔ جوابات سے محروم سوالات ایک طرح کا گرداب ہے جس میں ذات کے وسوسے پنپتے ہیں اور جب یہ سوالات محبت کے ضمن میں ہوں تو روح کی شاخیں مرجھا جاتی ہیں اور دل میں تشنج کروٹ لینے لگتا ہے۔اس تشنج میں عبدالعزیز کی روح کی شاخوں پر محبت کی پہلی برف باری نے عجیب سا رنگ پھیلا دیا تھا۔وہ کھلی آنکھوں سے گوجڑی کے اندر سکڑا سمٹا رہا اور سکینہ کا ہیولہ اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔

سکینہ کھڑکی سے مڑی اور پلنگ پر لیٹ گئی۔وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کی وہ ہے کون ؟وہ۔۔جس نے عبدالعزیز کو واپس جانے کے لئے کہا؟......یا......وہ جو اپنی مرضی کے باوجود اس سے ملنے کے لئے پڑی کے دروازے پر گئی تھی؟ وہ......جس نے ایک رات پہلے اسے اپنے بدن میں محسوس کیا تھا؟......یا......وہ جس کو اس واقعے پر ندامت ہے؟

وہ پلنگ پر لیٹ گئی اور اپنے بارے میں سوچنے لگی،۔اس تلخی میں ایک مٹھاس اور انتشار میں ایک لذّت تھی۔چند لمحوں میں اسے نیند لگ گئی۔یہ بہت مختصر نیند کا جھونکا تھا مگر اس چھوٹے سے وقفے میں اس نے ایک طویل خواب دیکھا۔ایک خواب جس میں کئی برسوں کا افسانہ قید تھا۔ایسا افسانہ جس میں سکینہ کی زندگی محور تھی اور اس محور پر عبدالعزیز کا سایہ تھا۔اس نے خود کو اسکول کے لباس میں نیلگوں جنگل میں گم ہوتے محسوس کیا۔وہ راستہ بھول گئی۔سارا جنگل مہیب شکلیں بنا کر اسے نگلنے کے لئے اس کی

طرف سائیں سائیں کرتا بڑھنے لگا۔ ابھی وہ اسے پکڑنے میں کامیاب ہوتا کہ عبدالعزیز کا ہاتھ اسے تھام لیتا ہے۔ اور دوسرے ہی لمحے وہ گانو کے قریب سے بہنے والی ندی کے کنارے کاغذ کی کشتیاں بنا رہی ہوتی ہے کہ ندی میں سیلاب آجاتا ہے۔ وہ پانی کی سطح پر بہہ کر بہت دور نکل جاتی ہے۔ ندی کے اندر سے آدم قد سبز رنگ کے گلپھڑوں والی مچھلیاں اس کی طرف بڑھتی ہیں۔ وہ چیخ و پکار کرتی ہے۔ ڈوبنے لگتی ہے۔ اب صرف اس کے چہرے کا نصف حصّہ پانی کے باہر ہے۔ کہ وہ دیکھتی ہے ایک ہاتھ اسے کھینچ کر اپنی کشتی میں لے لیتا ہے۔ یہ ایک سرمئی رنگ کی کشتی تھی جس کے بادبان گہرے جامنی رنگ کے تھے۔ جس کے اندرونی حصّے میں گہرے قرمزی سفید اور سبز ریشمی رنگ کے کاغذ سے نقش و نگار بنے تھے۔ اسے عبدالعزیز کا چہرہ نظر نہیں آیا مگر اسے پتہ ہے کہ یہ عبدالعزیز ہی ہے۔ ندی کی سطح سنہری رنگ میں بدل جاتی ہے۔ ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہے اور اسے گل مہر کا شرابی رنگ گلدستہ دیتا ہے۔ وہ جانتی ہے یہ ہاتھ کس کا ہے۔ وہ پلکیں جھپکاتی ہے اور وہ ہاتھ غائب ہو جاتا ہے۔ پھر وہ دیکھتی ہے۔ آسمان پر ہنس ایک مخصوص دائرے میں رقص کر رہے ہیں۔ یکا یک ان کا رنگ بدل کر نیم گلابی ہو جاتا ہے۔ پل بھر میں وہ سب بھی تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اور اس پر آسمان سے گلابی رنگ کی بارش ہونے لگتی ہے۔

جب گلابی رنگ کی بارش کا منظر ختم ہوتا ہے، تو وہ خود کو مخمل کے بستر پر لیٹی ہوئی دیکھتی ہے۔ کہ وہ محو خواب ہے اور اس خواب میں اسے پتہ ہے کہ وہ سنہری رنگ کے مخمل پر سو رہی ہے۔ (خوابوں اور محبت میں شعور اور منطق کی گنجائش کہاں ہوتی ہے) مگر اسے یہ پتہ نہیں ہے کہ اس شبستاں کے باہر مزید دیواریں ہیں اور وہ باہر کی خوبصورتی کو دیکھنے سے محروم ہے۔ وہ خواب میں یہ دیکھتی ہے کہ وہ نیند میں بیدار ہوتی ہے اور اس کمرے کے باہر کا نظارہ کرنا چاہتی ہے۔ وہ دروازے کی طرف

بڑھتی ہے۔ دروازے پر ایک پہرے دار ہے جس کی داڑھی اس کی ناف تک بڑھی ہوئی تھی، پر اسے نظر نہیں آئی۔۔۔اور سر پر عجیب قسم کی ایک پگڑی تھی۔ کمر پر دو دھاری تلوار بندھی ہوئی تھی جس پر فارسی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ سکینہ حروف ملا کر پڑھنے لگتی ہے۔ پڑھ بھی لیتی ہے مگر سمجھنے سے قاصر ہے۔ دو تین بار اس نے اسے دوہرایا۔ پھر بلند آواز میں پڑھا۔

اگر فانیم چست ایں شور ہستی
وگر باقیم ازچہ فانیستم من

پہرے دار نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ جوں ہی سکینہ کی نظریں اس سے ملتی ہیں۔ پہلے تو اسے لگتا ہے یہ اورنگ زیب ہے۔ کیوں کہ طالب علم کے زمانے میں اس نے اسکول میں ایک ڈرامہ دیکھا تھا جس میں اورنگ زیب کے کردار کو ایسے ہی لباس میں پیش کیا گیا تھا۔ پھر اس نے چہرے کو بہ غور دیکھا۔ اس کی غلط فہمی پلک جھپکتے ہی دور ہو گئی۔ اسے یقین ہو گیا وہ دربان نہیں بلکہ اس کا شوہر مجاور حسین ہے۔

اس سے پہلے کے خواب کی اس طلسمی فضا میں ماجرا کروٹ لیتا اس کی آنکھ کھل گئی۔ دراصل دروازے پر مجاور حسین دستک دے رہے تھے۔ وہ اٹھی اور فوراً دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

ہفتے بھر عبدالعزیز نے خود کو مختلف کاموں میں مصروف رکھا۔ نصاب کی کتابوں سے ریاضی کی گتھیاں سلجھانے میں اپنے ذہن کو لگا رکھا۔ چھٹی کے وقت امرائی میں چلا جاتا اور فصیل پر اُگی جنگلی گھاس پوس کو کاٹتا۔ ہاپوس، پائری اور رتنو آم کے پیڑوں کو پانی دیتا۔ بکھرے پتوں کو جمع کر کے ایک گڑھے میں ڈالتا۔ آس پاس سے گزرنے والے لوگوں سے بلا وجہ باتیں کرتا۔

وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ یوں خود کو مصروف کر لینے سے سکینہ کی یاد کم ہو جائے گی۔ وہ ایک لمحہ جس کی آنچ نے اس کے اندر خوابیدہ گرم لہر کو متحرک کر دیا تھا وہ اس لمحے کی یاد سے نکلنا چاہتا تھا۔ وہ بھولنا چاہتا تھا کہ سکینہ نے اس کے بدن پر اپنی انگلیوں سے ایک نقش بنا دیا ہے جس سے دل پر ایک الہامی سرور پھیل گیا ہے۔ وہ سب کچھ بھولنا چاہتا تھا۔ مگر جس قدر اس نے سکینہ کو یاد نہ کرنے کی کوشش کی سکینہ کی یادیں اس کے دل میں گہرائی تک اتر گیئں۔

ہر شب، جب وہ دن بھر کی مصروفیت کے بعد بستر پر دراز ہوتا اس کا بدن سکینہ کے قرب کے لئے اسے پیاسا جان پڑتا۔ اس کی آنکھیں اس سے تقاضا کرتیں۔ ''ہم سکینہ کے دیدار سے محروم نہ ہوں۔'' اس کی انگلیاں اس سے پوچھتیں۔ ''ہم کب سکینہ کی انگلیوں میں خود کو سموئیں گے؟''! اس کے لب اس سے روٹھ جاتے اور کہتے۔ ''ہمارا آب حیات تو سکینہ کے لب ہیں۔'' اس کا پورا جسم اس کے سامنے فریادی بن جاتا اور پھر اس کی ہمت ٹوٹ جاتی۔ وہ اپنے دل کی دھڑکن سنتا جس کا ایک ہی ترانہ تھا۔ سکینہ سکینہ سکینہ۔

ایک رات تو اسے اپنی دھڑکن پر عجیب سا شبہ ہوا۔ اس نے سانسوں کو تھام کر سننا چاہا۔ دھک دھک......کا ردھم اسے سکینہ سکینہ سکینہ سنائی دیا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ وہ کوشش کر کے بھی اس ردھم کو بدل نہ پائے گا۔ اس کی انگلیوں نے تکیے پر ہزار بار سکینہ لکھا۔ جسے اس کے علاوہ کوئی اور پڑھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے گھر کی دیوار، دروازوں، آنگن کے پیڑوں اور گھر سے اسکول کے درمیان راستے میں پڑنے والے پتھروں پر اس کا نام لکھا۔ وہ صرف اپنی انگلیاں پھیرتا اور اس کی آنکھیں اس نام کو نیلی ،گلابی اور گیندے کے پھول کے رنگوں میں محسوس کرتیں۔ جنھیں اس کے علاوہ دوسرا کوئی اور پڑھ سکتا تھا تو وہ تھی شگفتہ!!!

پھر وہ جب ان مقامات کے پاس سے گزرتا۔ یہ نام انہی رنگوں کے ساتھ دوبارہ اسے دکھائی دیتے۔اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ سی ابھر آتی۔مئی کی چھٹیوں کے بعد اسکول کا تیسرا دن تھا۔کلاس ٹیچر نے چھٹیوں کے دوران اگلی جماعت کی کتابوں کی بعض مشق حل کرنے کے لیے دی تھیں۔انھیں چیک کرنے کے بعد وہ طلبہ کو تختہ سیاہ پر حل کرنے کے لئے بلا رہے تھے تا کہ بچوں میں خود اعتمادی کا وہ احتساب کر سکیں۔ جب استاد نے عبدالعزیز کو بلایا تو وہ یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ...... جب کمرہ جماعت میں کوئی نہ تھا اس وقت جن جگہوں پر اس نے سکینہ کے نام کے حروف لکھے تھے وہ سب مختلف رنگوں میں جھلملا رہے ہیں۔

وہ چوک ہاتھ میں لئے گونگا بنا کھڑا رہا۔سفید چوک کا ٹکڑا اس کی انگلیوں میں کرُ کرُا کر ذرات میں بدل گیا۔اس کے پیر کانپنے لگے۔اس کی آنکھیں سکینہ کے نام کے حروف کی روشنی سے چندھیا گئی تھیں۔وہ خاموش رہا۔ٹیچر کو لگا اسے مشق حل کرنا نہیں آ رہی ہے۔اسے غصہ آیا اور اس نے عبدالعزیز کی پیٹ پر چھڑی برسا دی۔

اس کی زبان پر قفل لگ گیا تھا۔ساری کلاس اس کی بھوندی صورت پر ہنستی رہی۔ لیکن اسے اس دن کسی کی ہنسی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بلکہ اس کے دل کی دھڑکن کی بجائے اسے صرف سکینہ سکینہ سکینہ کی موسیقی سنائی دے رہی تھی۔

﴿ ۷ ﴾

جون کے ابتدائی دن تھے۔آسمان پر بادلوں کے سیاہ بھور ٹکڑے منڈلانے لگے تھے جس شام عبدالعزیز اس سے ملنے گیا تھا اور اس کی زبان سے جس بے تعلقی کے ساتھ ''کچھ نہیں۔تو چلے جا'' ادا ہوا تھا اس دن کے بعد سے سکینہ نے عبدالعزیز کو ارد گرد کے مکانوں کے لڑکوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔(ورنہ عام طور پر وہ دن بھر میں ایک آدھ بار نظر آ ہی جاتا تھا۔)

اس کے مکان کے سامنے لڑکے لگور چہ کھیلتے ہوئے، شور مچاتے ہوئے دکھائی دیتے تو اس سے رہا نہ جاتا۔ اس کے قدم اسے کھینچ کر آنگن میں لے جاتے۔ کبھی وہ رسیوں پر سوکھنے کے لئے پھیلائے ہوئے کپڑوں کو جمع کرنے لگ جاتی، کبھی چوزوں کو بھگاتی، کبھی پیپل کے بکھرے پتوں کو جھاڑ و دیتی۔ یہ سارے کام وہ آہستہ آہستہ کیا کرتی۔ اسے ایسا لگتا عبدالعزیز جہاں کہیں بھی ہوگا، وہاں وارد ہو جا آے گا۔

سارے بہانوں میں بہت سارا وقت کاٹنے کے باوجود جب اسے وہ نظر نہ آتا تو وہ دل مسوس کر رہ جاتی۔ اسے ایک نظر دیکھنے کی خواہش اس کے اندر پیدا ہوگئی تھی۔ وہ جھلاّ کر وٹے دار میں چلی جاتی اور دروازے سے لگ کر کھیل میں مگن بچوں کو دیکھا کرتی۔ چند ایک بار یوں بھی ہوا کہ اس نے تخیل کی نیرنگی میں ان لڑکوں کے ساتھ عبدالعزیز کو بھی وہاں کھیلتے ہوئے محسوس کیا۔ لیکن وہ کھیل میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ سکینہ کی جانب نہ دیکھتا۔ سکینہ جانتی تھی کہ وہ شرمانے لگا ہے۔ وہ اس سے بے پناہ محبت کرنے لگا ہے۔ اسی لئے وہ اس سے نظریں چرا رہا ہے۔ اگر ایک بار اس کی نظریں ٹکرائیں گی تو وہ پتھر کی مورت میں بدل جائے گا اور اسے دیکھتا رہ جائے گا۔ سکینہ اسے دوڑتے ہوئے، لگورچے پر نشانہ لگاتے ہوئے، گیند پھینکتے ہوئے دیکھتی۔ جب وہ ایک قدم آگے بڑھا کر، دائیں ہاتھ میں گیند مضبوطی سے پکڑ کر لگورچے پر نشانہ باندھتا تو سکینہ کو ایسا لگتا وہ لگورچے کی بیلٹی پر نہیں بلکہ اس کے دل پر نشانہ باندھ رہا ہے۔

جوں ہی گیند لگورچے سے ٹکراتی اور بیلٹیوں کا مینار بکھر جاتا اس کی تخیّل کی دنیا بھی بکھر جاتی۔

سیدھا ایک تیر اس کے دل میں آ کر پیوست ہو جاتا۔ اس کا دل دوبارہ اس اتھل پتھل کو محسوس کرتا جو عبدالعزیز کے تیر کے سیدھے نشانے پر لگنے سے اس نے اس

رات محسوس کیا تھا۔ جب وہ برسوں سے پوشیدہ جذبے کے انتشار میں بہہ گئی تھی۔ وہ ندی کی طغیانی میں بدل گئی تھی، موسلا دھار بارش سے شرابور ہو گئی تھی۔ خواہش اور جسارت خواہش کے ہیجان میں گرفتار ہو گئی تھی۔

ایسے لمحوں وہ خود کو زیادہ باحوصلہ اور دلیر محسوس کرتی۔ پیار کی اس رات کے سبب اس کے اندر ندامت اور گناہ کی جو خلیج پیدا ہوئی تھی وہ بھر جاتی اور وہ چاہتی ہزار راتوں سے طویل رات میں وہ عبدالعزیز کو پیار کرے۔ جس کی کوئی انتہا نہ ہو۔ وہ عبدالعزیز کو اپنی چھاتی سے لگا کر اسے پیار کرے جس میں ماں کی ممتا کا ایک رنگ بھی ہو، عشق کی خواہش وحشیانہ بھی ہو اور لذت گناہ کا ایک دبتا ہوا ہی سہی احساس جمال بھی ہو۔ عبدالعزیز نے اس کے اندر مدفون ان تمام جذبات کو بیدار کر دیا تھا جو اس کی تکمیل کے لئے لازمی تھے مگر کئی برسوں کی یک رنگی کے سبب دب سے گئے تھے۔ وہ ایک مکمل عورت کی روح لے کر پیدا ہوئی تھی مگر زندگی کی بساط اتنی وسیع نہ تھی کہ وہ اپنی شخصیت کے سارے پہلوؤں کو جی پاتی۔ اس کے اندر ایک نیم وحشی عشق ہمیشہ موجود تھا جو سماجی اور خانگی وجوہات کی بناء پر نفس کی جھیل میں ڈوبا ہوا تھا۔ عبدالعزیز نے غرق شدہ عشق کو دوبارہ روح کی سطح پر کھینچ لایا تھا۔ اس عمل میں عبدالعزیز کے بدن کی کشش سے زیادہ اس کی معصومیت اور سکینہ کے تحت اس کا اعتقاد تھا۔ سکینہ جانتی تھی عبدالعزیز اس کو بے حد پسند کرتا ہے اور اس سے باتیں کرنے کے لئے کئی دفعہ بہانے بنا کر وہ اس سے ملنے آجاتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ عبدالعزیز بڑی حیرانی سے اس کے چہرے کو ہمیشہ دیکھا کرتا تھا۔۔۔شاید یہ انکور تھا جو ابھی شاخ دل پر پوری طرح سے نکلا نہ تھا۔

شروع شروع میں اسے یوں لگا تھا کہ چند روز میں عبدالعزیز دوبارہ اس سے ملاقات کے لیے آئے گا مگر جب دس بارہ روز گذر گئے تو اسے تشویش ہونے لگی۔ ڈر تو یہ بھی اس کے دل میں کروٹ لینے لگا تھا کہ کہیں وہ راز عشق، جس کی ابتدا ہی بدن کی

شمولیت سے ہوئی تھی۔۔۔۔اسے کسی پر افشاں نہ کر دے......عشق کی انتہا بدن ہے ،لیکن اس عشق کی ابتداء اس کی انتہا سے ہوئی تھی۔

دونوں اپنی اپنی دنیاؤں میں مصروف مگر ایک دوسرے کے خیال میں غرق تھے۔ دونوں کو یہ غلط فہمی تھی کہ جس حالت انتظار اور خواہش دیدار میں وہ مبتلا ہیں، شاید دوسرے کی وہ کیفیت نہیں ہے۔ دونوں کو رہ رہ کر یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ ان کی عمر اور ہئیت میں کس قدر تفاوت ہے۔ دونوں کو یہ بدگمانی تھی کہ اب وہ ایک دوسرے سے محو کلام نہ ہوں گے، دونوں کو یہ ڈر تھا کہ وہ ایک دوسرے کو ناپسند کرنے لگے ہوں گے۔ دونوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ دونوں دوری کے باعث ایک دوسرے کو بری طرح سے مِس کرنے لگے ہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے کی یادِ تنہائی کے بھنور میں ڈبو چکی تھی۔

ایک طرف سکینہ کو یہ بات بھی چند روز آگ کی طرح کھاتی رہی کہ اس سے گناہ ہوا ہے۔ اس نے شیطان کے بہکاوے میں آ کر دنیا کا سب سے برا کام کیا ہے۔ اسے خدا کبھی معاف نہیں کرے گا۔ جبکہ عبدالعزیز کی روح اس نشے کی ترنگ میں مسرور تھی۔ اس کا بدن اس امرت سے ایک نئی تازگی محسوس کرنے لگا تھا۔

لیکن جب سکینہ کے دل کی کایا کلپ ہوئی اور عبدالعزیز کی عدم موجودگی اسے بے قرار کرنے لگی تو اس نے یہ تسلیم کر لیا کہ وہ سارے خوب رو چہرے اور ابدان جو اس کی نوجوانی سے اس کی یادداشت میں اپنے لئے جگہ بنائے ہوئے تھے۔ اس کے خوابوں میں آ کر اس سے وفا کا وعدہ کرتے تھے، وہ سب چہرے عبدالعزیز کے معصوم چہرے کے نیچے ہمیشہ ہمیش کے لئے دفن ہونے والے ہیں۔ اسے یہ احساس تو تھا ہی کہ بہت جلد عبدالعزیز کا قد اور نکلے گا...... بدن تواں ہو جائیگا۔ اس نے خود کو عبدالعزیز کی بانہوں میں تصور کرنا شروع کر دیا۔ اس کے مضبوط بازؤں میں اس کے لئے راحت اور تکمیل کے خواب تھے۔ اس کی چھاتی پر سر رکھ کر گھنٹوں محبت کی گفتگو میں خود کو

مدہوش تصور کرنے لگی تھی۔

ان خیالات نے اس کے احساس گناہ کو کم کر دیا اور ایک مدار پر آ کر اس نے خود سے کہا...... ''مجھے بدن اور روح کا سکھ ساتھ ساتھ چاہیے، جہاں روح خوش نہ ہو وہاں بدن ہمیشہ ناخوش رہے گا اور جہاں بدن خوش نہ ہو وہاں روح کبھی خوش نہ رہ پائے گی۔''

باب سوم

کہ زیرِ سنگ خنک پانیوں کا چشمہ تھا

''میں تیرے بچّے کی ماں بننے والی ہوں!''

جون کا آخری ہفتہ تھا۔ دو روز سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ جو لوگ چاول اور ناچنے کی کھیتی کیا کرتے تھے وہ گھونگڑی اوڑھے گاؤں کی سرحد سے لگے کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ سکینہ کا شوہر چاول کے کھیت کے پاس مزدوروں کے ساتھ کسی کام میں مصروف تھا۔ سکینہ رائیول آم کے ایک پیڑ کے نیچے کھڑی تھی۔ اس کے پاس پیلے رنگ کی چھتری تھی مگر آج وہ بارش کی دھار میں اپنے تن کے ہر ریشے کو بھیگتا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔

بارش اس قدر تیز تھی کے ارد گرد کے پیڑ اور کھیت نگاہوں سے اوجھل لگتے تھے۔ دور کھیتوں میں کام کرتے ہوئے لوگ دھندلے آئنے میں نظر آنے والے غیر واضح عکس

کی طرح لگتے تھے۔ بارش کے شور میں کھیتوں میں عورتوں کے گیت۔۔۔ منجمد ہوکر بوندوں کے ساتھ زمین پر برس رہے تھے۔کل یہی گیت، پکی ہوئی چاول کی فصل کے روپ میں لہرائیں گے۔ چندروز زیادہ گذر گئے تھے۔

پندرہ سال کی عمر سے پورے چاند کی راتوں میں ایک تشنج سکینہ کی نسائیت کا اعلانیہ بن کراس کی پنڈلیوں میں شدید درد جگا تا رہا۔ اب وہ نئ زندگی کا اظہار بن گیا تھا۔ شادی کے بعد اسے یقین تھا کہ چند مہینوں میں ہی اس کی کوکھ زندگی کی بوندوں کو جذب کرے گی اور اس کا بدن چاول کے کھیت کی طرح لہلہانے لگے گا۔ ہرا بھرا ہو جائے گا۔اس کے چہرے پر حیا کے نقوش ابھریں گے۔ چھوئی موئی کی طرح لجا کر وہ مجاور حسین کو یہ راز بتائے گی۔ وہ خوشی سے اسے اپنی بانہوں میں بھر کراس کی پیشانی چوم لیں گے۔

لیکن ایسانہ ہوا......

اس کی مایوسی دن بدن، مہینہ در مہینہ، سال بہ سال، بڑھتی گئی یہاں تک کے وہ اپنی کوکھ کی ویرانی سے بدظن ہوگئی۔ اپنے شوہر کے رویے سے مرجھا گئی۔ اسے اپنے مکمل ہونے پر ہی شبہ ہونے لگا۔ ہر ماہ وہ ایک کرب سے گذرتی تھی۔۔۔ ہر بار وہ امید کی شمع لئے دھیرے دھیرے چلتی ،آہستہ سے پانی کے بھرے ہوئے ہنڈے اٹھاتی ،برتنوں کی ٹوکری اٹھاتی ،آہستہ سے بسنے پر بیٹھتی۔ اپنے طور پر یوں احتیاط کرتی گویا اس کا حمل ٹھہر گیا ہے۔ وہ یہ بھی بھول جاتی یہ تدابیر بعد کے لئے ہوتی ہیں۔

اس کے باوجود وہ تشنج خون کی گاڑھی لکیر بن کر اس کی ایک آنکھ سے رستا۔ وہ افسردہ ہوکر پرانی ساڑی کے کپڑوں کے تختے بنانے بیٹھ جاتی۔ اس وقت اس کی دوسری آنکھ سے آنسوؤں کی ایک قطار شروع ہوجاتی جس میں اس کے دل کا نور بھی بہتا رہتا۔ جب آنسوؤں کا کنواں سوکھ گیا تو اس کی آنکھوں میں برف باری کا آغاز

ہوا۔اس برف باری سے اس کی روح کے شیشے دھندلا گئے اور بہت ساری قریب کی چیزیں بھی اسے غیر واضح دکھائی دینے لگیں۔سب سے پہلی قریبی شئے جو اس کی آنکھ کے رقبے سے اوجھل ہوئی۔وہ تھی......مجاور حسین۔

مزید تین سال وہ تنہائی کے کھنڈر میں رہی۔نو خیزی اور نسائی افتخار جو اس کی شخصیت کی پہچان تھا اس کھنڈر کی تاریکی میں......وہ کھو بیٹھی۔اب وہ سلسلۂ روز و شب کا ایک ورق تھی۔ جہاں نئی عبارت ،نئی کہانی ، نئے قصے کا امکان معدوم ہو گیا تھا۔ وہ اپنی ذات سے منقطع تھی۔اب وہ بچّوں کو کھیلتا ہوا دیکھ، پرندوں کو اپنے بچّوں کے ساتھ اڑتا ہوا دیکھ، بڑے پیڑوں کی چھاؤں میں چھوٹے پودوں کو اگتا ہوا دیکھ......مزید رنجیدہ ہو جاتی۔اسے یوں لگتا کائنات کی ہر شئے اس کا مذاق اڑاتی ہے۔

عمر رسیدہ عورتوں کی نظریں جس انداز میں اس کے بدن کا مشاہدہ کرتیں۔ پڑوس کے مرد اپنے بچّوں کو ڈانٹتے ہوئے جب اسے دیکھتے تو جس انداز میں چپ ہو جاتے۔ اس کی سہیلیاں جس طرح اپنے کلکاریاں بھرتے بچوں کو گود میں لئے اترایا کرتیں۔ حتّٰی کہ پرانے کپڑوں کے تبادلے میں برتن اور کھلونے دینے والی گھاٹن۔۔جس پیرائے میں اس کے دروازے پر دستک دینے سے پہلے ننھے بچّوں کے کھلونوں کو برتنوں کے نیچے چھپا دیتی۔سب اس کی تنہائی میں اضافہ کرتے۔ یہی تنہائی اس کی ذات سے اسے بے ربط کئے دیتی تھی۔

اس ماہ بھی سکینہ نے حسب عادت پرانے کپڑے کا تختہ بنایا اور تشنج کی لہروں کا انتظار کرنے لگی لیکن اس بار فطرت اس کے بدن کی پکار سن چکی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس بیٹھی رہتی جہاں سے عام راستہ تھا، وہ گذشتہ چار مہینوں سے اسی کھڑکی کے پاس زیادہ وقت بتاتی رہی ہے۔اس امید کے ساتھ کہ اسکول سے لوٹتے ہوئے

شاید عبدالعزیز اسے نظر آ جائے۔

جب انتظار کر کے وہ تھک گئی تو اسے عجیب سا لگنے لگا۔اس کے دل میں ایک عجیب موسیقی بجنے لگی۔اتنے برسوں کی محرومی سے اس کا دل سوکھے ہوئے پیڑ کی طرح بے رنگ ہو گیا تھا۔اسے ہرگز یقین نہ تھا کہ ایک رات کی رم جھم سے چھ سال نو مہینوں اور بارہ دنوں سے بنجر زمین پر ایک تخم زندگی کا خواب دیکھے گا۔

اب اس کا انتظار ......اضطراب، لایقینی، تشکیک اور آرزو کا کولاج بن گیا۔اس غیر یقینی کے دھنک رنگوں کے پیچھے سورج بن کر عبدالعزیز اس کی روح میں روشن ہو گیا۔وہ گھنٹوں کھڑکی کے پاس بیٹھی رہتی کہ وہ وہاں سے گزرے گا۔۔وہ ایک پل کے لئے ہی سہی اس کا دیدار کرنا چاہتی تھی......'اگر یہ چند روز اور اسی طرح گزر گئے تو مجھے یقین ہو جائے گا۔۔میرے بدن میں عزیز کی معصومیت ایک نیا روپ لے چکی ہے''ایک بار اس نے خود سے کہا تھا۔

''میں تیرے بچّے کی ماں بننے والی ہوں''

عبدالعزیز نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔اسے ایسا لگا کہ وہ سکینہ کے سامنے بہت دیر سے کھڑا تھا اور اس دوران اس کا شوہر کھیت سے نکل کر اس کی پشت پر آ کھڑا ہے۔

اس دوران بارش بھی تیز ہو گئی تھی۔دور کھیت میں جو لوگ کام کر رہے تھے وہ مدھم چاندنی رات میں کھڑے بجوکا سے لگ رہے تھے۔

عبدالعزیز نے سکینہ کے چہرے پر نظریں مرکوز کیں۔سکینہ کے سر پر آم کے پیڑ کی شاخوں اور پتّوں سے رہ رہ کر پانی کے قطرے گر رہے تھے۔اس کی پیشانی سے پانی کی لکیریں بہہ کر اس کے پورے بدن کو مزید بھگائے جا رہی تھیں۔جب اس نے یہ جملہ ادا کیا تھا اس وقت اس کے ہونٹوں کے وا ہونے کے ساتھ ہی نیم گرم دھواں اس

کے بدن کی بھٹی سے آزاد ہوا تھا۔ جواب دائروں میں منقسم ہوکر پھیلنے کی بجائے سیدھے اوپر اٹھ کر آم کی ٹہنیوں کے درمیان معلق ہے۔ اس کی آنکھیں سکینہ کی نگاہوں میں اپنا عکس دیکھ رہی تھیں۔

جب دوسری بار سکینہ کے لب کھلے اور وہی جملہ اس نے عبدالعزیز کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تب اسے یقین ہوا کہ یہ بات اسی سے کہی جارہی ہے۔ اوراردگرد کوئی نہیں ہے۔ وہ لمحے بھر کو ساکت رہا۔ اس کے دل میں جو ہوا کا حلقہ پھنسا ہوا تھا وہ وہیں منجمد ہوگیا۔ سکینہ نے پلکیں جھپکائیں تو عبدسالعزیز نے دیکھا اس کا عکس بھی بند آنکھوں کے ساتھ اس کے دیدوں میں قید ہوگیا ہے۔

سکینہ نے جب آنکھیں دوبارہ کھولیں تو عبدالعزیز کو اس کے دیدوں میں اپنا عکس نظر نہیں آیا۔ وہ جان گیا۔ عکس، سکینہ کی آنکھوں سے اتر کر اس کے سارے شریر میں تحلیل ہو چکا ہے۔ اس کے دیدے کاجل کی طرح سیاہ بھور تھے۔ پلکوں پر کاجل پھیل گیا تھا۔ اوپری ہونٹ پر پانی کے چند باریک قطرے ٹھہر گئے تھے۔

''یوں نہ دیکھ......'' سکینہ نے آہستہ سے کہا۔

عبدالعزیز کی نظریں اس کے چہرے سے اترنے لگیں۔ جب اس کی آنکھیں سکینہ کے شکم پر ٹھہریں تو سکینہ کے سینے میں دھڑکن تیز ہوگئی۔ آج اس نے سبز اور جامنی رنگ کی ساڑی پہنی تھی جس پر زرد رنگ کے پھول کاڑھے ہوئے تھے۔ ساڑی کا کنارہ شادابی رنگ کا تھا۔

لمحے بھر کو سکینہ بے زبان ہوگئی۔ اس بے زبانی میں ایک کیف تھا جسے بارش نے ایک اضافی ترنگ میں بدل دیا تھا۔ یہ ترنگ ہی تو محبت کا وہ سرور ہے جسے اس نے آج سے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اس سرور میں وجدان پر ایک سحر طاری ہوجاتا ہے اور آدمی ساری موجود چیزوں سے ماورا ہوجاتا ہے۔

یہ بیگانگی ذات کو محور اور اساس عطا کرتی ہے۔ آج وہ اپنے بدن کے اندر اپنی ترنگ میں سرشار تھی۔ عبدالعزیز کی نگاہوں کا لمس اس کے بدن کے جس حصے سے گزرتا۔۔۔ وہاں وہاں وہ ارتعاش سا محسوس کرتی۔ بارش نے اس ارتعاش میں ایک رنگ اور شامل کر دیا تھا۔ جو فطرت کے مظاہر سے علیحدہ ہو کر محبت کے جذبے کو تقویت پہنچا رہا تھا۔ فطرت کا محبت سے ابدی رشتہ ہے۔ کائنات کی ہر شئے محبت کرنے والوں کو ہم نفس و ہم جان کرنے کے لئے جواز بننا چاہتی ہے۔ آج ہر شئے سکینہ کے دل کے ترانے کے ساتھ ہم آہنگ ہوگئی تھی۔

عبدالعزیز ایک قدم آگے بڑھا اور اس نے اپنا دایاں ہاتھ اسے بتایا۔ سکینہ نے اس کے ہاتھ کو دیکھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ عبدالعزیز کی ہتھیلی پر سرخ اور نیلی سیاہی سے چھوٹے چھوٹے حروف میں سکینہ سکینہ سکینہ۔۔۔۔ لکھا ہوا تھا۔ گھنٹوں اس کا جسم بارش میں بھیگ چکا تھا اور اسی سبب ہتھیلی پر لکھے گئے حروف کی سیاہی پھیل گئی تھی اور یوں لگتا تھا وہ نام نہیں بلکہ مینا کاری کا کوئی نمونہ ہے۔ سکینہ نے ہتھیلی پر سے نظریں اٹھائی تو عبدالعزیز نے کہا۔ ''آپ کو یوں نہ دیکھوں۔۔۔۔ تو کسے دیکھوں۔۔؟''

سکینہ نے اس کی ہتھیلی کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''آپ کو دیکھنے کے لئے اتنے دنوں سے تڑپتا رہا ہوں۔۔''

''تجھے میرے گھر آنا چاہئے تھا۔''

''آپ نے اس روز کس بے رحمی سے مجھے جانے کے لئے کہا تھا۔''

''میں بہت پریشان تھی۔۔ مجھے خود پر یقین نہ تھا۔''

''پر مجھے تو یوں لگا۔ آپ مجھ سے ملنا نہیں چاہتیں۔''

''نہیں چاہتی تھی۔۔۔ مگر اس کے باوجود روزانہ ترا راستہ دیکھا کرتی تھی۔''

''پر مجھے تو ایسا لگا۔ آپ میری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتیں۔''
''آنکھوں میں تیری تصویر لئے تجھے ہر طرف تلاش کر رہی تھی۔''
''جھوٹ جھوٹ جھوٹ !! آپ نے پیغام کیوں نہیں بھیجا۔''
''میرے من میں ڈر تھا۔''
''ڈر میرے من میں بھی تھا۔ مجھے لگا آپ مجھ سے کبھی بات نہیں کروگی۔''
''سکینہ آ...... (سکینہ مسکرائی......وہ ٹھہر گیا)
''اب مجھے سکینہ آپا مت بول......'' (وہ بھی مسکرایا)

اوراس کی مسکراہٹ کے ساتھ وہ ڈرامائی مکالمہ ختم ہوگیا۔ جو ہمیشہ محبت کرنے والوں کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ جو ہمیشہ بناوٹی اور غیر حقیقی لگتا ہے۔ باوجود اس کے ہر محبت میں اس کے لئے ایک مرحلہ ہوتا ہے اور وہ واقع ہوتا ہے۔

۲

''آپ کو ایسا کہنا چاہئے تھا کہ آپ مجھ سے پیار کرتی ہو۔ ایسا کیوں کہا کہ میں تیرے بچّے کی ماں بننے والی ہوں۔''

آم کے پیڑ کے پیچھے چند کھیتوں کے بعد ایک اترن تھی جو دس پندرہ منٹ کے پیدل فاصلے پر ایک چھوٹی سی برساتی ندی پر ختم ہوتی تھی۔ ندی کے اس پار گھنا جنگل تھا۔ پگڈنڈی، گدگدا گئی تھی اس لئے وہ دونوں ہرلے کے مٹیالے پانی کے اندر سے جلدی جلدی چل کر ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ شمال کی جانب ندی پیڑوں اور بیلوں کی ایک بھول بھلیاں میں داخل ہوتی ہے۔ بارش کے سبب بیلیں زیادہ نکل آئی تھیں جن کے نیچے ہلکا اندھیرا تھا۔ عبدالعزیز جنگلی بیلوں کو ہٹاتا رہا اور وہ آگے بڑھتے رہے۔

''بس اس کے آگے مجھے ڈر لگتا ہے۔'' سکینہ نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

وہیں ایک بڑا سا پتھر تھا۔ دونوں اس پر بیٹھ گئے۔ تب یکا یک عبدالعزیز کو وہ پہلا

جملہ دوبارہ یاد آیا جسے سکینہ نے اس کے روبرو آتے ہی ادا کیا تھا۔ جو خیالات کی طغیانی اور برسات کے کیف کی وجہ سے اس کے ذہن میں اتر کر معنی کی لہر پیدا کرنے سے پہلے ہی ساکت ہو گیا تھا مگر اب جوں ہی وہ اس پتھر پر بیٹھا جس پر درختوں اور بیلوں سے ہو کر ہلکی ہلکی بوندیں گر رہی تھیں اسے یاد آیا۔ اسے ایسا لگا کہ سکینہ چوک گئی ہے وہ جو کہنا چاہتی تھی اس کے بجائے کچھ اور ہی اس کی زبان سے ادا ہوا ہے، تب اس نے کہا: ''آپ کو ایسا کہنا چاہئے تھا کہ آپ مجھ سے پیار کرتی ہیں۔ آپ نے ایسا کیوں کہا کہ ''میں تیرے بچّے کی ماں بننے والی ہوں' تجھے کیا لگا میں نے مذاق کیا ہے؟''

''ہاں! مجھے ایسا ہی لگا۔''

''تو پھر تو نظریں جھکا کر میرے پیٹ کو کیوں گھور رہا تھا۔''

''مجھے لگا ہو سکتا ہے آپ مجھے بڑا ابنا رہی ہیں...... میرا اوپٹ......''

''پھر کیا نظر آیا تجھے......''

''کچھ بھی تو نہیں۔ آپ کا پیٹ تو روز جیسا ہی ہے......''

''مطلب......؟''

''مطلب بچہ ہوتا ہے تو بڑا ہوتا ہے نا......؟''

سکینہ اس کے جواب کو سن کر مسکرائی۔ پھر اس کا کان کھینچ کر کہا۔ ''تو بہت چالاک ہے۔ سب سمجھتا ہے اور میں سمجھتی رہی تو ابھی بچّہ ہے۔''

بچّہ تو ہوں مگر اتنا تو سمجھتا ہی ہوں۔ سچ بتاؤ۔۔ آپ نے مجھے پوپٹ بنانے کے لئے ایسا کہا تھا نا؟

سکینہ نے اس کی پیشانی پر شفقت سے بوسہ لیا اور دھیمی آواز میں کہا...... 'ہاں......''

عبدالعزیز جھٹ سے کھڑا ہو گیا اور ندی میں اتر گیا۔ دونوں ہاتھوں سے سکینہ پر پانی اچھالنے لگا۔ سکینہ نے اسے چڑانے کے لئے کہا۔

پوپٹ...... پوپٹ...... پوپٹ

وہ پانی اچھالتا رہا۔

پوپٹ...... پوپٹ...... پوپٹ

وہ اور تیزی سے پانی اچھالنے لگا۔

☆

پھر سکینہ بھی ندی میں اتری اور اس پر پانی اچھالنے لگی۔ وہ ہنستے رہے، ہنستے رہے اور ایک دوسرے کے ساتھ مستی میں دیر تک کھیلتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ تھک گئے اور تھک کر ندی کنارے بیٹھ گئے۔ لمبی لمبی سانسوں سے ان کا سینہ پھول گیا تھا۔ وہ چپ چاپ جنگلی پودوں اور بیلوں کو برسات میں نہاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ جب ان کے دلوں کی دھڑکن کا شور کم ہوا تو ندی کے بہاؤ کا نغمہ انہیں سنائی دینے لگا۔ پیڑوں کی بھیگی شاخوں سے بوندوں کے ٹپکنے کی مدھم موسیقی ان کے کانوں میں اترنے لگی۔ درختوں پر برسنے والی برسات کی لڑی کا احساس ہونے لگا۔ تب سکینہ نے عبدالعزیز کو اپنے قریب کھینچا اور کہا۔۔۔ ''میں تیرے بچّے کی ماں بننے والی ہوں۔''

❦

برٹش ائیر ہوسٹیس نے جھک کر انتہائی نرم ملائم لہجے میں پوچھا۔ ''ایکس کیوز می ،ووڈ یو لائک ٹو ہیو سم ڈرنک......''

عبدالعزیز چونک کر خواب سے بیدار ہوا۔ حیرانی اور استعجاب کو چھپاتے ہوئے اس نے کہا۔۔ ''اے گلاس آف اورنج جوس۔''

کلائی پر بندھی گھڑی پر اس نے نظر دوڑائی۔ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ اس نے ہوائی جہاز کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ بادلوں کے ٹکڑے دور اور پاس چمک رہے تھے۔ سفید

چمکتے ہوئے کپاس کی طرح۔۔۔ہوائی جہاز بلند اونچائی پر تھا اس لئے نیلا موجیں مارتا ہوا بحرِ ہند نیند میں متحرک خواب کی طرح لہراتا دکھائی دے رہا تھا۔ البتہ آسمان صاف تھا۔

آسمان اور سمندر میں کون کس کا عکّاس ہے اس کا فیصلہ کرنا عبدالعزیز کے لئے مشکل تھا۔ بس ایک خیال اس کے دل میں پیدا ہوا۔ اتنی دوری کے باوجود دونوں ایک دوجے سے کس قدر مربوط ہیں۔ آسمان اور سمندر! گویا دونوں محبت میں گرفتار ہوں۔ ''سمندر سکینہ ہے اور آسمان !!'' وہ مسکرایا۔ ''کیسے بچّوں جیسے خیالات میرے دل میں آتے ہیں۔'' اس نے زیرلب کہا۔ اس کی نظریں سمندر کی اور خود بخود مڑ گئیں۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ لمحے بھر کے لئے وہ ''خیال مَست'' رہا۔

جوس کا گلاس اس کی فرنٹ ڈیکس پر رکھ کر ائیر ہوسٹیس آگے بڑھ گئی تھی۔ اس نے گلاس اٹھایا اور ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔ اس کے ذہن میں ایک ہلچل ہوئی اور یادداشت کی انگیٹھی سے ایک غبار اٹھ کر اس کی نظروں کے سامنے پھیل گیا۔ دور تک نیلگوں آسمان اور موجیں مارتا شور مچاتا ہوا بحرِ عرب کا ساحل تھا۔ جو اس کے گانو سے زیادہ دور نہ تھا۔

ساحل کے کنارے کنارے سرو اور ناریل کے باغات تھے۔ چند مقامات پر سپاری اور شالو کے پیڑ بھی کثرت سے دکھائی دیتے۔

سکینہ چوتھے مہینے میں قدم رکھ چکی تھی۔ گانو میں اس وقت اسپتال نہیں تھا۔ عام طور پر گھروں میں ہی زچگی کرائی جاتی تھی۔ مگر سکینہ کے والد بضد تھے کہ گوا گر کے سرکاری اسپتال میں اس کا نام درج کرایا جائے اور ہر مہینے ڈاکٹر آتمارام سے چیک اپ کرایا جائے۔ ڈاکٹر آتمارام ان کے پرانے ملنے والوں میں سے تھے۔

ان کی اہلیہ زندہ ہوتی تو انہیں فکر کی کیا ضرورت ہوتی۔ سکینہ کی شادی کے تیسرے

سال ہی دل کے دورے سے اس کا انتقال ہوگیا تھا۔ اور اب اتنے برسوں کے انتظار کے بعد ان کی اکلوتی بیٹی کی گود میں امید کی کلی کھلی ہوئی تھی۔ اس لئے بھی وہ بہت زیادہ فکر مند تھے۔

وہ جانتے تھے گانو میں جو زچگیاں گھروں میں ہوا کرتی ہیں ان میں بعض اوقات بڑی مشکلیں پیدا ہوتی ہیں۔ کبھی یوں بھی ہوا کہ زچہ خون کی کمی کا شکار ہو گئیں، کبھی دودھ بند ہو گیا۔ ایسے وقت بہت ساری جڑی بوٹیوں کے عرق نکالے جاتے جن پر امام صاحب سے قرآنی آیات کا دم بھی کیا جاتا۔

خدا ہی بہتر جانے۔۔ امام صاحب کن آیات کو پڑھا کرتے تھے۔

دوسرے گانوؤں میں چند برسوں بعد لوگ یہ جان کر حیران ہوئے تھے کی اتنے برسوں سے وہ جن حضرات کے پیچھے نماز ادا کرتے آئے ہیں وہ لوگ اصل میں امام تھے ہی نہیں بلکہ شمالی ہند کی ریاستوں سے بھاگے یا بھگائے ہوئے آوارہ منش تھے۔ ان میں دو لکھنؤ کے شیعہ شاعر تھے جو دعا و فاتحہ کے وقت انیس کے مرثیوں کے بند پڑھا کرتے تھے۔ اس وقت اہل کوکن کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ایک فرقہ ہے جو مذہب اسلام ہی کا ماننے والا۔۔۔ مگر سنّیوں سے مختلف ہے۔ جسے اہل تشیع کہا جاتا ہے۔ بیشتر سُنی گھرانوں میں بچوں کو اُن سے نفرت کرنے کا درس دیا جاتا ہے، انھیں بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ جہنمی ہیں۔ یہ وہ وقت تھا جب اہل کوکن کو قطعی علم نہ تھا کہ سنّیوں میں بھی دو بڑے گروہ وہابی اور بریلوی ہیں جنھیں یہ کہتے ہوئے پایا جاتا ہے۔ کہ ہم جنتی ہیں اور وہ دوزخی۔''

اس طرح کے تمام تفرقوں کی عدم موجودگی کے سبب ہی خطہ کوکن پُر امن تھا۔ کوئی مسلمان غریب تھا۔ (ابھی عرب ممالک کی دولت سے مالا مال نہیں ہوا تھا) مگر امن وسکون سے گھر مسجد کھیت اور جنگل میں وقت کاٹ کر اپنے آپ سے مطمئین تھا۔

ابھی کوکن کے بچوں کے دل شدت پسندی کی لہر سے کالے نہیں ہوئے تھے۔ وہ ہندو اور دلت دوستوں کے ساتھ اسکول میں بھائیوں کی طرح کھیلتے اور جھگڑتے۔ مراٹھی زبان ان کی اپنی زبان تھی۔ اردو کا چلن بھی راستہ بنا رہا تھا مگر ابھی یہ نعرہ بلند نہیں ہوا تھا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ کوکن کے لوگوں کا اردو سے کوئی تہذیبی یا ثقافتی رشتہ نہ تھا۔ یہ تو آگے چل کر مدرسوں کی افیون کو فروغ دینے اور طالبانی نظریات کی تبلیغ کرنے کے لئے اردو کو مذہب سے جوڑ دیا گیا۔ کوکن کو جو بڑے خسارے ہونے تھے اس کی نیو شمالی ہند کی لسانی جگالی اور مذہبی سیاست پر رکھی جا رہی ہے۔ یہ بات لوگوں کو معلوم نہ تھی۔

وہ تو ہندو ویدوں کی دی گئی جڑی بوٹیوں پر امام سے دم کر لیتے تھے۔ اگر ڈلیوری میں بچہ آڑا آجاتا تو گجانند ڈانگے کو بلایا جاتا۔ جو پیشے سے نائی تھا لیکن اطراف کے گانوں کے بچوں کی ختنہ کی ذمہ داری اسے وارثت میں ملی ہوئی تھی۔ اس کے والد تکارام ڈانگے کافی مشہور آدمی گزرے ہیں۔ ان کے متعلق ایک افواہ ہمیشہ پھیلی رہی کہ سعودی کے ایک بادشاہ کی ختنہ بھی انہوں نے ہی کی تھی جسے اس کے قبیلے کے نام 'سعود' سے پکارا جاتا تھا۔ یہ افواہ کس نے پھیلائی، یہ کبھی پتہ نہ چل سکا۔ تکارام ڈانگے نے اس بات سے انکار کیا۔ اس پر لوگوں کا کہنا تھا: ''یہ ان کی انکساری ہے۔''

گجانند ڈانگے کو وسترا چلانے میں مہارت تھی۔ بعض چشم دید گواہوں کا کہنا تھا کہ وہ بدن کی تمام رگوں کو سنسکرت ناموں سے جانتا ہے۔ خاص کر زیر ناف حصے کی تمام رگوں اور شریان کے فرائض اور اصولوں کو۔۔۔ شاید یہی وجہ تھی جن حضرات کو میدان عمل میں دشواری پیش آتی وہ اس سے اکیلے میں ملاقات کرتے۔ وہ دائیں ہاتھ کی نبض پر انگلیاں رکھ کر کچھ حساب کرتا۔ پھر مسئلے کی نوعیت پوچھتا۔ ایک ہفتہ بعد ایک بڑے ڈبے میں مربہ سی کوئی چیز کھانے دیتا اور کچھ ہدایت بھی کرتا۔ ہر مریض کو دی گئی ہدایت دوسرے

سے الگ ہوا کرتی۔ اس نے مریضوں کے نام ہمیشہ پردے میں رکھے۔ یہی اس کی سب سے بڑی خوبی تھی۔

دس برسوں بعد آمدورفت کے وسائل میں اضافہ ہوا تو گجانند ڈانگے بھی ایک روز اپنے کنبے کے ساتھ قسمت آزمانے نکل گیا۔ حیرت کی بات یہ کہ پھر وہ کبھی واپس نہیں آیا۔ البتہ جن کی زندگی میں ازدواجی خوشیاں دوبارہ لوٹ آئی تھیں وہ دل ہی دل اسے بہت یاد کیا کرتے۔ اس کا شکریہ ادا کیا کرتے۔

مزید پندرہ سولہ سال بعد جب بمبئی سے نکلنے والا ایک اردو روزنامہ 'اسلامی انقلاب کی چابی' سورل میں دستیاب ہونے لگا۔ اس وقت تک پرائمری اردو اسکول جونیئر کالج میں بدل گیا تھا۔ اسکول کے احاطے میں طلبہ اس اخبار کے صفحات پلٹتے رہتے۔ اس اخبار کو وہ کہتے 'اسلامی انقلاب کی نقلی چابی' اور خوب ہنستے۔

ایک روز اس اخبار میں۔۔۔ ''شولا پور کے بڑے حکیم صاحب بمبئی میں'' کے عنوان سے ایک اشتہار چھپا تھا۔ اس اشتہار میں ایک بزرگ آدمی کی تصویر بھی تھی۔ جس کے سر پر مولانا آزاد کی ٹوپی سے ملتی جلتی ٹوپی تھی۔ گانو کا ایک شخص جو اردو سے نابلد تھا وہ بھی وہیں کھڑا تھا۔ جب اس کی نظر اس اشتہار پر پڑی۔ اس نے فوراً پوچھا۔ ''ارے یہ فوٹو کس کا ہے؟ اس کی صورت تو گجانند جیسی لگتی ہے۔'' اردو کے ایک استاد کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ جو مالیگاؤں سے اردو پڑھانے آئے تھے۔ انہوں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے حیرانی سے کہا۔ ''کون گجانند بے یہ تو کوئی شولا پور کے حکیم ہیں۔''

''یہ بتاؤ جناب لکھیلا کیا ہے؟''

اسکول ماسٹر نے بلند آواز میں اشتہار پڑھا......

''شولا پور کے بڑے حکیم صاحب بمبئی میں''

''اپنی مردانہ طاقت (sex) میں کسی قسم کی کمزوری محسوس کرتے ہیں۔ کثرت احتلام، جریان، عضو مخصوص میں کمزوری آ گئی ہو، رکاوٹ میں کمی ہو، یا اولاد نہ ہوتی ہو، گیس، کمر درد۔ پتھری، عورتوں کے لیکوریا وغیرہ کیلئے بلا جھجک ۵۰ سالہ تجربہ کار حکیم صاحب سے ملیں۔''

وقت: صبح ۱۰ بجے سے شام ۵ بجے تک۔

پچیس سال پہلے اس آدمی نے گجانند ڈانگے سے اپنی مردانہ کمزوری کا علاج کروایا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ کوئی اور نہیں گجانند ڈانگے ہی ہے۔ وہ جانتا تھا اس کی طرح کے پیشے میں روپ بدلنا لازمی ہوتا ہے کیونکہ نہ مریض چاہتا ہے کہ ڈاکٹر اسے یاد رکھے اور نہ ڈاکٹر چاہتا ہے مریض آپس میں ایک دوسرے سے واقف ہوں۔

لیکن گجانند نائی خدا نہ تھا۔ مہارت کے باوجود ایک دفعہ اس سے بھی غلطی ہوئی تھی۔ جس کے سبب خون تیزی سے بہنا شروع ہوا جسے روکنا دشوار ہو گیا تھا۔

اس بات کا علم بھی سکینہ کے والد کو تھا۔ ایک ڈر سا ان کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ اس لئے انہوں نے خود ہی سکینہ کے معاملے میں پہل کی اور تیسرے مہینے کی شروعات میں اسے گوا گر لے گئے۔ سارے معاملات ڈاکٹر سے طے کئے۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ہر مہینے کے آخری ہفتے سکینہ کو احتیاطی چیک اپ کے لئے جانا لازم تھا۔ دوسری بار سکینہ اپنی پڑوسن کلثوم کے ساتھ گئی تھی۔

تیسری بار اس نے مجاور حسین سے کہا ''میں عبدالعزیز کو ساتھ لے جاؤں گی'' مجاور حسین نے کہا اچھی بات ہے۔ یوں بھی ان دنوں سکینہ کی ساس سے گفتگو بند تھی اور مجاور حسین اسے کسی طرح مجبور بھی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس کی خوشیوں میں ان کی خوشی

تھی۔ مجاور حسین کا خیال تھا کہ عبدالعزیز سکینہ کو بڑی بہن کی طرح پسند کرتا ہے۔ اسی لئے ہر سمئے اس کے آگے پیچھے ناچتا رہتا ہے۔

﴿۴﴾

موجیں مارتا شور مچاتا بحرِ عرب اس دوپہر اُچھان پر تھا۔ گذشتہ چار روز متواتر بارش بھی بہت ہوئی تھی۔ ستمبر کی آخری بارش تھی۔ ساحل کے کنارے جو پہاڑی سلسلہ تھا وہ سبز رنگ کی لمبی لمبی جنگلی گھاس کے اگ آنے سے بڑا دلکش لگ رہا تھا۔ تیز و تند سمندری ہوا کے جھونکوں سے ایسا سماں بندھتا گویا گھاس نہ ہو لہراتی ہوئی ہزار وار ساڑی ہو۔

اس دن سکینہ نے پستہ رنگ کے بلاؤز پر ہلکے ہرے رنگ کی ساڑی پہنی تھی جس کے پلّو پر چھوٹے چھوٹے پھول تھے۔ جو اس نے خود کاڑھے تھے۔

عبدالعزیز نے چچا کی تین پتلونوں کو سراج انعامدار ٹیلر سے الٹر کروائی تھیں، جنھیں اب وہ استعمال کرنے لگا تھا۔ گہرے نیلے رنگ کی پتلون اسے بے حد پسند تھی۔ اس پتلون میں سامنے کی اور دو بڑے جیب تھے۔

پہاڑی سلسلے پر جہاں سرد کا بن ختم ہوتا وہاں وہ دونوں جا کر بیٹھ گئے۔ سمندر ان سے باتیں کرنا چاہتا تھا مگر ان کے اندر ایک دوسرے سے کرنے کے لئے اتنی باتیں تھیں کہ سمندر کی موجوں کا شور وہ سن نہ سکے۔ سکینہ اسے مجاور حسین کے مزاج میں آئی ہوئی تبدیلیوں کے بارے میں تفصیل سے بتاتی رہی۔ وہ اسے اپنی اسکول، اپنی پڑھائی اور والدہ کے بارے میں۔۔۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ اب اسے چھوٹے لڑکوں کے ساتھ گلی ڈانڈا لنگوری اور امی تمچا پانیات، کھیلنے میں مزہ نہیں آتا البتہ کرکٹ اور کبڈی اسے زیادہ اچھے لگنے لگے ہیں۔ اب اسے پہلے جیسے خواب نہیں آتے۔ جن میں وہ مٹھائیاں، چاول کی گڑ بھری شینگیں اور سفید تلوں والے بور کھایا کرتا تھا۔

دوستوں کے ساتھ دوسروں کے باغوں سے کاجو، آم اور پھنس چراتا تھا۔ ندی میں تیرتا رہتا تھا۔ اب وہ جو خواب دیکھتا ہے اسے یاد نہیں رہتے۔ ان میں وہ مسافروں کی طرح اجنبی بستیوں میں خود کو، ان دیکھے لوگوں کے ساتھ پاتا۔ اب وہ سیلاب، ندی کی طغیانی، چوہوں کی اس کے بدن پر یلغار دیکھتا۔ وہ دیکھتا ایک نیلا سانپ اس کی چھاتی پر رینگتا ہے۔ ایک عورت چوہے میں بدل کر اس کے لبوں کو چومتی ہے۔ وہ اپنے قریبی رشتے داروں کی لاش کو قبرستان میں دفن کر رہا ہے۔ کبھی وہ دیکھتا ہے کہ بہت ساری بے چہرہ عورتیں اس کے گرد رقص کر رہی ہیں۔ پھر وہ سب مل کر اس کے بدن سے اپنے اپنے حصّے کی آسودگی چراتی ہیں۔ وہ خالی ہو جاتا ہے۔ وہ خود کو دوڑتا ہوا دیکھتا ہے۔ اکثر اس کے پیر زمین سے اونچائی پر ہوتے ہیں۔ گویا وہ ہوا میں دوڑ رہا ہو۔ ایک خواب جو اسے یاد تھا وہ اس نے سکینہ کو سنایا جس میں رنگ برنگے سانپ اس کے بستر پر رینگتے رہتے ہیں۔ وہ گہری نیند میں ہے۔ سانپ اس کو ڈسنے کی بجائے اس کے بدن کو چومتے ہیں۔ اس سے پیار کرتے ہیں۔

سکینہ تجسس کے ساتھ اس کی باتوں کو سنتی رہی۔ پھر اس نے کہا۔ ''محبت کرنے والوں کو ہمیشہ عجیب خواب نظر آتے ہیں۔''

''لیکن کیوں؟'' سنجیدگی سے عبدالعزیز نے جاننا چاہا۔

''کیوں کہ۔۔۔'' وہ ٹھہر گئی۔

''کیوں کہ محبت کرنے والوں کے دل میں ہزاروں ڈر رہتے ہیں''

عبدالعزیز کو سکینہ کی بات پسند آئی۔ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ سکینہ برابر اس سے نظریں کب ملاتی تھی۔ اس نے یہاں وہاں دیکھا تاکہ عبدالعزیز کی آنکھوں سے نکلنے والی تابکاری سے منتشر نہ ہو جائے۔ عبدالعزیز نے کہا ''کیا آپ کو بھی ڈر لگتا ہے؟''

لمحے بھر کو سکینہ چپ رہی پھر اس نے سمندر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں۔''

''کیوں؟'' عبدالعزیز نے پوچھا۔

''کیوں کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔''

''تو پھر ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''جہاں ڈر نہیں ہوتا۔۔۔''

''جہاں ڈر نہیں ہوتا وہاں کیا؟؟؟''

''وہاں محبت بھی نہیں ہوتی۔۔۔''

''عبدالعزیز اس جملے پر غور کرنے لگا۔ پھر اس نے کچھ سوچ بچار کے انداز میں پوچھا۔ ''ڈر کس بات کا ہوتا ہے؟''

''ہر بات کا۔۔۔''

''سب سے زیادہ کس بات کا۔۔۔؟''

''سب سے زیادہ۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔سب سے زیادہ؟'

سکینہ نے پلو کے سفید پھولوں کو انگلیوں میں دباتے ہوئے کہا۔ ''جس سے پیار کرتے ہیں اسے پالینے کا ڈر۔۔۔''

عبدالعزیز نے منہ بنایا اور استعجاب سے کہا۔ ''پالینے کا ڈر!!!''

''ہاں'' سکینہ نے اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لئے رک کر کہا۔ ''ہاں! جہاں صرف محبت ہو وہاں پانے کا ڈر لگا رہتا ہے۔''

''کیوں؟''

''کیوں کہ محبت میں کسی کو پالینا بے حد مشکل ہوتا ہے۔''

عبدالعزیز کا چہرہ کچھ گمبھیر، کچھ کنفیوژ اور کچھ فکر مند دکھائی دیا۔ اس نے آنکھیں سکیڑ

کر کہا۔ ''مطلب پانا بے حد مشکل ہے اس لئے اس کا ڈر۔۔۔میں نہیں سمجھا۔۔۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔''

سکینہ اس کے چہرے کو پڑھ چکی تھی۔ اس نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بدھّو! ڈر اس بات کا رہتا ہے کہ پا کر پھر ہم اسے کہیں کھو نہ دیں۔ جو چیز مل جاتی ہے اسی کو تو کھونے کا ڈر رہے گا نا؟''

عبدالعزیز نے سکینہ کی اس سادہ منطق پر غور کیا۔ اسے ایسا لگا وہ ساری بات سمجھ گیا ہے۔ سکینہ ریت میں انگلیاں گاڑے بیٹھی تھی۔ اسے معلوم تھا چند برسوں میں عبدالعزیز اس قابل ہو جائے گا کہ وہ سمجھ جائے گا کہ جہاں محبت ہو، وہاں ڈر کھونے کا نہیں بلکہ حاصل کرنے کا ہوتا ہے۔ محبت ہو تو کھونا کیا۔؟ ساتھ نہ ہونے کا مطلب کھو دینا تو نہیں ہوتا جس طرح ساتھ جینے کا مطلب پا لینا نہیں ہوتا۔

بہت دیر تک وہ وہیں بیٹھے رہے۔ پھر یکا یک عبدالعزیز کو کیا سوجھی کہ اس نے کہا۔ ''چلو، سمندر میں تھوڑا سا کھیلتے ہیں۔''

عبدالعزیز کی یہ بات سن کر پہلے تو وہ حیران رہ گئی پھر اس کے چہرے پر حیا کی ایک دبیز قبا پھیل گئی۔ وہ مسکرائی۔

''چلو تو۔۔۔کتنی اچھی دھوپ ہے۔'' عبدالعزیز نے اسے مسکراتے دیکھ کر کہا۔

حیا کی تہہ ایک لہر بن کر اس کے چہرے پر اُبھری۔ مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو کھولا۔ اس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ ''عزیز پوٹات تجا پور ہے، تیا لا تکلیف ہوئیل'' [عزیز۔ پیٹ میں تیرا بچہ ہے، اسے تکلیف ہوگی۔''

عبدالعزیز بھول گیا تھا کہ اب سکینہ کا پیٹ ابھر آیا ہے۔ اور وہ اس کے ساتھ سمندر میں کھیلنے نہیں بلکہ گوا گر کے سرکاری ڈاکٹر سے معائنہ کروانے آئی ہے۔ چونکہ ڈاکٹر کو آنے میں دیر تھی اس لئے وہ سمندر کنارے آ گئے تھے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ سکینہ

ہونے والے بچے کے تعلق سے بے حد فکر مند ہے۔ یادداشت کی واپسی کے ساتھ ہی عبدالعزیز کے چہرے پر شرمندگی سی طاری ہوگئی۔

''معاف کرا۔۔۔می اسرلوں ہوتوں۔۔۔'' اتنا بمشکل کہہ کر وہ اس کے اور قریب آ گیا۔

ایک دوسرے سے لگ کر وہ بہت دیر تک یوں ہی بیٹھے رہے۔ ساحل پر شور مچاتی موجوں سے بے پرواہ۔۔۔ تیز و تند ہواؤں کی سرگوشی کو سننے سے محروم، گویا ساری دینا میں اس لمحے دوسری کوئی شئے ان کے لئے بامعنی نہ تھی۔ چوں کہ وہ سرو کے پیڑوں کے عقب اور پہاڑی سلسلے کے قریب جا کر بیٹھے تھے اس لئے کسی کے وہاں آنے کا خیال تک ان کے ذہن میں نہ تھا۔ وہ چپ تھے۔ ان کی روحیں مسرور تھیں۔ دونوں الگ الگ باتیں سوچ رہے تھے۔ مگر دونوں کی باتوں کا محور ایک تھا۔ سکینہ کے بطن میں زندگی کا لباس اوڑھتی روح، ان کے اپنے بدن اس لباس کی خوشبو کو محسوس کرنے لگے تھے۔

چند روز قبل عبدالعزیز نے سکینہ کی ناف کے اردگرد اپنی انگلیاں ہولے ہولے پھیری تھیں۔ پاس سے گزرنے والی فرشتوں کی جماعت نے ٹھہر کر یہ نظارہ دیکھا تھا۔ ان میں جو کم عمر فرشتہ تھا جسے زمین پر عبادت میں محو لوگوں پر رحمت برسانے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی اس کا دل اس نظارہ عشق سے پسیج گیا تھا۔ بہت دیر تک وہ آئینہ حیرت بنا رہا۔ پھر اس کی نیلی ملائم سبز آنکھوں سے آنسوں چھلک پڑے عمر دراز فرشتہ جس کی داڑھی اس کی ناف تک بڑھی ہوئی تھی اس نے کم عمر فرشتے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور کہا۔ ''دل مضبوط کر۔۔۔عبداندراج ابن عبد۔''

''دل ہے ہی کہاں سردار۔۔۔دل ہوتا تو منکرِ ذاتِ باری نہ ہو جاتا۔''

''یہی ہماری خوش نصیبی ہے اور اسی لئے ہمیں قُربِ حقیقی نصیب ہے۔''

''قُرب حقیقی کے باوجود ہم کیا ہیں۔۔۔؟ ہم سے زیادہ بامعنی تو اس خاکی کا سایہ ہے۔''

عمر دار راز فرشتہ نے کم عمر کی زبان پر انگلی رکھی اطراف حیران و پریشان فرشتوں کو قریب بلایا اور کہا۔۔۔''یادداشت فرموش، فراموش یادداشت کنم۔''

سب نے تین بار دہرایا۔ یہ ان کی تشکیلی ہئیت کا کوڈ تھا۔ جس کا مطلب ہوتا ہے۔ جو کچھ سنا گیا ہے۔ وہ سنا نہیں گیا......

پل بھر میں وہ سب تتلیوں میں بدل کر ان دونوں کے اطراف منڈلاتے رہے۔ اس منظر کو صرف شگفتہ نے دیکھا تھا۔ املی کے پیڑ کو یہ بات بتانے کے لیے اسی پل سے وہ بے چین تھی۔

''لیکن انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ پوری روداد سننے کے بعد املی کی ایک شاخ نے دبی زبان پوچھا۔

''وہ چاہتے تھے محبت میں ڈوبے دو بدن آسمانوں پر لگے کیمروں میں قید نہ ہوں۔''

شگفتہ نے پُراسرار لہجے میں جواب دیا۔

''کیوں......؟'' ایک شاخ نے پوچھا جس کے پتّے سوکھ کر جھڑ گئے تھے۔

''کیوں...... کیوں کہ محبت دستورِ عمل میں جرم ہے۔''

''جرم...... کیوں؟'' ایک شاخ نے فوراً پوچھا جو ابھی ہری بھری تھی، اور جس پر ایک نیلے پروں والی چڑیا نے گھونسلا بنایا تھا۔

''مرد اور عورت کی محبت وہ واحد خوشی ہے جس کے ذائقے سے مکاتب دستورِ عمل ناآشنا ہیں۔''

''تو وہ آشنائی حاصل کریں''۔۔۔ مسکرا کر جوان شاخ نے کہا۔

''ممکن نہیں ہے احمق۔۔۔'' شگفتہ نے برجستہ جواب دیا۔

''جلدی سے بتاؤ کیوں؟'' نیلی چڑیا نے گھونسلے کے تنکوں کو پھیلاتے ہوئے کہا۔

''اس مسرتِ روحانی کے لئے ابدان کا تحلیل ہونا شرط ہے اور مکاتب دستورِ عمل بدن سے محروم ہیں۔''

''تو پھر وہ کیا ہیں۔''

''پھر وہ اتنے طاقت ور کیوں ہیں۔''

''وہ طاقت ور نہیں ہیں، بلکہ محروم ہیں۔ان کی قوت ان کے ارادے میں نہیں بلکہ کیمیا میں ہے۔''

''میں نہیں سمجھی۔۔۔'' چڑیا نے کہا۔

''مطلب وہ اپنی مرضی کے مالک نہیں ہیں۔وہ خواہش سے بھی محروم ہیں۔ان کی حیثیت چابی بھرے کھلونوں کی طرح ہے۔''

''اوپ۔۔۔! جوان شاخ نے غور کرنے والے انداز میں کہا۔۔۔'' اسی لئے وہ انسان سے کھار کھاتے ہیں!''

''بالکل صحیح! کیوں کہ انسان ارادہ کرتا ہے۔اس سے بڑی طاقت اور کیا ہے۔''

''میری اب سمجھ میں آیا۔'' چڑیا نے حامی بھری۔

اور ایک بات یاد رکھنا۔۔۔کائنات کے سارے عناصر انسان پر رشک کرتے ہیں کیوں کہ انسان میں محبت کرنے کی صلاحیت ہے۔'' شگفتہ نے اس کو مخاطب کر کے کہا۔ نیلی چڑیا نے شرماتے ہوئے موسیقی کا ایک بہت ہی چھوٹا ٹکڑا ادا کیا۔رات کی خاموشی میں دور تک ارتعاش ہوا؛ آس پاس کے پیڑوں کے جگنوؤں نے ایک ساتھ روشن ہو کر موسیقی کی معنویت میں اضافہ کیا۔

اس کی انگلیوں کے لمس سے سکینہ کے اندر پوشیدہ ممتا کا جذبہ اس کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ وہ زار زار رونے لگی تھی۔ عبدالعزیز حیران و ششدر اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ہمت کر کے پوچھا۔ ''بات کیا ہے۔ میرا ہاتھ لگانا آپ کو خراب لگا؟''

''نہیں۔۔۔''

''پھر آپ اس طرح کیوں رو رہی ہیں؟''

''عزیز۔۔۔ میں ترے بچے کو اپنی گود میں مسکراتے ہوئے دیکھنے کیلئے بے چین ہوں۔''

عبدالعزیز کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ یہ کیفیت اس کے لئے غیر متوقع تھی۔ وہ کسی طرح سکینہ کو ہنسانا چاہتا تھا۔ اس نے دماغ پر زور دیا۔ تب اسے ایک ترکیب سجھائی دی۔ اس نے فوراً اپنا سر اس کی گود میں ڈال دیا۔ سکینہ نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ ''ارے کیا کر رہے ہو۔''

''دیکھو۔۔۔ جب تک بچہ دنیا میں نہیں آتا آپ اپنی گود میں میرا چہرہ دیکھا کرو۔''

اُفوہ۔۔۔ تم بچہ ہو گیا۔'' کبھی کبھار وہ اسے تو کی بجائے تم بھی کہنے لگی تھی۔

''تو کیا ہوا بچے کا باپ تو ہوں نا؟''

وہ مسکرائی۔

عبدالعزیز بھی مسکرایا۔

اس نے دوبارہ کہا۔۔۔ ''معاف کر، می اسرلوں ہوتوں۔۔۔'' (معاف کر میں بھول گیا تھا۔)

❦

اس کے پشیمان چہرے کو دیکھ کر سکینہ کے دل میں جانے کیا خیال آیا۔ وہ کھڑی ہوگئی۔ دھیرے دھیرے سمندر کی طرف بڑھنے لگی۔ عبدالعزیز اسے دیکھتا رہا۔ وہ پانی

تک پہنچ گئی۔اس کے پیروں کو سمندر کی لہریں بوسہ دینے لگیں۔تب وہ مڑی اور اس نے اشارے سے عبدالعزیز کو بلایا۔

وہ بہت دیر تک سمندر میں کھیلتے رہے۔

جب اسپتال کی طرف واپس ہو رہے تھے تب عبدالعزیز نے پوچھا۔''تم نے تو پہلے کہا تھا۔''پوٹاٹ پور ہے تکلیف ہوئیل''

''ٹھیک ہی تو کہا تھا۔''

پھر خود ہی اٹھ کر پانی میں کیوں گئے۔

''جو اندر ہے وہ بھی تو،تو ہی ہے۔''

''پوپٹ بنا رہی ہو......؟''

''نہیں رے......سچ مچ،جب عورت محبت کرتی ہے تو مرد اسے اپنا بچہ ہی لگتا ہے۔''

''قسم سے......''عبدالعزیز نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......ہونے والا یا وہ جو کبھی نہ ہو۔''سکینہ نے نظریں نیچی کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو!آج کل آپ ایسی باتیں زیادہ کرتی ہو،جو میری سمجھ کے اوپر سے جاتی ہیں۔''

''میری باتیں تجھے دیر سے۔۔۔پر سمجھ میں آئیں گی ضرور......''

اسے یکا یک ہچکی لگی۔وہ اپنی سیٹ پر سے اٹھا اور ہوائی جہاز کی لیٹرین میں گیا۔ وہاں اس نے منہ دھویا جیب سے رومال نکال کر چہرہ پونچھا اور پھر آئینے میں اپنے بال بنائے۔اپنے چہرے کو دیر تک بغور دیکھتا رہا۔تب اسے دوبارہ سکینہ کا جملہ ہو بہو اس

کے لفظوں کے ساتھ یاد آیا۔''میری باتیں تجھے دیر سے۔۔۔ پر سمجھ میں آئیں گی ضرور۔۔۔''

﴿۵﴾

واپس آ کر وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا۔ کال بیل کا بٹن دبایا۔ اس بار ایک دبلی پتلی ائیر ہوسٹس آئی عبدالعزیز نے اس سے پانی طلب کیا۔

پانی پینے کے بعد اس نے پیر پھیلائے اور سیٹ کو پیچھے کیا۔ یہ پوزیشن اسے زیادہ آرام دہ لگی۔ اس نے آنکھیں موند لیں، یہاں اس نے آنکھوں کے شٹر گرائے وہاں ایک کلکاریاں مارتا ہوا چہرہ اس کے دیدوں میں اجاگر ہوا۔ یہ چہرہ جب عبدالعزیز کے خوابوں میں آتا ہر بار ایک عجب روپ میں بدل کر غائب ہو جاتا۔ اس کی آواز کی طرف وہ بڑھنے لگتا۔

اس چہرے سے متعلق ایک خواب اس نے متواتر کئی بار دیکھا تھا۔ ہر بار اس خواب نے سراسیمگی میں مبتلا کر دیا۔

اسے ایسا لگتا وہ جنگل کے کنارے کھیتوں کے آس پاس کھڑا ہے۔ جنگل کی سرحد سے یہی کلکاریاں اس کے کانوں میں پڑتی ہیں۔ اس کے قدم آواز کی طرح بڑھنے لگتے ہیں۔ وہ آواز اسے اندرون جنگل آہستہ آہستہ لے جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جنگل کے سب سے گھنے حصے میں پہنچ جاتا ہے۔ پیڑ اسے مہیب چہرے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ سبز وزرد بیلیں زنجیریں بن جاتیں۔ اسے لپیٹ لیتیں۔ دھیرے دھیرے اس کا لہو چوسنے لگتیں۔ مہیب چہروں کے درختوں کی شاخیں لمبے لمبے ناخن دار پنجوں میں بدل جاتیں۔ اس کی چیخ اس کے حلق میں دب جاتی۔ خونی بیلیں اس کے جسم میں اتر جاتیں۔ خون کا آخری قطرہ چوس لینے کے بعد دوبارہ آہستگی سے لوٹ کر اپنے اپنے مقامات پر چلی جاتیں۔ اس کے مردہ جسم کو دیکھ کر مسکراتیں۔

کلکاریاں اس کے مردہ جسم کے اطراف گردش کرنے لگتیں۔ پھر ایک حزنیے میں بدل جاتیں۔ موسم خزاں میں بدل جاتا۔ اس کے جسد خاکی پر پتّوں کی برسات ہونے لگتی۔ پت جھڑ کی آواز میں حزیں کلکاری بہنے لگتی ہے۔ سوکھے پتّوں کے انبار تلے اس کا بدن سڑنے گلنے لگتا ہے بے شمار کیڑے اس کے نتھنوں اور دیدوں سے اس کے مردہ جسم میں داخل ہوتے۔ اس کے اندر کے مادوّں کو کرید کرید کر کھانے لگتے۔ بعض کیڑوں نے بائیں پسلی کے پاس سے جہاں خونی بیلوں نے چھید کیا تھا وہاں سے شارٹ کٹ بنالیا۔ پھر گلتے ہوئے جسم سے گوشت اور چربی کی آخری تہیں نکال نکال کر مزدوروں کی طرح اپنے بلوں اور قلعوں میں لے جانے لگے۔ جب وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تو بچھوؤں کے ایک کنبے نے اپنے گھر کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا۔

بارش آئی۔ مٹی کی جھجھ شروع ہوئی۔ اس کی ہڈیوں پر مٹی کی پرتیں جم گئیں۔ چند ہفتوں بعد اتنے حصے میں جہاں اس کا بدن سڑ گل گیا تھا وہاں گھاس پوس اگنے لگی۔ جہاں خونی بیلوں نے اس کی بائیں پسلی میں چھید کیا تھا وہاں سے ایک بیل پھوٹی۔ بارش برابر ہوتی رہی۔۔۔ مہینہ بیت گیا۔ اب وہ بیل پھیل گئی۔ چند روز بعد اس پر گلابی رنگ کے ستارہ نما پھول آنے لگے۔ ان پھولوں کے اردگرد تتلیاں، پتنگے، بھنگریاں اور جنگلی کیڑے مکوڑے آ آ کر اس کی خوشبو سے اپنا جی بہلانے لگے۔ رات میں جگنو آس پاس جھلملاتے، اسے حیرت بھری نظروں سے دیکھا کرتے۔

ہر بار خواب کے اس حصے میں اس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ اپنے کمرے میں اس ستارہ نما پھول کی مہک کو محسوس کرتا۔ یہ مہک اسے عجیب مخمصے میں ڈال دیتی۔

﴿٦﴾

اس نے آنکھیں کھولیں اور جیب سے ایک چھوٹی سی بلیک اینڈ وائٹ تصویر نکالی۔ سکینہ کی ڈلیوری کے دوسرے ہی روز اس کے والد نے پانڈو راؤ فوٹو گرافر کو

اسپتال بلوا کر یہ تصویر اتاری تھی۔ اس روز عبدالعزیز نے پہلی بار کیمرہ دیکھا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ ہو کیا رہا ہے؟ اسے تو یہ لگا تھا کہ یہ بھی کوئی ڈاکٹر ہے جو سکینہ اور بچے کو دیکھنے آیا ہے۔ بعد میں سکینہ نے اسے سمجھایا کہ وہ کوئی مشین نہیں بلکہ کیمرہ تھا۔

اسے سکینہ کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ باہر گیا جہاں احاطے میں اس کی ماں گانو کے لوگوں کے ساتھ بیٹھی بات چیت کر رہی تھی۔

''ماں! وہ فوٹو نکالنے کی مشین تھی۔؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔'' مہرون نے کہا۔

''ہاں۔۔۔اپنے گانو میں تو کسی کے پاس نہیں ہے۔''

''بیٹا یہ بہت مہنگی ہوتی ہے۔''

''اور فوٹو۔۔۔۔''

''وہ سستا ہوتا ہے۔''

پھر آپ نے میرا فوٹو آج تک کیوں نہیں نکالا۔ اس نے جھٹ سے سوال داغا۔ مہرون نے اسے حیرت بھری نظروں سے دیکھا اور پاس بیٹھے ہوئے مجاور حسین سے مخاطب ہو کر کہا۔'' آپ ہی سمجھائیے اسے۔۔'' پھر گردن گھما کر اس نے عبدالعزیز کی طرف دیکھا اور کہا۔'' ارے بیٹا، ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اور تو گھر میں پیدا ہوا تھا۔ اپنے بازار میں فوٹو والا بھی نہیں ہے نا۔ تو نے گانو میں کسی کا فوٹو دیکھا ہے۔''

یہ دلیل اسے درست لگی۔ کیوں کہ واقعی اب تک اس نے گانو میں کسی کے گھر میں تصویریں نہیں دیکھی تھیں اور جن دو چار گھروں میں تصاویر تھیں ان میں اس کی رسائی نہ تھی۔ وہ گانو کے سیٹھ لوگوں کے گھر تھے۔

❦

اسپتال میں لوگ پھل اور گھر کی بنی چیزیں لے کر مبارک باد دینے آتے رہے۔

شام کے قریب جب مہرون واپسی کے لئے تیار ہونے لگی تب وہ دوبارہ سکینہ کے پاس گیا۔ اتفاق سے اس وقت وہاں کوئی اور نہ تھا۔

اس نے سکینہ کے سرہانے کھڑے ہوکر اس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ نوزائیدہ کے ہونٹوں کو پیار کیا۔ سکینہ کے چہرے پر خوشیاں تھیں۔ وہ عبدالعزیز کو گلے لگا کر گھنٹوں اس سے لپٹی رہنا چاہتی تھی۔ اس نے اسے قریب بلایا اور اس کے کان میں کہا۔ ''یہ محبت کی نشانی ہے۔ اور محبت کی ہر نشانی خطرناک ہوتی ہے۔''

عبدالعزیز نے اس کی آنکھوں میں بہ غور دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شادمانی اور سرشاری تھی۔ اسے ماں بننے کی خوشی اس قدر تھی کہ وہ خود، پل بھر میں بھول گئی کہ عبدالعزیز کے کان میں اس نے جو بات کہی ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں۔ عبدالعزیز کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے اس نے کہا۔ ''شام ہونے آئی ہے۔۔ اب تو جا۔۔ کل مت آنا۔۔ میں پرسوں گھر آجاؤں گی۔''

عبدالعزیز اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''تیرا امتحان سر پر ہے اس لئے کہہ رہی ہوں۔۔ برا مت ماننا۔''

''ٹھیک ہے۔ یوں بھی پڑھائی نہیں ہوئی ہے۔ لگتا ہے فیل ہو جاؤں گا۔'' عبدالعزیز نے کہا۔

''بدھو! تجھے میری دعا ہے۔ تو کسی امتحان میں فیل نہیں ہوگا۔ گھر پر میرے یہاں پڑھائی کے لئے آجانا۔ میں نے تیری ماں سے بات کر لی ہے۔''

وہ مسکرایا۔ اور مسکراتے ہوئے وارڈ سے باہر نکلا۔ سکینہ کے چہرے پر بہت دیر تک مسکراہٹ پھیلی رہی۔ جس سے اس کی آنکھوں کی چمک میں اضافہ ہو گیا تھا۔

آج سے بارہ سال پہلے یہ تصویر نکالی گئی تھی۔ اتنے برسوں سے عبدالعزیز نے اس تصویر کو بڑی عقیدت سے سنبھالے رکھا تھا۔ اب اسے یہ تصویر آثار قدیمہ کے نمونے

کی طرح لگتی ہوگی۔ کیوں کہ اب اس کے ارد گرد زندگی بہت تیزی سے بدل گئی ہے۔
۱۹۷۵ء میں گانو کے دو نوجوان کویت [ملازمت کے لئے] جانے نکلے تو پورے گانو
میں ماتم کا سماں تھا۔ ہر ایک کا چہرہ اس فکر میں ڈوبا ہوا تھا کہ پردیس میں ان پر کیا
گزرے گی۔ لوگ ان سے ملنے آتے، جدائی کے خیال سے ان کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں۔
انھیں ایس ٹی بس سے بمبئ جاکر وہاں سے ہوائی جہاز میں سوار ہونا تھا۔۔۔ لگ
بھگ آدھا گانو ایس ٹی اسٹینڈ پر انھیں رخصت کرنے گیا تھا۔

لوگ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ایک دوسرے کی غربت کا پیوند تھے۔ کئی
دنوں تک گانو کے لوگ، کویت جانے والے نوجوانوں کے گھر کا چکر کاٹتے رہے اور
خیر خیریت دریافت کرتے رہے۔ جب ڈاکیہ کویت سے پہلا خط لے کر پہنچا تھا تو اسے
خوشی سے شکر کھلائی گئی تھی۔ اس کے بچوں کو مٹھائی کے لئے پانچ روپے دیے گئے۔

سات آٹھ مہینوں بعد انہوں نے، اپنے قریبی رشتے داروں کے لئے چار ویزا
حاصل کئے۔ پھر سلسلہ ہجرت شروع ہوگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے تین چار برسوں میں
ہر گھر سے ایک نہ ایک آدمی، کویت، قطر، دوبئ اور سعودی میں ملازمت کے لئے چل
پڑا۔ دوری اور جدائی کا احساس ماند پڑ گیا۔

اس سال گانو میں بجلی آئی۔ خلیجی ممالک سے چھٹی پر آنے والے افراد نے جاپان
، جرمنی اور کوریا کے برقی آلات لانے شروع کئے۔ جن سے ہزاروں برسوں سے چلے
آئے چراغ، دیے اور شمعی بجھ گئے۔ لکڑے کے چولہے، مٹی کے برتن، پاٹے، موسل،
گھوٹنی، وروٹا، ولن، سالک، کانسے، کھاپڑی، گھونگڑی، ناریل کے کاتے، گونپٹ کے
پاپوش، ہاتھوں سے بنائی ہوئی تھیلیاں اور مٹی کے کھلونے اپنی اہمیت اور افادیت کو کھو
بیٹھے۔ دولت آتے ہی لوگوں نے مٹی کی دیواروں کو مسمار کرکے چرے، اینٹ اور
سمینٹ کے پختہ مکانات بنانے شروع کئے۔ پھر آرائشی لوازمات سے ان کی زینت

بڑھانے کی دوڑ شروع ہوئی۔اب گھروں میں بادام، لونگ، دار چینی، الائچی، زیتون کے تیل، لکس صابن اور عطریات کی بہتات ہوگئی۔ملبوسات میں یکا یک تبدیلی ہوگئی۔ جوتے چپل بھی چین اور انڈونیشیا کے پہننا فیشن بن گیا۔امرت انجن بام کی جگہ ابو فاس اور ٹائیگر بام نے لے لی۔سونا گہنے کی جگہ نمائش بن گیا۔

خلیجی ممالک سے ان لوگوں نے ایک اور چیز اپنے ساتھ لائی۔اور وہ تھی عربوں کی ثقافت۔اب عورتوں کے لئے وہ برقعے اور بزرگوں کے لئے جانماز اور اندھیرے میں چمکنے والی سبز تسبیحات۔ ہر بات میں اسلامی آداب کا ذکر ہونے لگا۔بچوں کے نام بھی عربی طرز کے رکھے جانے لگے۔عورتوں کو نماز کی تلقین کی جانے لگی۔

بعض نے اپنے بچوں کو دینی تعلیم دینا لازمی سمجھا۔چوں کہ اس وقت قرب وجوار میں بھی کوئی باضابطہ مدرسہ نہ تھا۔اس لئے باحیثیت لوگوں نے اپنے بچوں کو شری وردھن کے ایک مدرسے میں بھیجنا شروع کیا۔

گانو کے لڑکے جو مدرسوں سے چھٹیوں میں واپس آنے لگے تو انہوں نے مدرسے کے خیالات کو پھیلانا شروع کیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ پھر جسے دیکھو۔سفید کرتا اور ٹخنوں کے اوپر پائجامہ پہنے، ثواب اور گناہ کے موضوع پر بحث کرنے لگا۔اس بحث کی گاج عورتوں پر گری۔ان کے لئے نئے نئے احکامات صادر ہونے لگے۔عورتوں، لڑکیوں اور نو بالغ بچیوں کو برقعے پہنائے گئے۔کیونکہ اب برقعہ نہ پہننا بدچلنی اور بے حیائی کی علامت بن گیا۔بعض نے اپنی بچیوں کو مالیگاؤں کے مدرسوں میں علم دین حاصل کرنے کے لئے بھی بھیجا۔

مختصراً یہ کہ خلیجی ممالک کی دولت نے گانو کی کایا کلپ کردی۔ جہاں معاشی طور پر لوگ خوشحال ہونے لگے وہیں ثقافتی اور تہذیبی سطح پر مقامی کلچر سے رفتہ رفتہ دور ہونے لگے۔اب ہندو......کافر ہو گئے تھے۔اب مراٹھی بت پرستوں اور مشرکوں کی زبان۔

بعض نے صاف کہہ دیا۔ ’’مراٹھی زبان میں بچوں کو پڑھانا مطلب کافروں کے اثرات قبول کرنا ہے۔‘‘

شروع میں لڑکیوں کو ہدایت کی گئی کہ لڑکوں سے ہاتھ ملانا حرام ہے اور چند سال بعد بات چیت کرنے کو بھی غیر شرعی فعل قرار دے دیا گیا۔

کشادہ گھروں میں آرام دہ زندگی پنپنے لگی مگر اس کی قیمت گانو کو بہت بھاری چکانی پڑی۔ اب گانو گھروں کا مجموعہ تھا۔ دلوں کی انجمن نہیں۔

باب چہارم

میں اپنی گونج تھا اور گنبدوں میں رہتا تھا

ہوائی جہاز بمبئی کے اوپر سے پرواز کر رہا تھا۔ کمر کا پٹہ باندھنے کی ہدایت کی گئی۔ عبدالعزیز نے تصویر دوبارہ جیب میں رکھی اور بیلٹ باندھ لیا۔

☆☆

ائیر پورٹ کے باہر مہرون اس کے والد اور چچا انتظار کر رہے تھے۔ چوں کہ بمبئی میں کوئی قریبی رشتے دار نہیں تھا اس لئے کرائے کی کار سے وہ سیدھے ائیر پورٹ پہنچ گئے تھے۔

مہرون کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ بیٹے کے دیدار کے لئے وہ بے قرار تھی۔ گاؤں سے ممبئی تک نو گھنٹے کے سفر میں ایک پل کے لئے بھی اس کی آنکھ نہیں لگی تھی۔ وہ تھک سی گئی تھی اور اس کا دل ممتا کے جذبے سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں عجیب سی

الجھن تھی۔

اپنی ٹرالی ڈھکیلتے ہوئے عبدالعزیز ایکزٹ ڈور سے باہر نکلا۔ جوں ہی مہرون نے اسے دیکھا اس کے دیدوں میں صبر کئے بیٹھے موتی اُمڈ پڑے، اور منظر دھندلا گیا۔ ان آنسوؤں میں انتظار کی حدت تھی۔ وقار حسین نے اس کے آنسوؤں کو دیکھا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھے۔

وہ چند قدم بڑھے ہی تھے کہ عبدالعزیز نے انھیں دیکھ لیا۔ وہ ٹھہر گیا۔ پھر مسکراتے ہوئے وہ ان کی جانب بڑھا۔ مہرون کے گلے سے لپٹ گیا۔ وقار حسین کی آنکھ میں بھی ہلکی نمی در آئی تھی۔ انہوں نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے فوراً آنکھوں کے کونوں میں جمع قطروں کو رومال میں جذب کر لیا۔ مہرون نے عبدالعزیز کی پیشانی چومی اور دعائیں دینے لگی۔ عبدالعزیز اپنے والد کے گلے ملا۔ اس دوران حمید حسین ٹرولی سنبھالے ہوئے تھے۔ پھر عبدالعزیز نے چچا کو گلے لگایا اور ان سے خیر خیریت دریافت کی۔

مہرون نے پہلے اس کی نظر اتاری، پھر اس سے باتیں کرنے لگی۔ حمید حسین نے ڈرائیور کو آواز دی۔ سامان گاڑی میں رکھنے کے بعد انہوں نے چائے پی اور کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔

کار ائیر پورٹ سے باہر نکل کر ہائے وے پر آئی۔ مہرون نے ایک ڈبا کھولا جس میں تلی ہوئی مچھلی، چاول کی روٹیاں اور چٹنی تھی۔ کھانے کی مہک سے عبدالعزیز کے منہ میں پانی آ گیا۔

مہرون نے روٹی پر مچھلی کا ٹکڑا رکھا اور اپنے ہاتھوں سے اسے کھلایا۔ پھر اس نے ڈبا ماں کے ہاتھوں سے لیا اور جلدی جلدی تین روٹیاں اور مچھلی کے چار بڑے ٹکڑے

چٹ کر گیا۔ اسے بھوکے آدمی کی طرح کھاتے دیکھ کر مہرون مسکرائی۔ پھر اس نے اپنی پان کی تھیلی نکالی۔ پان بنایا اور منہ میں ڈالا۔ عبدالعزیز نے پانی کی بوتل سے پانی پیا۔ والد سے ان کی دکان سے متعلق کچھ پوچھا پھر مہرون کی طرف مڑ کر کہا۔۔۔ ''میرے لئے بھی ایک پان بناؤ؟''

''تو ویسا کا ویسا ہی ہے۔ زرا نہیں بدلا۔'' مہرون نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بدلے گا کیسے!!! تجھ پر جو گیا ہے۔'' وقار حسین نے مہرون کو چھیڑا۔

''تمھیں کیا۔ پان کھانا تو میں مرتے دم تک نہیں چھوڑوں گی۔''

''مجھے معلوم ہے۔ میں کہاں کہہ رہا ہوں چھوڑ دے۔''

''کہہ کہہ کر تو تھک گئے ہو، پر میرا پان کھانا چھڑا نہیں سکے۔ اس لئے اب تانے دے رہے ہو۔''

''ارے نہیں نہیں۔۔ میرے کسی تانے کا تم پر اثر ہوا ہے۔'' وقار حسین نے ہنستے ہوئے کہا۔

''دیکھا عزیز! یہ مجھ سے کیسی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ میرا کلیجا جلاتے رہتے ہیں۔''

''ارے وہ مذاق کر رہے ہیں'' عبدالعزیز نے ماں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں بیٹا تجھے تو معلوم ہے نا؟ یہ ساری باتیں، جوان کے دل میں ہوتی ہیں کہہ دیتے ہیں۔'' اس نے ایک نظر وقار حسین کی اور دیکھا پھر کہا۔۔۔ ''پھر کہتے ہیں مذاق کر رہا تھا۔ یہ سن کر وقار حسین نے قہقہ لگایا۔ حمید بھی ہنسے۔

''بھابھی۔۔۔ میرے لئے بھی ایک پان بناؤ۔۔۔'' حمید حسین نے کہا۔ اب سب کھا رہے ہیں تو۔۔۔ مہرو ایک ترے ہاتھ کا مجھے بھی کھلا دے۔ وقار حسین نے کہا۔

مہرون کو ان کا یوں پان مانگنا بہت اچھا لگا۔ کیوں کہ ہمیشہ ہی وہ اسے پان کھانے

پر ڈانٹتے آئے تھے۔ مگر آج بیٹے کی واپسی پر وہ بھی بے حد خوش تھے۔ مہرون نے سروتا نکلا اور ایک بڑی سپاری دیکھ کر اسے کترنے لگی۔ پھر تین پان بنائے اور تینوں کو دیے۔ سب پان چباتے اور باتیں کرتے رہے۔

عبدالعزیز کویت بینک میں ب طورا کاؤنٹینٹ ملازم تھا۔ دو سال مکمل ہونے کے بعد اسے چھٹی ملنے والی تھی لیکن بینک مینیجر کی حادثاتی موت کے سبب اسے مزید نو مہینے گزارنے پڑے۔

اتنے عرصے بعد مہرون اپنے بیٹے سے باتیں کر رہی تھی شاید اسی لئے اس کے اندر ایک قدرتی توانائی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ بہت دیر تک اس سے بے شمار موضوعات پر باتیں کرتی رہی۔

علی الصبح جب کار گاؤں میں داخل ہوئی اور وقار حسین نے کہا۔ ''ارے۔ گھر آ گیا۔ چلو جاگو......'' تب گہری بے خواب نیند سے وہ جاگی۔ عبدالعزیز کی مانڈی پر مہرون پیر اکڑوں کئے سو رہی تھی۔

❦

وقار حسین اور حمید حسین دکان پر چلے گئے تھے۔ مہرون اپنی دیورانی شمیم کے ساتھ پڑی میں چاول کے آٹے کی شینگیں بنا رہی تھی۔ شینگ کھانا عبدالعزیز کو بچپن سے بے حد پسند تھا۔ ہانڈی پر جالی دار تھالی رکھ کر مہرون درمیانی کمرے میں گئی۔ جہاں عبدالعزیز سو رہا تھا۔ صبح سے چار بار وہ اس کمرے میں آئی تھی۔ بیٹے کے چہرے کو دیکھ دیکھ کر اس کے جی میں ہزار خیالات رینگنے لگے تھے۔

عبدالعزیز کا قد تو پہلے ہی نکل آیا تھا۔ کویت کے قیام نے اس کی ہڈیوں پر گوشت کی مضبوط تہیں چڑھا دی تھیں۔ اس کے گال بھر گئے تھے اور پیشانی چوڑی ہوگئی تھی۔ چہرے پر جوانی کی رمق نظر آ رہی تھی۔

بیٹے کو گہری نیند میں سوتا دیکھ کر اس نے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔

چار پانچ قریبی رشتے دار ملنے آئے تھے انھیں بھی یہ کہہ کر لوٹا دیا تھا کہ ''تھکا ہوا ہے۔ابھی سو رہا ہے۔اٹھے گا تو بلا لوں گی۔''

چارپائی کے کنارے کھڑے رہ کر مہرون اسے ممتا بھری نظروں سے دیکھا۔تین سال اور ایک مہینے قبل اس کمرے میں اس نے عبدالعزیز کو صلواتیں سنا کر ملازمت کے لئے باہر جانے پر راضی کیا تھا۔

پہلے اس نے انکار کر دیا تھا۔مہرون نے کئی بار اسے سمجھایا۔وہ نہیں مانا۔پھر اس نے عبدالعزیز کے گال پر تھپڑوں کی بارش کی تھی۔جتنی دیر وہ اسے زود و کوب کرتی رہی خود بھی دھاڑیں مار کر روتی رہی۔جب اس کے ہاتھ تھک گئے تب دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی تھی۔عبدالعزیز دوسرے کونے میں بیٹھ کر بہت دیر تک خود بھی روتا رہا۔قریب ایک گھنٹے بعد وہ اٹھا اور پڑی سے اس نے اسٹیل کے گلاس میں پانی لایا۔مہرون نے اس کے ہاتھ سے پانی پینے سے انکار کر دیا۔اس کی ضد تھی کہ جب تک وہ اس بات کی قسم نہ کھا لے کہ وہ گلف جائے گا تب تک وہ ایک گھونٹ بھی ہونٹوں سے نہیں لگائے گی۔

بالآخر عبدالعزیز نے اس کی بات مان لی۔تب جا کر مہرون نے تھوڑا سا پانی حلق سے نیچے اتارا۔عبدالعزیز ماں کی زانوں پر گردن ڈالے لیٹ گیا۔مہرون نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔عبدالعزیز سسکیوں کے ساتھ روتا رہا۔مہرون تب یہ سمجھا ہوگا وہ احساس ندامت سے رو رہا ہے۔

اس کے گرم آنسو مہرون کے کلیجے کو چیرنے کے لئے کافی تھے۔اتنے برسوں میں اس نے اپنے بیٹے کی کبھی ایسی سرزنش نہیں کی تھی۔میٹرک پاس ہونے کے بعد چالس کلومیٹر دور چپلون کی کالج میں اس کا داخلہ کرانے، ہاسٹل کی فیس ادا کرنے اور دیگر

اخراجات کے لئے اس نے اپنے کچھ زیورات اونے پونے دام میں فروخت کئے تھے۔ پھر گھر خرچ میں سے کاٹ کٹا کر ہر بار جب وہ واپس آتا، چپکے سے اس کی جیب میں چند روپے ڈال دیتی۔ وقار حسین کو کسی بات کا علم ہونے نہیں دیتی۔ اسے اس بات کا ڈر تھا کہ پھر جیب خرچ کے لئے جو رقم وہ عبدلعزیز کو دیا کرتے تھے اس میں کٹوتی کریں گے۔

عبدالعزیز کے تعلیمی نتائج سے سب خوش تھے۔ رفتہ رفتہ الجبرا میں بھی اس کی دلچسپی بڑھ گئی۔ حتٰی کہ میٹرک کے بعد الجبرا اور شماریات اس کے پسندیدہ مضامین بن گئے تھے۔ حساب سے اس کی دلچسپی کا سبب تو صحیح معنوں میں سکینہ تھی، جس نے ایک روز اسے ڈانٹ کر کہا تھا کہ اگر پندرہ دن میں بیس تک پہاڑے یاد نہیں کرو گے تو میں تم سے دو مہینے بات نہیں کروں گی۔ اور نہ ہی تجھے یوسف کے ساتھ کھیلنے دوں گی۔''

***

گریجویشن میں اس کی پوزیشن کالج میں دوسری اور ضلع میں ساتویں تھی۔ گاؤں کا وہ کامرس میں پہلا گریجویٹ تھا۔

وقار حسین چاہتے تھے کہ اب وہ سرکاری بینک سے قرض لے کر اپنا کاروبار شروع کرے۔ انہوں نے اکثر ریڈیو پر سنا تھا کہ سرکار دیہاتوں میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کو بینک لون دیتی ہے۔ جب عبدالعزیز سے انہوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا اس وقت ان کے ہاتھوں میں ریڈیو بھی تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر بینک والی بات پر کسی کو شبہہ ہوا تو وہ آکاش وانی لگا کر ''کسانوں کے لئے کام کے مواقع اور سرکاری مدد'' پروگرام لگا دیں گے۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے انہوں نے عین مغرب کے وقت یہ بات کہی تھی۔ انہیں معلوم تھا ہر جمعہ شب آٹھ بجے یہ پروگرام نشر ہوتا ہے۔ وہ جمعہ کا دن تھا۔

مہینوں پہلے اپنی دکان میں بیٹھ کر روزمرہ کی چیزیں فروخت کرتے ہوئے انہوں نے اس کی پلاننگ کی تھی۔

انھیں اس وقت بُرا لگا جب عبدالعزیز نے ان کی بات سن کر کہا۔ ''نہیں۔''

تھوڑی دیر وہ چپ رہے۔ ریڈیو ایک کونے میں رکھا اور ایک میز پر بیٹھ گئے۔ مہرون، عبدالعزیز سے قریب، دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھی تھی۔ ان کے سر پر چالیس واٹ کا بلب روشن تھا۔ بلب کی روشنی میں چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے رقص کر رہے تھے۔ کویلوں کی پھٹوں سے دو بڑی بڑی چھپکلیاں انھیں حسرت و یاس بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

مہرون گردن جھکائے سپاری کتر رہی تھی۔

وقار حسین نے لنگی کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا۔ ۔ ۔ ! میں اور تیرا چاچا محنت تو بہت کرتے ہیں مگر......''

حمید حسین جو درمیانی کمرے میں بیٹھے شمیم سے بات کر رہے تھے وٹے دار کے دروازے پر آ کھڑے ہوئے۔ وقار حسین نے ان کی طرف نظر اٹھائی، پھر عبدالعزیز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بچت وچت نہیں کر پا رہے ہیں۔''

''دکان میں سامان کم رہتا ہے اس لیے گراک لوگ بھی اب زیادہ نہیں آتے۔ ''حمید حسین نے وقار حسین کے جملے کے ختم ہوتے ہی کہا۔

مہرون نے پان منہ میں رکھا اور اونچی آواز میں کہا۔ ''گو شمیم زرا تھوکدانی دے گو۔ پڑت اسیل بگ۔ (شمیم زرا تھوک دانی دینا۔ دیکھو پڑی میں ہوگی۔)

''مجھے بھی اس بات کا احساس ہے۔'' عبدالعزیز نے پیر پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے بیٹا میں چاہتا تھا تم کوئی کاروبار ایسا کرو جس سے جلدی سے ترقی ہو۔''

''تمہاری پڑھائی پر سب کو ناز ہے۔ سنڈی کیٹ بینک کے منیجر رمیش

پر مارنے کہا بھی تھا کہ کوئی بات ہوتو مجھ سے ملنا۔'' حمید حسین نے چٹائی پر بیٹھے ہوئے کہا۔

''کب کہا تھا؟''

مہرون نے شمیم کے ہاتھ سے تھوک دانی لے کراس میں تھوکتے ہوئے پوچھا۔

''کوکن وکاس سمیتی کی طرف سے انعام بانٹتے ٹائم...... حمید حسین نے جواب دیا۔

''میرے سامنے کہا تھا مجھے یاد ہے۔'' عبدالعزیز نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''پھر بیٹا سوچتا کیا ہے...... یہ تو اچھی بات ہے۔'' مہرون نے پان کو زبان سے ایک طرف سرکاتے ہوئے کہا۔

عبدالعزیز نے گردن جھکائی اور کہا۔'' مجھے اور دو سال پڑھائی کرنا ہے اور اس پر آپ کو خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔ مجھے کالج کی ٹرسٹ اسکالرشپ دینے والی ہے۔ جس میں جیب خرچ کے لیے بیس روپے بھی ملیں گے۔ رہنا بھی فری ہوگا۔''

''بعد میں بھی کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہے۔'' حمید حسین نے کہا۔

''نہیں...... مجھے سرکاری نوکری مل سکتی ہے۔ میں بینک میں آفیسر بھی بن سکتا ہوں۔ عبدالعزیز نے وقار حسین کی طرف دیکھ کر کہا۔

شمیم جو بہت دیر سے دروازے پر آ کھڑی تھی۔ وہ چٹائی پر بیٹھ گئی۔'' ماں...... مجھے صرف تھوڑی سی مدد اور چاہیے پھر میں گھر کی ذمّے داری اپنے کندھوں پر لے لوں گا۔ ''عبدالعزیز جانتا تھا اسے گرداب سے مہرون ہی نکال سکتی ہے۔

''ضرور تم آفیسر بنو گے۔ اس سے گھر کا نام بھی کوکن میں روشن ہوگا۔'' شمیم نے کہا۔ اسے معلوم نہ تھا ضلعے، تعلقے اور خطّے میں کتنا فرق ہے۔ خطّے کی وسعت کا اندازہ لگانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ بمشکل اس نے پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی

تھی۔ اس کا گمان تھا جتنا رقبہ وہ دیکھ چکی ہے، کوکن اُتنا ہی ہے۔

''خدا میرے بیٹے کو ترقی دے گا۔'' مہرون نے کہا۔ پھر وقار حسین سے مخاطب ہوئی۔'' کتنا ہونہار بیٹا ہے۔ تمہارا۔۔۔فکر کیوں کرتے ہو۔ اتنے برس گزر گئے دو برس بھی جھٹ سے گزر جائیں گے۔'' وہ تو ٹھیک ہے پر......''

''اب پرور کیا۔ وہ کہہ رہا ہے نا......خرچ کی ذمّے داری کالج والے لے رہے ہیں۔'' مہرون نے جواب دیا۔

بھائی آپ فکر مت کیجئے۔ ہم سب ہیں نا اس کے پیچھے۔'' شمیم نے کہا۔

اللہ نے چاہا تو اس میں ہماری کامیابی ہوگی۔ شمیم کی بات ختم ہوتے ہی حمید حسین نے کہا۔ وقار حسین نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا:'' جیسی آپ سب کی مرضی۔ بیٹے دھیان لگا کر پڑھائی کرنا۔۔ سارے گھر کی ذمّے داری تمہیں اپنے کندھوں پر لینی ہے۔''

''ارے ماں!''

مہرون چارپائی کے کنارے کھڑی خیالات کے بھنور میں ڈوب گئی تھی۔ جب عبدالعزیز نے اسے آواز دی وہ چونک گئی۔ جہاں کھڑی تھی وہاں اس کا دھیان نہ تھا۔

''دیکھنے آئی تھی تیری آنکھ کھلی یا نہیں۔'' کسی طرح خود کو سمیٹے ہوئے اس نے کہا۔

عبدالعزیز نے کروٹ بدلی اور دوبارہ گوجڑی اپنے پورے بدن پر پھیلا دی۔

''چل جلدی سے اٹھ جا اب، ساڑھے نو بج رہے ہیں۔''

اسے یاد آیا کہ چولھے پر شینگ کی ہانڈی ہے وہ فوراً مڑی اور پڑی میں اتری۔ شمیم اس وقت تک ہانڈی اتار چکی تھی۔

مہرون چولہے کے پاس بیٹھ گئی۔ سلیمانی چائے ساسر میں انڈیل کر کپ ایک طرف رکھا۔ دونوں ہاتھوں سے ساسر اٹھائی اور پھونک پھونک کر پینے لگی۔ صبح سے یہ اس کی تیسری چائے تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دوپہر کے کھانے میں کیا بنائے۔ یوں تو عبدالعزیز کی آمد سے چند روز قبل ہی اس نے راشن بھر لیا تھا۔ اب وہ سوچ رہی تھی گوشت، مرغی یا مچھلیاں منگائے۔

چولہے سے لگ کر ایک کھڑکی تھی جو عام طور پر پرانے طرز کے مکانوں میں دھوئیں کی نکاسی کے لیے ہوا کرتی تھی۔ مہرون نے باہر دیکھا تو اس کی نظر گڑ گے پر دھوپ سینکتے مرغے پر پڑی۔

گائو کے لوگ نہ صرف اس بات سے واقف تھے کہ فلاں گائے، بکری یا مرغا کس کا ہے بلکہ یہ بھی جانتے تھے کہ کون سا کھیت، باغ اور پیڑ کس کا ہے۔ مہرون نے شمیم کو اشارے سے بُلایا اور اسے مرغا بتایا۔ شمیم نے دیکھتے ہی کہا۔ ''اچھا ہے، کلو کے اوپر ہوگا۔'' جا۔ سلمان ملاّ جی کو بول، عبدالعزیز گھر پہنچ گیا اور پوچھنا مرغا بیچو گے کیا۔''

شمیم پڑی سے منگیلدار کے آنگن میں چلی گئی۔ اب مہرون کی چنتا ختم ہوگئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر مرغے کو دیکھا جو اکتوبر کی دھوپ میں گڑ گے پر بیٹھ کر جانے کیا سوچ رہا تھا۔ مہرون کی نظریں کچھ دیر مرغے پر رہیں پھر ایک پل ایسا بھی آیا کہ مرغا اس کی آنکھ کے محور سے اوجھل ہو گیا اور وہ یادوں کے دائروں میں بہتی چلی گی۔

۲

سکینہ سے سرکاری اسپتال میں ملاقات کے بعد وہ گواگر ایس ٹی ڈیو پہنچے تھے، جہاں سے سورل کے لیے انھیں ایس ٹی پکڑنا تھی۔ دو تین گھنٹوں میں ایک ایس ٹی ہوا کرتی تھی، اس لیے عام طور پر لوگ پرائیوٹ ٹیمپو وغیرہ سے سفر کرنے کو ترجیح دیا کرتے تھے۔

ڈیو کے گیٹ کے پاس نیم کے پیڑ کے نیچے ایک ادی واسی مرغے فروخت کر رہا تھا۔ عبدالعزیز مرغا خریدنے کی ضد کرنے لگا۔ مہرون نے اسے بہت سمجھایا پر وہ نہیں مانا۔ تب مہرون نے اسے بتایا کہ اس کے پاس صرف کرائے کے پیسے ہیں وہ چاہتے ہوئے بھی نہیں خرید سکتی۔ ''مرغے کی قیمت میں دوں گا۔'' عبدالعزیز نے کہا۔

مہرون کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے جاننا چاہا کہ اس کے پاس روپے کہاں سے آئے عبدالعزیز نے بہت باتیں بنائی اور چاہا کہ راز کو راز ہی رکھے۔ مہرون بہ ضد ہوگئی کہ جب تک روپے کہاں سے آئے وہ نہیں بتائے گا وہ مرغا خریدنے کی اجازت نہیں دے گی۔ چار و نا چار اس نے بتایا۔ ''سکینہ آپان دیلان'' (سکینہ آپا نے دیے ہیں۔)

سکینہ کے ردّ عمل کو سننے سے پہلے ہی وہ دوڑ کر ادی باسی کے پاس گیا۔ اسے چمکیلے بادامی رنگ کا مرغا پسند آیا جس کی کلغی سرخ اور دم کے پنکھ سیاہ تھے۔ ادی باسی کو اس نے دس کا نوٹ دیا۔ مرغے کو بغل میں دبا کر وہ مہرون کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ادی باسی نے اسے آواز دی اور دو روپے لوٹائے۔ عبدالعزیز کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی۔ ادی واسی نے سر کے بال کھجائے اور کہا۔ ''چانگلا آہے'' (اچھا ہے۔)

بغل میں مرغا دبائے وہ مہرون کے قریب پہنچا۔ اس کے کھلے ہوئے چہرے کو دیکھ کر مہرون کو بھی ہنسی آئی۔ جوں ہی اس کی ہنسی میں ممتا کا رنگ گھل گیا وہ پس منظر بھی بھول گئی۔ وہ ٹیمپو میں بیٹھے۔ کچھ دیر بعد ڈرائیور آیا۔ تب تک لوگ آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ پھر سب نے کرایا ادا کیا۔ عبدالعزیز کا مرغا اس کی نظر کا تارا بنا ہوا تھا۔ دو دیہاتیوں نے مرغے کی تعریف میں لوک گیت کا ایک ٹکڑا گایا۔ مرغے بے وقت بانگ سے مسافر بھی لطف اندوز ہونے لگے۔ عبدالعزیز کا سینہ پھول گیا تھا۔ راستے میں گانو آتے گئے اور لوگ اترتے گئے۔ ٹیمپو میں تین چار لوگ رہ گئے تھے۔ جو ہونٹوں کے نیچے تمبا کو دبائے بیٹھے تھے۔ عبدالعزیز نے بڑی سنجیدگی سے اپنی ماں سے پوچھا۔ ''تُجا

سُنیلا س پُتوس جھیلو استو تے تُو کائے کیلاں استاس'' (تری بہو کو بیٹا ہوا ہوتا تو کیا کرتی؟)

مہرون کے لیے یہ سوال غیر متوقع تھا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ عبدالعزیز اس نوعیت کا سوال اس سے کر سکتا ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ لمحے بھر کے لیے اڑ سا گیا تھا۔ پھر اس اڑے ہوئے رنگ پر کچھ دیر حیرانی چھائی رہی۔ حیرانی زیادہ دیر تک کبھی ساکت نہیں رہتی۔ شاید اس لئے مہرون کے دل میں حسین یادوں کا جو دفینہ تھا اس میں ہلچل ہوئی۔ پندرہ سال قبل وہ ماں بنی تھی اس موقعے کا ایک رنگ تابندہ ہو کر اس کے چہرے پر لہرانے لگا۔ اپنی زچگی اسے یاد آئی۔ عبدالعزیز کا پہلا دیدار اسے یاد آیا۔ اسے وہ آنسو یاد آئے جو عبدالعزیز کو دیکھتے ہی اس کا جگر چیر کر اس کی آنکھوں سے بہہ پڑے تھے۔

اس وقت اس کی ماں نے سات گو جڑلے، تین چار ٹوپراں، میتھی کے لڈو، ایک جھنجھنا اور کچھ دوسرے کھلونے اسے دیے تھے۔ اس کی ماں نے ہی ساس کا رول ادا کیا تھا۔ ساڑیوں کو پھاڑ کر اس کے لئے کپڑوں کے تختے تیار کئے تھے۔ اس کی چارپائی کے نیچے انگیٹھی کا انتظام کیا کرتی تھی۔ جس میں لوبان کے علاوہ سوکھائی ہوئی جڑی بوٹیاں ڈالی جاتی تھیں۔ جن سے نتھنوں میں ایک طرح کی تازگی محسوس ہوتی اور ہوا میں اڑنے والے کیڑے مکوڑے بھی بھاگ جاتے۔

یادوں کے اس درپن میں اس نے بہت سارے مناظر دیکھے۔ اس میں موجود عورت اور ماں میں دیر تک ایک کشمکش جاری رہی۔ وہ سوچتی رہی کیا کہے۔

عبدالعزیز چپ چاپ بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے ایسا لگا اس نے غلط سوال پوچھ کر ماں کو ناراض کر دیا ہے۔ سوال کی آنچ کو کم کرنے کے لیے وہ مرغے سے باتیں کرنے لگا۔ اس کی کلغی سے کھیلنے لگا۔ اس کی دم کے پروں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔

مہرون بھانپ گئی کہ عبدالعزیز ڈر گیا ہے۔ اس کے پر چہرے مسکراہٹ پھیلی۔ مسکراہٹ کی ترنگ میں اس نے کہا...... ''عزیز''

عبدالعزیز نے گردن اُٹھائی مگر برائے راست ماں کی آنکھوں میں جھانکنے کی بجائے وہ اس کے کان کی موندیوں کو دیکھنے لگا۔

''ترے بھیجے میں یہ سوال کیسے آیا؟'' مہرون نے پوچھا۔

''ایسے ہی آیا ماں۔ میں نے سوچا نہیں، خود سے آ گیا۔'' کان پر ہی اس کی نظریں تھیں۔

''کوئی بات نہیں بیٹا۔ تیری جب شادی ہوگی نا۔۔۔ تو میں تیری بیوی کو میٹھی کے لڈو اور بہت سارے کھلونے دوں گی۔''

عبدالعزیز مسکرایا۔ اس مسکراہٹ میں شرماہٹ بھی تھی اور شرارت بھی۔ اس نے مہرون سے نظریں ملانے کی بجائے مرغے سے باتیں کرنا ہی مناسب سمجھا۔

''ماں! نہانے کا پانی گرم ہوا؟''

عبدالعزیز کی آواز پر وہ مڑی۔ وہ پڑی کے ہونبٹے پر کھڑا تھا۔ یادوں کے دائروں کا ہالہ بکھرا اور مہرون نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ مسکرائی۔ پھر اس سے کہا۔

''آ بیٹا! پہلے میرے پاس بیٹھ۔''

عبدالعزیز نے ایک بسنا لیا اور اس پر بیٹھ گیا۔

''شمیم کو بھیجا ہے مرغا لانے کے لیے۔ آج تیرے لیے مرغے کا سالن بناؤں گی۔''

''واہ۔۔۔ کتنا زمانہ ہو گیا تیرے ہاتھ کا کھانا کھائے ہوئے۔''

وہ بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ مہرون نے اسے بتایا اسے وہ شام یاد آئی تھی جب اس نے گواگر سے مرغا خریدا تھا۔ اس پرانی یاد سے خود عبدالعزیز دوبارہ شرما سا گیا۔ دونوں بہت دیر تک ہنستے رہے۔ ہنستے رہے اور دوسری حسین یادوں کو تازہ کرتے رہے۔

منگیلدار میں کھلے آسمان کے نیچے نہانے کا پرانا باتھ روم اب چیروں (سرخ مٹی کے قطعے جنھیں کوکن میں زمیں سے کاٹ کر نکالا جاتا ہے۔ کوکن میں اس کی کانیں ہوتی ہیں اور اب کوکن کے مکانات چیروں سے ہی بنائے جاتے ہیں۔) کے پکّے باتھ روم میں بدل گیا تھا۔ مہرون نے چولہے پر سے گرم پانی کا ٹوپ اتارا اور باتھ روم کی بکٹ میں انڈیل دیا۔ عبدالعزیز نے کہا کہ آج تمباکو کی میسری لگائے گا۔

مہرون نے پان کی تھیلی سے تھوڑا سا تمباکو نکالا اور میسری کے پترے پر ڈال کر جلی ہوئی سرخ لکڑیوں پر رکھ دیا۔ پل بھر میں تمباکو کی مہک اس کے نتھنوں میں پھیل گئی۔ ساتھ ہی ساتھ اسے ٹھسکا لگا اور کھانسی آئی۔

''عادت چلی گئی ہے نا!'' کھانسی پر قابو پاتے ہی اس نے کہا۔

''زیادہ کچّا مت لگا۔۔۔ چکرآ جائے گا۔''

ارے نہیں ماں۔۔۔ کوئی بات نہیں۔''

عبدالعزیز نے چمٹے سے تمباکو کا پترا باہر نکالا۔ گرم گرم ادھ جلا تمباکو ہتھیلی پر لے کر مسلتا ہوا وہ پڑی سے آنگن میں گیا۔ کھلا آسمان اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا امرود کا پیڑ پہلے سے بہت گھنا ہو گیا ہے۔ ہاپوس آم کے پیڑ کی شاخیں پھیل گئیں ہیں۔ گڑگے پر جنگلی گھاس اگ آئی تھی۔

اس نے گوبر سے لیپی ہوئی زمین پر قدم رکھے تو عجیب احساس اس کی رگوں میں اس نے محسوس کیا۔

تمباکو کی مہک بہت تیز تھی اس کے باوجود اس کے نتھنوں نے گوبر کی بو کو محسوس کیا۔ اس بو سے اہل کوکن کا صدیوں پرانا رشتہ تھا۔ اس سے انھیں حقارت نہ تھی۔ البتہ چند سال بعد یہ فرمان جاری ہوا کہ اس پر قدم رکھنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے تب لوگوں کو ابکائی آنا شروع ہوئی رفتہ رفتہ گوبر سے آنگن لیپنے کا چلن کم ہونے لگا۔

تمباکو کی مسیری کا لطف لینے کے ساتھ ہی اسے ماں کی بات دوبارہ یاد آئی۔ اسے اپنا سوال پوچھنا اور پھر اس پر نادم ہونا بھی یاد آیا۔ اس واقعے کے تین روز بعد جب سکینہ گھر لوٹ آئی تھی ......تب اس نے مہرون سے کہا تھا کہ۔ ''سکینہ کے لئے میتھی کے لڈو بنا دو، اس کی ماں جو نہیں ہے اور اس کی ساس کی خصلت تو تمھیں معلوم ہے۔''

مہرون کو عبدالعزیز کی بات واجب سی لگی تھی۔ اس نے دوسرے دن میتھی کے لڈو بنا کر اسے دیئے اور شمیم کے لئے بنائے گئے گوجڑلے بھی دیئے۔ اس سے عبدالعزیز کی خوشی دوبالا ہوگئی تھی۔ اس نے دل میں کہا تھا۔ ''ماں! کاش تمھیں معلوم ہوتا۔۔۔ تم دادی بن چکی ہو۔''

یاد کے اس ٹکڑے کے ساتھ ہی وہ باتھ روم میں گھس گیا۔

شمیم پڑی میں داخل ہوئی۔ مہرون وہاں نہ تھی اور چولہے پر چائے کی واٹی چڑھائی جا چکی تھی۔ جس میں پانی ابل رہا تھا۔ شمیم نے واٹی کے نیچے سے جلتی ہوئی لکڑی پیچھے کھینچی اور درمیانی کمرے میں داخل ہوئی۔ عین اسی اس وقت مہرون مالے سے اتری۔

''اٹھ گیا عزیز۔۔؟'' شمیم نے مہرون کو دیکھتے ہی اس سے پوچھا۔

''ہاں۔۔نہار رہا ہے۔۔'' میں تیرے شادی والے کپ نکالنے مالے پر گئی تھی۔

شمیم کو شادی میں دیگر برتنوں کے ساتھ چائے کا ایک چینی سیٹ بھی اس کے والدین نے دیا تھا جس پر سنہری پرتوں میں گل بوٹے نکالے ہوئے تھے۔ کیسری رنگ کے پھول اور جامنی پنکھڑیاں تھیں۔ ''میں انہیں دھو کر لاتی ہوں آپ چائے دیکھئے۔'' شمیم نے مہرون کے ہاتھوں سے کپ لیتے ہوئے کہا۔

مہرون نے جب وتیلی میں جھانکا تو سارا پانی سوکھ چکا تھا۔ اس نے کلسی سے ایک گلاس پانی لیا اور واٹی میں ڈالا۔ دوسرے چولہے پر دودھ کی پتیلی رکھی۔ صبح ہی شمیم نے رمضان گھارے کے گھر سے گائے کا تازہ دودھ نکال کر لایا تھا۔ ڈر یہ تھا کہ کویت میں

رہ کر عبدالعزیز سلیمانی چائے پینا بھول نہ گیا ہو۔ کوکن میں یہ بات عام طور پر دیکھنے میں آتی ہے کہ جب بیٹا گھر کی ذمے داریوں کو اپنے کندھوں پر لے لیتا ہے تو ماں اس کی خاطر داری میں یوں لگ جاتی ہے گویا وہ شوہر کی خاطر داری کر رہی ہو۔ یہ محبت، عقیدت اور ایثار کا ملا جلا روپ ہوتا ہے۔

مہرون نے ابلتے پانی میں شکر اور چائے پتی ملائی۔ جوش آنے پر چائے نہ چھلکے اس لئے اس نے پکڑ سے وتیلی اوپر اٹھائی اور شعلے دار لکڑیوں کو باہر کھینچا۔ وتیلی دوبارہ کڑے پر رکھی۔ دیوار کی میخ پر لٹکے ہوئے پات کے گچھے پر اس کی نظر پڑی۔ فوراً اٹھی اور ایک پات کھینچ کر نکال لی۔ اس کے ٹکڑے کئے اور چائے کی وتیلی میں ڈالے۔ چائے نے جوش لیا اور مہک پڑی میں پھیل گئی۔

پڑی کے باہر برتن دھونے کے لئے ایک بڑا سا پتھر تھا جس سے لگ کر پانی بھرا ڈرم رکھا ہوا تھا...... شمیم کپ دھو کر اٹھ ہی رہی تھی کہ باتھ روم سے عبدالعزیز نکلا شمیم نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ ''باوا......''

''بولا چاچی......کائے بولتے تبیت پانی......'' سر کے بال پونچھتے ہوئے عبدالعزیز نے کہا۔ ''ایک دم فس کلاس......'' جواب کے ساتھ اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیلی۔

عبدالعزیز نے ٹاویل کندھے پر رکھا اور آگے بڑھ کر......''پہلے یہ بتاؤ سلیم اور عارفہ کدھر ہیں......؟''

''اسکول گئے ہیں۔۔۔''

''کیا ضرورت تھی آج چھٹی کر لیتے۔''

''ارے ان کے امتحان چل رہے ہیں۔''

عبدالعزیز نے کچھ نہیں کہا۔

''مکتب سے آتے ہی تمہیں جگانے جا رہے تھے۔ میں نے منع کر دیا۔'' پڑی کی

طرف بڑھتے ہوئے اس نے کہا۔''

﴿۳﴾

شمیم عمر میں وقار حسین سے بہت چھوٹی تھی۔ اور چھوٹی بہن کی طرح ہی مہرون کی باتوں پر عمل پیرا ہوتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھیں۔

حمید حسین اور وقار حسین سگے بھائی نہ تھے۔ وقار حسین جب دس سال کے تھے اس وقت ان کی والدہ صادقہ کو سانپ نے کاٹ لیا تھا۔ اس وقت وہ کھیت میں کام کر رہی تھیں۔ سات گانو کے ویدوں کو بلایا گیا جو سانپ کے زہر کا اثر زائل کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ لیکن انھیں اس زہر کی نوعیت سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ سانپ کی شناخت ضروری تھی۔ گانو کے لوگوں نے کھیت کے آس پاس جہاں جہاں بل تھے وہاں کی زمین کھودی لیکن دھامن سانپوں کے ایک جوڑے اور پانی کے دو سانپوں کے علاوہ ان کے ہاتھ کچھ نہیں لگا۔ البتہ گانو کے لوگ یہ دیکھ کر حیران تھے کے چوہوں کے بلوں سے اناج کے دانوں، کاغذ کے ٹکڑوں، بوسیدہ چترن اور چھوٹے بچوں کی چڈی کے علاوہ سبز کپڑے میں لپٹی ہوئی بہت ساری تعویذیں برآمد ہوئیں۔ جلی ہوئی لکڑی پر سیندور سے بنائی ہوئی انسانی شکلیں، درجن بھر سوکھے ہوئے لیمو دستیاب ہوئے۔ سب سے زیادہ حیران کرنے والی چیز ایک رومال تھا۔ جس پر سرخ چمکدار دھاگے سے لکھا ہوا تھا۔

"to my true love"

زہر کی تشخیص نہ ہونے کے سبب علاج میں گڑبڑ ہوگئی۔ وقار حسین کے والد شبیر حسین کو یوں لگا تھا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ بچ جائے گی۔ لیکن یہ ان کی بھول تھی۔ ہفتے بھر میں صادقہ کی بینائی چلی گئی۔ پھر چند روز بعد اس کی سننے کی صلاحیت

معدوم ہوگئی۔ دوبارہ ویدوں کو بلایا گیا۔ ایک ڈاکٹر کو بھی بلایا گیا جس کی ڈگری سے کوئی واقف نہ تھا۔ (چند سال بعد پتہ چلا وہ بمبئی سے فرار کمپاؤنڈر تھا۔) ویدوں نے جواب دے دیا۔ ان کی دیکھا دیکھی ڈاکٹر نے بمبئی لے جانے کا مشورہ دیا۔ مگر وسائل کی کمی اور غربت کے سبب یہ ممکن نہ تھا۔ دن جوں جوں گزرتے گئے صادقہ کی حالت بگڑتی گئی۔ مہینوں وہ چارپائی پر مردہ حالت میں سانسوں کا سلسلہ رہی۔ پورا جسم بے جان تھا صرف دل میں روح سکڑ کر، سہم کر بیٹھی ہوئی تھی۔ کفن دفن کا انتظام کر کے لوگ خدا سے دعا گو تھے کہ اسے دنیا کے عذاب سے نجات ملے...... ''بھئی لیکن جب...... خدا اپنی قہارانہ صفات کی نمائش کرنے پر اترتا ہے تو کسی کی دعا کام کر سکتی ہے۔؟'' ایک بزرگ نے کہا تھا جن کا دل صادقہ کی حالت دیکھ کر تڑپ کر رہ گیا تھا۔

چاول کی کنی کی پیچ، روے کی کانجی یا موسمبی کا جوس بہ مشکل اس کی حلق میں انڈیلا جاتا۔

صادقہ کی چھوٹی بہن اس کا گھاگرا چولی بدلتی اور غلاظت صاف کرتی۔ وقار حسین کو وہ دن اب بھی یاد ہیں بلکہ ماں کی تکلیف دہ موت انھیں برسوں تک اندر ہی اندر ایک ناگفتہ اذیت میں مبتلا کیے رہی۔ جسے بعد میں مہرون کی جوانی، لطیفوں اور شرارت نے کسی حد تک کم کیا۔

صادقہ کے انتقال کے چھ سال بعد رشتہ داروں کے اصرار پر انہوں نے زرینہ نامی لڑکی سے دوسری شادی کی۔ شادی کے دوسرے سال زرینہ نے حمید حسین کو جنم دیا۔ لیکن زچگی کے دوسرے ہی ہفتے اسے یرقان ہو گیا اور وہ زیادہ دنوں تک بیماری سے لڑ نہ پائی۔ اس کے انتقال کے بعد شبیر حسین نے اپنے دونوں بیٹوں کی پرورش کا ذمہ خود اٹھا لیا۔ وہ خود ان کی ماں بن گئے۔

سارا گاؤ وقار حسین اور حمید حسین کی آپسی محبت کی مثالیں اپنے بچوں کو یوں ہی نہیں

دیتا ہے۔ شبیر حسین کے انتقال کے بعد وقار حسین نے نہ صرف حمید کو پالا پوسا بلکہ والد کی جائداد کے کاغذات پر بھی اس کا یکساں حصہ درج کروایا۔ جب یہ بات حمید حسین کو معلوم ہوئی تو اسے بہت برا لگا۔ اسی دن انہوں نے وہ کاغذات گاؤں کی جماعت کے ممبران کو بلا کر ان کے سامنے پھاڑ دیے۔

وہ دن ہے اور آج کا دن دونوں سگے بھائیوں کی طرح گھل مل کر رہتے ہیں۔ دن جیسے بھی آتے ہیں مل کر ان کا سامنا کرتے ہیں۔

حمید حسین نے شادی کی رات ہی شمیم کو زندگی کی ساری کہانی سنا دی تھی۔ اس رام کتھا کو سنتے ہی شمیم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اپنا جسم حمید حسین کے حوالے کرنے سے پہلے وہ دل سے اس کی ہو گئی تھی۔

سلیم اور عارفہ شمیم کے بچے تھے۔ جن سے عبدالعزیز کو بے حد پیار تھا۔ وہ چپلون سے جب واپس آتا ان کے لئے بسکٹ، چاکلیٹ اور کھلونے لے آتا۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر مٹی کے کھلونوں کا ایک کردار بن جاتا۔ سلیم جو تھوڑا بہت بولنے لگا تھا اسے پیڑوں ،پھلوں، پھولوں اور رنگوں کے نام سکھاتا۔ اس کے کپڑے بدل کر، اسے اپنے ساتھ ہفتہ واری بازار میں لے جاتا۔ اس کے لئے غبارے بناتا اور اسے کندھے پر بیٹھا کر گنپتی گنپتی کھیلتا۔ سلیم کے لئے عبدالعزیز وہ سب کرتا جس کی تمنا حمید حسین کے دل میں بس انگڑائی لے کر رہ جاتی تھی۔ گھر کو سنبھالنے کی ذمہ داری اتنی بھاری تھی کہ فرصت کے لمحوں میں ان کے کندھے اپنے بچوں کو اٹھانے کے لئے تیار نہ ہوتے۔ شام گھر واپسی پر وہ کھانا کھا کر اپنے کمرے میں دن بھر کی تھکی کمر کو راحت پہنچانے کے چلے جاتے۔ کئی دفعہ سلیم کے ساتھ کھیلتے ہوئے عبدالعزیز کو ایسا لگتا وہ سکینہ کے بیٹے یوسف کو کھلا رہا ہے۔

مہرون نے ایک صاف ستھری پلیٹ میں شنگیں نکالیں۔ جن میں اس نے پچھلے

موسم کے کاجو بھی ڈالے تھے۔

وہ ایک بسنے پر بیٹھ گیا۔ لنگی اور بنیان پر اسے دیکھ کر مہرون نے کہا۔ ''پورالا کوناچی چاک نایے لاگلی بس......'' (بچے کو کسی کی نظر نہ لگے بس)

''روز سانچی نجو نچا پہلے چاک کاڑولاہاوے۔'' شمیم نے مہرون کی بات پر سنجیدہ لہجے میں کہا۔ (روزانہ سونے سے پہلے نظرا تارنا چاہیے)

''ٹھیک ہے۔ صبح شام دونوں مل کر میری نظرا تارا کرنا۔'' عبدالعزیز نے شینگ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''بھانا! اس نے کبھی ان باتوں پر یقین کیا جواب کرے گا۔'' شمیم نے مہرون سے مخاطب ہو کر کہا۔

''یہی تو مسئلہ ہے۔ دو چار کلاس پڑھ کر بچے بڑوں کو ایڑا سمجھنے لگتے ہیں۔''

''ماں! تیرے ہاتھ کی شینگیں جادو ہیں...... جادو......'' موضوع بدلنے کے لئے عبدالعزیز نے کچھ زیادہ ہی تعریف کر دی۔ اس پر مہرون نے ہاتھ میں چمٹا اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''مجھے باتوں میں بہلا رہا ہے۔ چل پوری پلیٹ صاف کر ورنہ اس چمٹے سے زبان کھینچ کر نکال لوں گی۔۔۔'' شمیم بہت زور سے ہنسی۔

''ارے نہیں ماں سچ کہہ رہا ہوں۔'' عبدالعزیز نے کہا۔

''سچ کے بچے مجھے سب معلوم ہے۔ تو میٹھی میٹھی باتیں کر کے دوسروں کو ایڑا بناتا ہے۔''

''ارے کس نے کہا تجھے......''

''کس نے۔۔۔''

''ہاں بتا۔۔ کس نے......؟''

’’دیکھا شمیم میرے پیٹ کا گولا۔۔۔مجھ سے پوچھ رہا ہے کس نے مجھے بتایا؟ ارے میں تیری نس نس سے واقف ہوں۔‘‘ اتنا کہہ کر مہرون نے کپ میں چائے ڈال کر عبدالعزیز کی طرف بڑھائی۔

’’وہ! اتنو سا سلیم مجھے کہتا ہر...... ماں تمھیں الطاف حسین حالی کون تھے معلوم ہے۔ اب بتاؤ میں کیا بتاؤں......‘‘ شمیم نے کہا۔

’’مدرسہ پڑھانے کے لئے کوئی یوپی کے مولانا آئے ہیں نا؟ ان کے منہ سے سنا ہوگا۔ کوئی بڑے مولانا ہی ہوں گے......اور کیا۔‘‘

مہرون نے جواب دیا۔

’’میں نے بھی یہی کہا۔۔ ہوں گے کوئی مولانا۔‘‘ شمیم نے کہا اور مہرون کی طرف دیکھا پھر اپنی بات پوری کی۔

’’تو بولا۔۔ ماں تم جاہل ہو۔۔ آپ کو کچھ نہیں معلوم!۔‘‘

عبدالعزیز نے چائے کا کپ آگے کھینچا اور ایک شینگ اٹھائی۔

’’سنو بھابھی! یہ مولانا لوگ ہیں نا سب الّم غلّم پڑھاتے رہتے ہیں۔ سلیم کی پڑھائی پر دھیان دینا۔‘‘

’’اردو اسکول کھول دیا ہے۔ دروازے پر آتے ہیں اور کہتے ہیں مراٹھی اسکول میں بچوں کو بھیجو گے تو اردو اسکول کا کیا ہوگا۔‘‘

’’ترے ابّا بتا رہے تھے۔ اردو پڑھنا ہی اچھا ہے‘‘ مہرون نے کہا۔

’’سلیم نے ایک دن کہا مراٹھی ہندو لوگ پڑھتے ہیں۔ اردو ہی مسلمانوں کی زبان ہے۔‘‘ شمیم نے انکشاف کرنے والے انداز میں کہا۔ یہ سن کر لمحے بھر کو عبدالعزیز ٹھہر سا گیا۔ جانے کیا بات اس کی زبان پر آتے آتے رہ گئی۔ چائے کا کپ زمین پر رکھتے ہوئے اس نے شمیم سے کہا۔’’ میرے ابّا اور میں نے تو مراٹھی میں ہی تعلیم حاصل کی

ہے۔ تو کیا ہم ہندو تھے اور میرے بچپن میں تو اردو کا یہاں اسکول بھی نہ تھا۔ تب کیا ہم مسلمان نہیں تھے۔''

مہرون نے شینگ کی پلیٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔''چھوڑ بیٹا یہ سب۔ سب سے پہلے تو جا کر اڑوس پڑوس کے لوگوں کے گھر پر پیر لگا کر آ۔ قاضی صاحب ، رحمت آپا، ممتاز کاروباری صبح ہی تجھے دیکھنے آئے تھے میں نے کہا تو سو رہا ہے۔

''جی ماں! کہہ کر وہ اٹھا۔ لیکن جھٹ سے دوبارہ بیٹھ گیا۔''

شمیم اور مہرون نے فوراً نظریں گھمائیں اور خوب قہقہہ لگا کر ہنستی رہیں۔ درحقیقت اس دوران اس کی لنگی کا پیچ کھل گیا تھا۔ اور جوں ہی اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی، لنگی نیچے سرک گئی تھی۔ عبدالعزیز نے دوبارہ کس کر لنگی کمر پر باندھی اور پڑی سے نکلتے ہوئے کہا۔۔۔ ہنسو اور ہنسو زور زور سے ہنسو...... ہاہا...... ہاہا......

وہ پڑی سے چلا گیا لیکن مہرون اور شمیم بہت دیر تک ہنستے رہے۔

وہ درمیانی کمرے میں گیا۔ جہاں چارپائی کے نیچے اس کا بیگ رکھا ہوا تھا۔ بیگ سے اس نے ایک نیلے رنگ کی جینس پتلون اور سفید ٹی شرٹ جس پر عربی میں 'الحب تسلم' لکھا ہوا تھا، نکال کر پہن لی۔ اسے کمرے میں اندھیرا محسوس ہوا تو اس نے کھڑکی کھولی۔ مکان اور فصیل مکان کے درمیان کی جگہ پر ایک قطار میں گلاب کے چند پودے لگے ہوئے تھے۔ گلاب کی کئی ٹہنیوں پر چھوٹے چھوٹے گلابی رنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ کھڑکی سے ہوا کے جھونکے کمرے میں داخل ہوئے تو اپنے ساتھ گلابوں کی مہک بھی لے آئے۔ گلابوں کی مہک اس کے نتھنوں کے مسامات سے

اس کے بدن کی گہرائی تک اتر گئی۔ مگر خوشبو کی شناخت کرنے والے خلیوں میں جا کر گلاب کی مہک اپنی پہچان کے ساتھ ذہن میں بیدار نہ ہوئی بلکہ سکینہ کے لمس کا احساس بن گئی۔ وہ لکڑی کی سیڑھی کے پائیدان پر بیٹھ گیا۔ دس گیارہ سال پہلے کی وہ رات دوبارہ اس کے ذہن میں تازہ ہوگئی۔ اس رات سکینہ نے بھی گلاب کے پھولوں کا گچھا بنا کر، اپنے بالوں میں چھوٹی کالی پن سے اٹکائے رکھا تھا۔ پھولوں کی پنکھڑیاں صبح تکیے کے پاس بکھری ہوئی ملی تھیں۔ جنھیں اس نے اپنی ڈرائینگ کی کاپی میں سنبھال کر رکھا۔ پھر جب وہ اکیلا ہوتا یا سکینہ کی یاد اسے ستاتی تو وہ اس بیاض کو کھول کر ان پنکھڑیوں کو دیکھتا۔ انھیں چھوتا۔ حصولِ تعلیم کے لیے جب وہ چپلون گیا اس بیاض کو اپنے ساتھ لے گیا۔ چند مہینوں بعد شریفہ پاؤسکر نے اسے ایک کتاب تحفے میں دی، جس کا عنوان تھا ''Wasteland and other poems'' تب کہیں جا کر اس نے ڈارئینگ بک سے ان پنکھڑیوں کو 'ویسٹ لینڈ' میں منتقل کیا۔ وہ اس کتاب کو صرف 'ویسٹ لینڈ' کہا کرتا تھا،۔ یہ کتاب اسے پسند تھی لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اسے یہ کتاب کیوں پسند ہے۔ شاید یہی وجہ ہوگی کویت کے سفر کے لیے جب وہ اپنا سامان اٹیچی میں رکھ رہا تھا یہ کتاب بھی اسے یاد رہی۔ اس کے والد نے کہا تھا کہ اب اس کی کیا ضرورت ہے۔ پڑھائی کرنے نہیں جا رہے ہو۔ اس نے انتہائی خشک لہجے میں جواب دیا تھا ''یہ کتاب مجھے یاد دلاتی رہے گی۔ مجھے کیا نہیں بھولنا ہے۔'' مہرون نے اس کے ہاتھ سے کتاب جھٹ سے لے کر اٹیچی میں اس کی قمیص کے ساتھ رکھ دی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی بات آگے بڑھے اور عبدالعزیز غصّے میں جانے سے ہی انکار کر دے۔

۴

شریفہ پاؤسکر نے آرٹس میں داخلہ لیا تھا۔ ادب سے اسے بے حد لگاؤ تھا۔ شروع شروع میں مراٹھی میں نظمیں کہتی تھی۔ لیکن گریجویشن میں انگریزی ادب کا انتخاب

کرنے کے بعد اس نے ساری توجہ انگریزی شاعری اور تنقید پر لگا دی۔ اسے عبدالعزیز سے ایک طرح کی انسیت تھی جس کا سبب وہ یہ بتائی تھی کہ ''میں عبدالعزیز کو اپنے ہاتھوں کی مہندی اس وقت بتانا چاہتی تھی جب مجھے پتہ بھی نہ تھا کہ مہندی لگے ہاتھ کیا معنی رکھتے ہیں۔'' عبدالعزیز شریفہ کی بہت قدر کرتا تھا۔ جس کی بنیادی وجہ شریفہ کا ادبی ذوق تھا۔ وہ ایک آزادخیال اور اظہار رائے کی مکمل آزادی کی تائید کرنے والی بہادر لڑکی کے طور پر کالج میں مشہور ہوگئی تھی۔ ابتدا میں عبدالعزیز کا ادب ودب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ موضوعات جن پر آگے چل کر اسے عبور حاصل ہوا شریفہ کی دوستی کا نتیجہ تھا۔ شریفہ تہذیبوں کے عروج وزوال۔ اقتدار کی سفاکی اور ادب۔ مذہبی سیاست اور ادیب کے فرائض ایسے موضوعات پر تقریری مقابلوں کا انعقاد کیا کرتی، جن میں وہ ہمیشہ شریک ہوتا۔ پھر شریفہ کے دوست بھی اس کے دوست بن گئے۔ تب اسے احساس ہوا کہ زندگی میں فنون لطیفہ کا مقام کیا ہے۔ مذہب اور سیاست کے درمیان عام آدمی کی زندگی کس طرح اجیرن ہوجاتی ہے۔ کس طرح مذہب کو ڈھال بنا کر مفاد پرست لوگ اپنا الّو سیدھا کرتے ہیں۔ لوگوں کو تقسیم کرتے ہیں۔ خون خرابہ کرتے ہیں۔

***

اس نے دوبارہ سوٹ کیس کھولا اور اس میں سے وہ کتاب نکالی جس میں گلاب کی سوکھی ہوئی پنکھڑیاں آج بھی محفوظ تھیں۔ اس نے پنکھڑیوں کو اکٹھا کر کے اپنی ہتھیلی پر رکھا۔ پھر انھیں اپنے نتھوں کے قریب لاکر مہک کو سونگھنے لگا۔ پنکھڑیوں میں اتنے برسوں تک مہک کا ہونا عقل وعرفان سے پرے ہے۔ لیکن اس کے دل میں وہ مہک اب بھی تازہ تھی۔ شاید یہی سبب تھا۔۔۔ وہ جب بھی ان پنکھڑیوں کو سونگھتا۔ اسے وہی مہک نتھنوں میں سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوتی۔ اس کا دماغ اس مہک سے اس قدر مانوس

ہو گیا تھا کہ احساسِ خیال سے ہی خلیات بیدار ہو جاتے اور ماضی کی مہک وقت کی دیوار پھلانگ کر اس کے سامنے حاضر ہو جاتی۔ گویا وہ خوشبو نہیں اس کی داسی ہو۔ اس نے پنکھڑیوں کو دوبارہ کتاب میں احتیاط سے رکھا۔ ایک لمبی سانس لی اور باہر نکل آیا۔

❦

وہ مکان سے باہر نکلا۔ چند قدموں کے فاصلے پر جا کر مڑا۔ آس پاس کے مکانوں پر ایک اچٹتی سی نگاہ دوڑائی اور پھر اپنے گھر کو دیکھنے لگا۔ گزشتہ نصف صدی سے اس کے والد اس گھر میں مقیم تھے اور گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ گھر کی ہیت میں تبدیلیاں بھی ہوئی ہیں۔ شبّر حسین کے انتقال تک گھر کی چھت جنگلی گھاس کے تختوں سے بنی ہوئی تھی اور دیواریں مربع نما تودوں سے جنھیں گوبر اور سرخ مٹی سے لیپ لیا جاتا تھا۔ وقار حسین نے شادی کے وقت چھت تڑوا کر گول پیالی دار زمینی مٹی کے کھوپڑ چڑھا دیئے اور دیواروں میں تین کھڑکیاں لگائیں۔ آس پاس اضافی زمین بہت تھی جس میں کاجو کے دو، بٹلی آم کا ایک اور امرود کا ایک پیڑ تھا۔ برسات میں ان کے نیچے ککڑیاں، ٹماٹر، بیگن اور بھنڈی لگائی جاتی۔ پان کی ایک بیل آم کے تنے سے لپٹ کر بہت پھیل گئی تھی۔ جس کے سوکھنے کے بعد اس کا گھیرا آم کے پیڑ سے کئی برسوں تک چمٹا رہا۔

چند برسوں بعد وقار حسین اور حمید حسین نے کچھ روپیہ بنایا تو انھوں نے سُرخ پتھروں سے گھر کی از سر نو تعمیر کی۔ مگر نقشہ وہی پرانی طرز کا رکھا۔ چھت پر وہی پرانے کھوپڑ لگائے۔ اب گھر کا احاطہ پہلے کی نسبت بڑا ہو گیا تھا جس کے سبب اطراف کی زمین کم ہو گئی تھی۔

اسے ایسا لگا اڑوس پڑوس کے سارے مکانات کے درمیان اس کا گھر ایک ملازم کی طرح سرنگوں ہے۔

''کس کے دیدار کے لیے آنکھ منتظر ہے اور کن سے ملنے جا رہا ہوں۔''
''راستہ اور مسافر ایک دوسرے کی ضد میں صدیوں سے کیوں جیتے آئے ہیں۔''

﴿۵﴾

عبدالعزیز گلی سے نکل کر سرخ دھول سے اٹے راستے پر آیا جو گاؤں کو دو حصّوں میں تقسیم کرتا تھا۔ خود کلامی کا بہت مختصر وقفہ تھا جس میں بڑے مبہم سے خیالات اس کے دل میں آ رہے تھے۔ کویت جانے سے قبل اس کے سوچنے کا انداز سادہ اور یک رخی تھا۔ کویت کے قیام میں ایک بڑی تبدیلی اس کے مزاج میں آئی، جس سے اسے جہاں فائدہ ہوا وہیں پر شدید نقصان سے بھی اس کا سامنا ہونا تھا۔ بچپن میں اس نے اپنی ماں کی خالہ سے عربی کا قاعدہ پڑھا تھا جو گاؤں کے بچوں کو قرآن سیکھا کر اپنا گزر بسر کرتی تھی۔ حالانکہ عبدالعزیز کو عربی پڑھنے میں بہت دشواری ہوتی تھی۔ بہت ڈانٹ ڈپٹ کر عمر کے تیرھویں سال اس نے قرآن مکمل کیا، پھر اس کے بعد اس رسم الخط کو اس نے نہیں دیکھا تھا۔ کویت کی سرزمین پر اس کے اطراف عربی کے حروف تھے جو خاموشی سے اسے دیکھا کرتے تھے۔ پہلے پہل تو عبدالعزیز نے ان سے نظریں چرانے کی کوشش کی، پھر یہی الفاظ ہر لمحہ اس کے کانوں پر دستک دینے لگے۔ ان میں اسے ایک الاپ سا لگا جو اسے اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔ اس وقت اسے شریفہ پاؤسکر کی ایک بات رہ رہ کر یاد آتی تھی کہ ''ساری زبانیں بنیادی طور پر خوبصورت ہیں کیونکہ وہ انسانی ارتقاء کی امین ہیں۔'' وہ مسکراتا۔ ساتھ ہی اسے کالج کے استاد شندے کی بات رہ رہ کر یاد آتی۔ ''زبان کوئی بُری نہیں ہوتی بڑے ہوتے ہیں چند مفسد نظریات۔۔۔ بُرے ہوتے ہیں لوگ جو انھیں اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔''

اب وہ پاؤسکر اور شندے کی معیت سے محروم تھا۔ اس لیے اس نے ارادہ کیا کہ وہ

جتنا عرصہ یہاں رہے گا اس دوران عربی زبان کو سیکھنے کی کوشش کرے گا۔ اور واپس لوٹ کر انھیں حیران کر دے گا۔ ان کے لئے مراٹھی میں عربی کے شاعروں کو ترجمہ کرے گا۔ اس خیال سے اس کے اندر ایک ترنگ سی جا گی۔ بینک سے اپنے کمرے پر واپس آنے کے بعد اس کے پاس بہت سارا وقت ہوتا۔ اس نے بازار سے عربی انگلش ٹیچر اور عربی انگلش ڈکشنری خرید لی۔ مہینے بھر میں اس نے ان کتابوں سے بہت سے الفاظ اپنی یادداشت میں محفوظ کر لیے۔ پھر اس نے Arabicgrammar نامی ایک مشہور عراقی پروفیسر کی کتاب پڑھی اور خوب مشق کی۔ وہ صبح جلدی اٹھتا، چائے پیتا اور مطالعے کے لیے بیٹھ جاتا۔ دفتر میں اپنے مصری اور لبنانی دوستوں سے ادائیگی کو درست کرتا۔ اس کے ذوق کو دیکھ کر اس کے لبنانی دوست ماہر عفافی نے اسے اپنے گھر سے عربی درس و تدریس میں استعمال ہونے والی کتابیں لا کر دیں۔ جمعہ کے روز وہ اس کے کمرے پر آ جاتا اور عربی میں گفتگو کرنے کی مشق کراتا۔ دونوں کو معاشیات کے ساتھ ساتھ انسانی علوم میں دلچسپی تھی۔

ماہر نے بعد میں بتایا کہ وہ شاعر ہے اور عوامی زبان میں شاعری کرتا ہے۔ ماہر عفافی تجرید پسند اور مبہم شاعر تھا۔ عبدالعزیز نے اسے وہ کتاب بتائی جو شریفہ پاؤسکر نے اسے تحفے میں دی تھی تو ماہر عفافی اس کا منہ تکتا رہ گیا تھا۔

چھ سات مہینوں بعد ماہر عفافی نے عبدالعزیز کو عربی شاعری کے مختصر انتخاب پڑھنے کے لیے دیے۔ یہ گویا ایک مشق تھی۔ جو الفاظ اس کے لئے مشکل ہوتے وہ اپنی مشقی بیاض میں انھیں درج کر لیتا۔ ملاقات پر ماہر اسے ان الفاظ کے معنی بتاتا۔ عربی اخبار تو وہ روزانہ اپنے دفتر میں ہی دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا۔ ڈیڑھ سال گزرنے کے بعد عبدالعزیز عربی درست لہجے میں بولنے لگ گیا۔ جو اسے جانتے نہیں تھے وہ اسے لبنانی سمجھنے کی غلطی کرتے۔ پھر جب انھیں پتہ چلتا کہ وہ ہندی ہے تو دانتوں تلے

انگلیاں دبا کر رہ جاتے۔

ماہر ہی کے توسط سے اس نے عربی زبان کے جدید شاعر جو چھٹی اور ساتویں دھائی میں سارے خطہ ءعرب میں مشہور تھے ان کا کلام پڑھا۔ عبدالعزیز کو عراقی شاعر بدر شاکر السّیاب نے بہت متاثر کیا۔ جسے بعد میں جدید شاعری کا بانی قرار دیا گیا۔ اس کی ایک نظم اس نے شریفہ پاؤسکر کے لیے مراٹھی میں ترجمہ بھی کی۔ مگر اسے ارسال نہ کر سکا۔

ادونیس اس وقت تک کافی مشہور ہو گیا تھا۔ اور سارا خطہ ءعرب اس کی ذہانت اور نظموں کو قبول کر چکا تھا۔ اس کے اعزاز میں بیروت میں ایک تقریب تھی جس میں ماہر عفافی کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ ماہر نے اس بات کا ذکر عبدالعزیز سے کیا۔ عبدالعزیز نے ادونیس کا صرف نام سنا تھا۔ اس لیے ماہر نے اسے ادونیس کے دو مجموعے ''قصائد اولی'' اور ''اوراق فی الریح'' پڑھنے کے لئے دیے۔ ادونیس کی نظموں نے عبدالعزیز کا دل موہ لیا۔ اس کی ایک نظم جو قصائد اوّلی میں، ''بین عینک وبینی'' کے عنوان سے شامل ہے، اسے دوسری ہی قرأت میں یاد ہوگئی۔ جمعہ کے روز جب ماہر اس کے کمرے پر آیا تو دروازہ کھولتے ہی عبدالعزیز نے اس کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔۔۔

حینما اغرقی عینیك عینی
الـمع الـفجر العمیقا
واری الامـس الـعتیـقـا
واری مـالـسـت ادری
واحـس الـكون یجری
بیـن عیـنیك وبیـنـی

(نظم کا آزاد ترجمہ: میں جب تیری آنکھوں میں کھوسا جاتا ہوں۔۔ایک گہرا سایہ اور عہد گزشتہ دکھائی پڑتا ہے۔۔اور میں دیکھتا ہوں جو مجھے یاد نہیں رہتا۔۔میں ساری کائنات کو گزرتے ہوئے محسوس کرتا ہوں۔۔ تیری اور میری آنکھوں کے درمیاں)

ماہر نے عبدالعزیز سے ہاتھ ملایا۔ وہ بے حد خوش تھا۔ ادونیس اس کے پسندیدہ شاعروں میں سے تھا اس نے لبنانی لہجے میں کہا۔' یہ نظم مجھے بھی بہت پسند ہے۔

اتوار کی صبح وہ بیروت پہنچے۔ ماہر عفافی کا مکان ائیر پورٹ سے دو گھنٹوں کی مسافت پر''جبالتہ اصغر'' نامی ایک بستی میں تھا۔ اس سفر میں پہلی بار ماہر نے اپنے دل میں محفوظ بہت ساری باتیں عبدالعزیز سے کیں۔ اس نے بتایا کہ اس کے والدین فلسطینی مہاجر ہیں۔ اس کی عمر پانچ سال تھی جب وہ یروشلم سے ہجرت کر کے لبنان آئے تھے۔ اس کے والد یاسر عرفات کے ساتھیوں میں تھے۔ فلسطین کی آزادی کیلئے چھ مہینے جیل بھی جا چکے ہیں۔ اس وقت عرب اور عیسائی ساتھ ساتھ اس جدوجہد کا حصّہ تھے۔ ان کی زبان تہذیب اور ثقافت۔۔۔عقیدے کی علحیدگی کے باوجود ایک ہے۔ بعد میں آزادی کی تحریک نے مذہبی رنگ اختیار کرنا شروع کیا اور عیسائیوں کو اس سے علحدہ کیا جانے لگا۔ فلسطین کی آزادی کو بہت بڑا دھکا اسلامی شدت پسندوں کی نعرے بازی سے ہوا جنھوں نے اپنے پیرو کار بڑھانے کے لئے تحریک آزادی کو مذہبی جنگ سے تعبیر کیا۔ اس کے باوجود عیسائی ادیب ،شاعر اور صحافی اسرائیلی جارحیت کے خلاف پیش پیش رہے ہیں۔ شدت پسندوں کی وجہ حالات مخدوش ہوئے۔ نتیجتاً لبنان خانہ جنگی کے دلدل میں کئی سال گرا رہا۔ عبدالعزیز کے لئے بہت ساری باتیں انکشاف کا درجہ رکھتی تھیں۔ وہ ماہر عفافی کے من میں محفوظ ساری باتوں کو

تفصیل سے سننا چاہتا تھا اس لئے اس کی لمبی لمبی گفتگو کے دوران وہ چُپ ہی رہتا۔ لیکن جب ماہر نے کہا: ’عرب نسل پرست ہیں اور دوسری تہذیبوں کا مذاق اڑاتے ہیں‘۔ تب عبدالعزیز نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا: ’’یہ تو بہتان ہوا؟‘‘ ماہر نے اس کی طرف دیکھا اور جواب میں کہا: ’’میرے دوست ! تاریخ اس بات کی گواہ ہے۔ عرب جہاں جہاں گئے ہیں۔ انہوں نے مقامی ثقافت کو یا تو مٹا دیا یا دوسرے درجے کی چیز بنا کر اس کا مزاق اڑایا ہے۔ عرب دوسرے افراد کی مذہبی تہذیب کے منکر ہیں۔ یہاں خود خطہء عرب میں رنگا رنگ زبانیں اور ثقافتیں موجود تھیں، جنھیں عربی اقتدار نے ’’جاہلیت کی نشانیاں کہہ کر رَدّ کر دیا۔۔۔ اقتدار کا سب سے بڑا ہتھیار اس کی زبان ہوتی ہے۔‘‘

’’زبان! وہ کیسے؟‘‘

’’! اقتدار اپنی زبان کو دوسرں سے افضل ،میٹھی اور اعلیٰ ثابت کرتا ہے اور زیر اقتدار زبانوں کو رفتہ رفتہ نیست و نابود کرنے کی کوشش کرتا ہے۔‘‘

’’کیوں؟‘‘

ماہر نے مسکرا کر جواب دیا۔ ’’میرے دوست! زبان کی برتری ثقافت کو برتری دیتی ہے ،زبان کا احیاء مجموعی یادداشت کا احیاء مانا جاتا ہے۔ اسی لئے تو اسرائیل، عبرانی کو فروغ دے رہا ہے۔ مجھے خود یروشلم کی ایک بینک نے نوکری کا آفر دیا تھا۔‘‘

’’تو کیا ہوا اس کا۔‘‘

’’جب میں نے انٹرویو دیا تو انہوں نے کہا آگے چل کر عبرانی زبان بھی سیکھنی ہوگی۔‘‘

’’تو کیا برا تھا؟‘‘

''میرے لئے یہ غلامی کے مترادف ہوتا۔ پہلے انھوں نے ہماری زمین پر قبضہ کیا پھر ہمیں مجبور کریں کہ ہم ان کی زبان ختیار کریں۔ ناممکن میرے یار۔۔۔''

''لیکن یوں بھی تم عربوں کے لئے کام کر رہے ہو۔''

''عربی میری مادری زبان ہے۔ عربوں کا اور میرا صرف عقیدہ الگ ہے۔ ہماری مجموعی زندگی پر اس کے اثرات نہیں پڑتے۔ بالخصوص لبنان، فلسطین اور جارڈن میں تو ایسا لگتا ہی نہیں کہ عربوں اور عیسائیوں میں کوئی فرق ہے۔''

''لیکن ابھی تم نے ہی تو کہا تھا۔۔۔ زبان کے ذریعے وہ اپنی ثقافت کو فروغ دیتے ہیں۔''

عبدالعزیز کی دلیل اسے اچھی لگی۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے کہا۔ ''دیکھو۔۔۔ عربی زبان پر ہمارا ابھی اختیار ہے، تعلیم میں ہم ان سے آگے ہیں، بڑے ادیب اور شاعر بھی عیسائی ملیں گے۔ دوسری بات، فنکار تو مزاج سے ہی آزادی پسند ہوتا ہے اور جس زبان پر حُرّیت پسندوں کا بول بالا ہوتا ہے وہاں شدت پسندوں کے لئے زیادہ گنجائش نہیں ہوتی۔ عہدِ حاضر میں عربی زبان ایک آزاد زبان ہے۔ اس لئے بدر شاکر السیاب، محمود درویش، احمد مطر نزار قبانی، یوسف ادریس اور مصر کا وہ ناول نگار۔۔۔ ہاں نجیب محفوظ۔ یہ سارے لوگ اقتدار کی نظروں میں ریت کی طرح چبھتے رہے ہیں۔''

''لیکن اقتدار انھیں دیوار سے بھی تو لگا سکتا ہے؟''

''نہیں میرے دوست! یہی تو فرق ہے دنیا کے دوسرے ممالک اور عرب میں، تم یہ بات نہیں سمجھو گے۔''

''کیا بات''

''دیکھو! ہمارے یہاں اقتدار جن کے ہاتھوں میں ہے وہ بنیاد پرست نہیں ہیں۔

ان میں سے زیادہ تر ایسے ہیں جن کی بیویاں اور خادمائیں امریکی اور برٹش ہیں یہ لوگ آزاد خیال اور امن پسند لوگ ہیں۔ انھیں ڈران لوگوں سے ہوتا ہے جو عوامی مسائل اجاگر کرتے ہیں مثلاً احمد مطر اور نجیب محفوظ۔۔۔اس کے باوجود درمیان کا راستہ تلاش کرتے ہیں اور ان سے انتقام نہیں لیتے۔۔۔ ہمارا اقتدار پسند طبقہ جانتا ہے کہ یہی لوگ بنیاد پرستوں سے لڑ سکتے ہیں۔۔۔''

''پھر تم نے یہ کیوں کہا کہ عرب نسل پرست ہیں۔۔۔''

عزیزو۔۔۔ عام طور پر لوگ مذہبی ہیں۔ مذہبی لوگ تو اچھے ہوتے ہیں، لیکن مذہب کے نام پر شدت پسند لوگ خطرہ ہوتے ہیں۔ افسوس ہے ان دونوں دوبارہ شدت پسند ہر طرف اپنے جھنڈے لیے چھانے لگے ہیں۔ ان کی تعلیمات اور تقریروں سے آدمی ان کے جال میں ہمیشہ پھنستا آیا ہے۔ اگر آدمی سخت گیر ہو جائے تو پھر دوسروں کو حقیر سمجھنے کی حماقت کرتا ہے۔۔ عربی مسلمان ساری دنیا کو مسکین اور گمراہ سمجھتا ہے۔ تمھیں نہیں پتہ وہ ایرانیوں کو حقارت سے عجمی کہتے تھے۔ اب وہ ہندی لوگوں کو ''ہنود'' کہتے ہیں۔ اس وقت ان کا ایک مطلب ہوتا ہے ''بت پرست''

''امریکیوں کو کیا کہتے ہیں۔۔۔'' عبدالعزیز نے پوچھا۔

''انہیں وہ تعلیم یافتہ گمراہ قوم سمجھتے۔ اور کہتے ہیں۔ ''کلا امریکیون شیاطین''۔ اس پر دونوں قہقہہ لگا کر ہنستے رہے۔

''ہندی لوگوں کے بارے میں ان کا کیا تاثر ہے۔'' دوبارہ عبدالعزیز نے پوچھا۔

''سیدھی سی بات ہے عزیز۔۔۔ ہندی لوگوں کو وہ غریب، لا اعتبار اور اسفل سمجھتے ہیں۔ تم تو اچھی پوسٹ پر ہو۔ ورنہ گھروں اور معمولی کام کاج کرنے والے لوگوں کے ساتھ یہ اپنے اونٹ سے بھی بُرا سلوک کرتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے یہ اونٹ کے ساتھ بُرا سلوک نہیں کرتے ہوں گے۔'' عبدالعزیز

نے مسکرا کر کہا۔

''بالکل صحیح! اس کی جگہ انھیں انڈیا کے غلام جو دستیاب ہیں۔ برامت ماننا مگر یہ لوگ ہندی لوگوں بندوا مزدور سمجھتے ہیں۔''

عبدالعزیز نے شیشے سے باہر جھانکا۔ ایک طرف چند مخدوش عمارتیں گرد وغبار سے اٹی پڑی تھیں۔ اسے لگا یہاں نئی عمارتیں بننے والی ہوں گی۔ شاید اس لیے پرانی عمارتوں کو منہدم کیا گیا ہے۔ ماہر نے محسوس کیا کہ عبدالعزیز ان مخدوش عمارتوں کو بہت دھیان سے دیکھ رہا ہے۔ عین اسی وقت اس نے کہا۔ ''یہ بھی نسلی برتری کے لئے کی گئی کشمکش کی گواہ ہیں۔''

''کیا۔۔۔'' عبدالعزیز نے چونک کر پوچھا۔

ماہر چند لمحوں تک خاموش رہا۔ بہت ساری تلخ یادیں اس کے دماغ میں کروٹ لے رہی تھیں۔ آگ کے شعلے ہر سمت سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ گولہ باری سے اس کے کانوں کے پردے پھٹنے لگے تھے۔ شہر مذہبی سیاست اور برتری کی آگ میں جل رہا تھا۔ بیروت، لنکا میں بدل گیا تھا۔ خانہ جنگی نے دونوں قوموں کو یکساں طاقت ور لشکر میں بدل دیا تھا۔ رام دونوں کی فوج میں نہ تھے۔ آنکھوں پر نفرت کی سیاہ پٹیاں باندھے لوگوں نے ایک دوسرے کے گھروں کو جہنم کی آگ میں جھونک دیا تھا۔ امریکی اور یہودی عفریت نے آسمان کی بلندی سے اس آگ پر پیٹرول چھڑکا۔ ہر لوگ دھوئیں کی لکیروں میں بدل کر ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو گئے۔

ماہر نے دل ہی دل میں سوچا کہ اچھا ہوا شہر کا وہ حصّہ جو خانہ جنگی کی چپیٹ میں بری طرح سے جھلسا تھا عبدالعزیز نے نہیں دیکھا ہے۔ ورنہ اسے افسوس ہوتا کہ وہ اسے کس آباد خرابے میں لے آیا۔ اس خیال سے اس کے چہرے پر تفکر کی ایک لکیر ابھر آئی۔ اس کا کھلا ہوا رنگ اڑنے ہی والا تھا کہ بس ڈرائیور نے اس کی طرف دیکھ کر

کہا۔۔۔ ''سعیدی چف ھاھناک'' [جناب، آگیا آپ کا اسٹاپ] ماہر نے چونک کر دیکھا یہ اس کا اسٹاپ تھا۔ وہ بس

سے اترے۔ اترتے ہی ماہر نے کہا۔ ''تمہارے آخری سوال کا جواب پھر کبھی۔۔۔ اب گھر پاس ہی ہے۔ ماں منتظر ہوں گی۔''

ایک سفید و سرخ پتھروں سے بنے کلیسا کے پیچھے اس کا مکان تھا۔ وہ گھر میں داخل ہوئے۔ ماھر کی والدہ نے اسے گالوں پر بوسا دیا پھر اس کی بیوی اسٹیلا آئی۔ اس نے بھی اسے گالوں پر بوسا دیا۔ اس نے لائف کے بارے میں پوچھا۔ اسٹیلا نے بتایا وہ سو رہا ہے۔ لائف اس کا بیٹا تھا۔ جس کی عمر چار سال تھی۔

ماھر نے اپنی والدہ اور بیوی سے عبدالعزیز کا تعارف کیا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔ ماھر نے پہلے ہی فون پر آنے کی اطلاع دی تھی اس لئے کھانے کا اہتمام ہو چکا تھا۔ نہانے کے فوراً بعد ایک بڑے سے ڈائننگ ٹیبل پر وہ لنچ کے لئے بیٹھ گئے۔

ماھر کی والدہ ایک اسکول میں عربی زبان کی استاد تھی۔ اس نے عبدالعزیز سے ہندوستانی پکوان اور لوگوں کے بارے میں کئی سوالات کئے۔ جتنے جوابات وہ دے سکتا تھا اس نے دیے۔ ماھر نے اپنی ماں کو بتایا کہ ہندوستان کئی زبانوں کا ملک ہے۔ اور ہر زبان کا اپنا منفرد کلچر ہے۔ اس لئے سارے سوالات کے جواب دینا کسی کے لئے بھی آسان نہیں ہوگا۔ ''مجھے تو ایسا لگتا ہے ہر ہندوستانی ایک الگ زبان بولتا ہے اور اس کا مذہب دوسرے ہندوستانیوں سے الگ ہے۔''۔۔۔ اس پر وہ خوب ہنسے۔ ''اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کے گھروں کو بموں سے اڑاتے نہیں۔ بچوں پر

گولیاں نہیں داغتے۔'' اسٹیلا نے کہا جس کا بڑا بھائی بہت ہی کچی عمر میں ۱۹۷۵ کی خانہ جنگی میں ہلاک ہوا تھا۔ اس پر گولیاں اس وقت چلی تھیں جب وہ گھر سے دس قدم دوری پر اخبار لینے گیا تھا۔ اسٹیلا کی آنکھوں میں اس کے چہرے کے خطوط آج بھی تازہ ہیں۔ جو اس سے پوچھ رہا تھا گولیاں جس طرف سے آئی ہیں وہاں تو صرف ایک بڑی مسجد ہی ہے۔ کیا مسجد کا استعمال قتلِ عام کے لئے کیا جا سکتا ہے؟

''اسٹیلا ایسا نہیں ہے۔ کیا تم نے اخبار پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔'' ماھر نے کہا۔

''کیا ہے خاص۔۔۔'' اس کی ماں نے تجسس سے پوچھا۔

''ہندوستانی وزیراعظم اندرا گاندھی کا قتل ہوا۔ چند ہفتے ہی ہوئے ہوں گے۔ کہا جا رہا ہے کانگریس پارٹی ورکروں نے ہزاروں سکھوں۔۔۔ جو سر پر پگڑی باندھتے ہیں۔ ان کا قتل عام کیا ہے۔ سڑکوں پر لوگوں کو زندہ جلایا گیا ہے۔'' عبدالعزیز نے ماھر کی والدہ کی آنکھوں سے آنکھیں ملاتے ہوئے کہا۔

''مب زین [بری بات ہے۔] یعنی لوگ ہر جگہ درندگی پر اتر آتے ہیں۔'' ماھر کی ماں نے کہا۔

''کیوں کہ لوگ سیاست دانوں کے ہاتھوں کا مہرہ بنتے ہیں۔ یہ سیاست ہے۔ جو لوگوں کو لڑواتی ہے۔'' ماھر نے قدرے جوش میں کہا۔

''ہندوستان میں کئی زبانیں اور کلچر ہیں، مگر یہاں تو ہم ایک ہی زبان بولنے والے لڑتے رہے ہیں۔'' ماھر کی بیوی نے لبنانی روٹی کی تشتری اٹھاتے ہوئے کہا۔

''زبان کلچر اور مذہب۔۔۔ یہ سیاسی لوگوں کے ہتھیار ہیں۔ ساری دنیا ان کے نام پر خون خرابے سے گزری ہے۔ ہر بڑی زبان، بڑا کلچر، بڑا مذہب اپنی بالا دستی کے لئے دنیا کو جہنم بنا دیتا ہے۔'' ماھر نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم لکھنے والے، عام لوگوں کو بیدار کیوں نہیں کرتے؟'' اسٹیلا نے معصومیت کے

ساتھ کہا۔ گویا اسے یوں لگتا ہے لکھنے والے دنیا کو بدل سکتے ہیں۔

''جس دنیا کو محمدؐ اور عیسیٰؑ نہیں بدل سکے اسے لکھنے والے کیا بدلیں گے۔'' اس سے پہلے کے ماھر کچھ کہتا اس کی والدہ نے کہا۔ اور سلاد کی پلیٹ اٹھا کر عبدالعزیز کی طرف بڑھائی۔ اس نے پلیٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''انٹی! میں شاعر نہیں ہوں۔ اس کا جواب تو ماھر بھائی دیں گے۔''

''شاعر کا کام دنیا کو بدلنا ہے بھی نہیں۔'' ماھر نے کہا۔

''تو کیا ہے۔'' اسٹیلا نے فوراً سوال کیا۔

''یہ دیکھنا کہ دنیا کے حالات کا اثر انسانی نفس پر کس طرح پڑتا ہے۔ اس کی عکاسی کرنا۔ زیادہ زیادہ شاعر یہ کرسکتا ہے کہ۔۔۔'' اس سے پہلے کہ ماھر جملہ مکمل کرتا اسٹیلا نے اس کی پلیٹ میں چکن کا ایک ٹکڑا ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اپنے گھر میں بیٹھ کر چکن کھا سکتا ہے۔''

ماھر کو شاید یہ ناگوار گزرا۔ اس نے فوراً کہا۔ ''اسٹیلا Wearenotjoking!''

''اچھا بیٹا تم کہو کیا کہہ رہے تھے۔'' ماں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ اسٹیلا نے نظریں جھکالیں۔

''میں یہ کہہ رہا تھا،۔۔۔ ایک بار ماھر نے اسٹیلا کی طرف دیکھا۔ پھر جملہ آگے بڑھایا۔۔۔'' کہ شاعر یا ادیب اپنے کلچر اور زبان پر ہونے والی یلغار کے خلاف اپنا احتجاج درج کرسکتا ہے۔ جیسا کہ محمود درویش، توفیق زیاد، سمیع القاسم، فدوی طوقان اور ھارون ہاشم رشید نے کیا ہے۔''

اس کی والدہ نے ماھر کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس بار وہ بے حد سنجیدہ لگ رہی تھیں۔ کچھ دیر کے لیے خاموشی کا راج رہا۔ گزشتہ دنوں اس نے اسکول میں ''عصافیر علی اغصان القلب'' میں سے بچّوں کو انہی شعراء کی نظمیں پڑھ کر سنائی تھیں۔

فلسطین کی جدوجہد آزادی کی تصویر پیش کرنے والا یہ انتخاب چند ماہ قبل شائع ہوکر خاص و عام میں بے حد مقبول ہوا تھا۔اس کے دل میں یروشلم کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ اس کا بچپن ،اس کی نوجوانی ،ماھر کے والد کے ساتھ اس کا عشق اور شادی! پھر وہ مصائب جو شوہر کی گرفتاری کے بعد اسے سہنے پڑے۔کیوں کہ اس کے اپنے والدین پہلے ہی کینڈا ہجرت کر گئے تھے۔ ماھر اپنی والدہ کے دکھوں کو خوب جانتا تھا اس نے فوراً موضوع بدلنے کے لئے کہا۔''والد صاحب ابھی تک آئے نہیں۔کہاں ہیں وہ؟''

''وہ مہاجروں کے کیمپ میں گئے ہیں۔ جہاں میڈیکل کیمپ چل رہا ہے۔شاید ان کی واپسی کل ہوگی۔''اسٹیلا نے کہا۔

''میں نے کتنی بار کہا۔انھیں گھر میں آرام کرنا چاہیے۔''ماھر نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بیٹے۔۔وہ فلسطین کی تحریک سے جڑے ہوئے ہیں۔قید نے انھیں پست نہیں کیا۔ہم کیا کر سکتے ہیں۔''اس نے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔

''مگر ماں کیا آپ نہیں جانتیں۔حزب اللہ نے دبے لفظوں میں عیسائیوں کو تحریک سے دور رہنے کی وارنگ دی ہے۔انھیں لگتا ہے عیسائی جاسوس ہیں۔''

''ہم نے بہت سمجھایا۔''اسٹیلا نے کہا پھر عبدالعزیز کی جانب دیکھا اور اپنا جملہ مکمل کیا۔''وہ کہتے ہیں حزب اللہ کو فلسطین کی آزادی سے زیادہ ایران کے رسوخ کو بڑھانے میں دلچسپی ہے۔ان کے بہکاوے میں آئیں تو فلسطین کی تحریک کمزور ہو جائے گی۔''

''دیکھا!۔۔۔یہ نہیں مانیں گے۔ مجھے ڈر ہے کسی دن یہ حزب اللہ کے لوگ انھیں مار نہ ڈالیں۔''ماھر نے عبدالعزیز سے مخاطب ہوکر کہا۔

''بیٹا یوں نہ کہو۔سارے لوگ حزب اللہ والوں کی طرح نہیں ہیں۔عرفات نے

حزب اللہ پر ہمیشہ تنقید کی ہے۔"

"ماں، یہ لوگ مذہب کو درمیان میں لا کر۔۔۔" ماھر نے عبدالعزیز کی طرف دیکھا جو آہستہ آہستہ مجبوس کھا رہا تھا۔ پھر کہا "خیر اب چھوڑو اس بحث کو۔ ہم لوگ قیلولہ کر کے نکل جائیں گے۔شام بیروت میں پروگرام ہے۔ وہیں سے لوٹ جائیں گے۔"

"ارے اتنی جلدی کیا ہے ٹھہرو گے نہیں دو ایک دن۔ انھیں کچھ سیر و تفریح نہیں کراؤ گے؟"

"کھنڈرات کے علاوہ کیا رہ گیا ہے یہاں ماں!"

"بہت کچھ ہے۔" اس کی نے ماں زور دے کر کہا۔

"مجھے تو لگتا ہے چند برسوں میں یہ خطّہ منہدم عمارتوں کے میوزیم میں بدل جائے گا۔ میں تو چاہتا ہوں آپ بھی کینڈا چلی جائیں۔"

'ہرگز نہیں۔۔۔"نحن عصافیر علی اغصان القلب وقلوبنا ارض الفلسطین "(ہم دل کی شاخوں پر بیٹھے پرندے ہیں اور ہمارے دل ارض فلسطین ہے) ماں نے دمدار آواز میں کہا۔ ماں کی بات سن کر ماھر نے تافیق زیاد کی "ھنا باقون" سے دو مصرے پڑھے۔

وفی قلوبنا جهنم حمرا

اِذاعطشنا نعصرُ الصّحرا

(آزاد ترجمہ: ہمارے دلوں میں سرخ جہنم ہے۔۔اگر ہمیں پیاس لگے تو ہم صحرا بھی پی لیتے ہیں۔) ماں کی آنکھوں میں دوبارہ ایک جوش ایک ولولہ چھلک پڑا۔اس نے نظم کے باقی مصرعے ادا کیے۔

ونا کلُ التّراب اِن جعنا۔۔۔ وَ لا نر حلَ!!

وبالدّم الزکی لانبخلُ۔۔۔

لا نبخل۔۔۔ لانبخل۔۔۔ لانبخل

ھُنا۔۔۔ لَنا ماضٍ۔۔۔ وحاضر۔۔۔ ومستقبل

(آزاد ترجمہ: ہمیں بھوک لگنے پر ہم کیچڑ پر بھی گزارا کر لیتے ہیں مگر ہجرت نہیں کرتے۔۔ہم اپنی ذات میں سخی ہیں۔۔بخل نہیں کرتے۔۔بخل نہیں کرتے۔۔بخل نہیں کرتے۔۔بخل نہیں کرتے۔۔۔ہم۔۔ہم ماضی۔۔اور حاضر اور مستقبل ہیں۔)

اسٹیلا نے زوردار تالیاں بجائیں۔ ماھر نے بھی تالیاں بجائیں۔ان کی دیکھا دیکھی عبدالعزیز نے بھی تالیاں بجائیں اوران کی آواز کے ساتھ آواز ملائی۔

ھنا۔۔۔لنا ماضٍ۔۔۔۔۔حاضر۔۔۔۔۔۔۔و مستقبل

یہ نظم تحریک آزادی کے ترانے کے طور پر ہر فلسطینی کو یاد تھی۔اس کے بول ان کی فلسطین سے محبت کے گواہ تھے۔فلسطین ان کا ماضی، حال اور مستقبل تھا۔وطن سے محبت کے لئے مذہب شرط نہ تھا، نہ وطن ایک مذہب کے ماننے والی کی جائداد تھی۔ آج عبدالعزیز نے عیسائی عرب، فلسطین گھر کی جو دنیا دیکھی تھی اس کے اثرات اس پر ہونا فطری ہے۔اپنی زبان، اپنے کلچر اور اپنے وطن کی مٹّی کی خوشبو سے ان لوگوں کے رشتے کی گہرائی نے اسے متاثر کیا تھا۔یہ وہ دن تھا جس نے اس کے اندر سیاسی وسماجی بیداری کے لئے راہ ہموار کی۔اسے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ فلسطین کی آزادی میں عیسائی بھی برابر کے شریک ہیں انہیں عربی زبان، ادب اور ثقافت پر ناز ہے۔یہ وہ باتیں تھیں جنہیں چند برسوں بعد حزب اللہ اور حماس جھٹلانے والی تھیں۔

❧

کھانے کے بعد ماہر اپنے بیٹے کے ساتھ کھیلتا رہا۔عبدالعزیز ایک کمرے میں آنکھیں موندھے اوندھا پڑا رہا۔اس کے ذہن میں ایک سوال بار بار ہچکولے لے رہا

تھا''میری مادری زبان کون سی ہے۔۔۔میرا کلچر کیا ہے۔''

چار بجے وہ گھر سے نکلے اور قریب ساڑھے چھ بجے بیروت پہنچے۔ ہوٹل ''سموات'' میں ادونیس کے اعزاز میں جلسہ ہونا تھا۔

جلسہ گاہ میں عبدالعزیز پہلی قطار میں بیٹھ گیا۔ ماہر اپنے کچھ پرانے دوستوں کے ساتھ گفتگو کرتا رہا۔ بالآخر سٹیج سے اعلان ہوا کہ ادونیس تشریف لا چکے ہیں اور ان کے ساتھ۔ (سب کو یہ سن کر حیرانی اور بہت خوشی ہوئی) عربی دنیا کے سب سے اہم شاعر نزار قبانی بھی تشریف فرما ہیں۔

ایک طرح کی گہما گہمی ہر طرف نظر آئی۔ دو تین ٹی وی کیمرا والے فوراً حرکت میں آئے جو ایک طرف کچھ دیر سے کھڑے تھے۔ صحافیوں نے بھی اپنے کیمرے تیار کیے۔ جوں ہی اسٹیج کا پردہ اٹھا لوگوں نے زوردار تالیاں بجائیں۔ اسٹیج پر نزار قبانی اور ادونیس ایک ساتھ کھڑے تھے۔ ناظم تقریب نے مہمانوں سے کرسیوں پر بیٹھنے کی درخواست کی۔ پھر مدعو شعراء کو پکارا گیا۔

صدارت نزار قبانی کی تھی۔ ابو حنا نے ایک چھوٹی سی تقریر ادونیس کی نظموں کے پس منظر میں کی۔ لوگوں نے اسے بہت پسند کیا۔ ادونیس کو نزار قبانی کے ہاتھوں ایک سفید پھولوں کا دستہ اور چاندی کا تمغہ پیش کیا گیا۔ اس کے بعد ادونیس نے ''شاعر اور ثقافت'' کے موضوع پر بیس منٹ انتہائی نرم وشیریں لہجے میں تقریر کی۔ جس کے بعض نکات عبدالعزیز اپنی بیاض میں لکھتا بھی رہا۔

تقریر کے بعد مدعو شعراء نے ایک ایک نظم سنائی۔ ان کے بعد ادونیس نے اپنی نظم۔ قالت الارض [زمین کہتی ہے] سنائی۔ لوگوں نے خوب داد دی۔ اپنی نظم کے اختتام پر ادونیس نے بڑے احترام سے نزار قبانی سے گذارش کی کے صدارتی خطبے

سے قبل وہ چند نظمیں سنائیں۔ نزار قبانی نے شہرہ آفاق نظم ''رسالة تحت الماء'' کا کچھ حصہ سنایا۔ پھر تازہ نظموں میں سے 'حبیبتی و المطر' سنائی۔

نظم کو سن کر محفل پر ایک طرح کا سکوت طاری ہوگیا۔ سامعین نے دوبارہ نظم سنانے کی گذارش کی اور نزار قبانی نے محبت میں محو عاشق کی طرح یہ نظم سنائی۔ ایک (رقیق القلب) شاعر اسٹیج پر روہانسا ہوگیا۔ ناظم محفل نے پانی کی بوتل اسے پیش کی۔ اس نے دو گھونٹ پانی پیا اور اسٹیج سے اتر گیا۔

اس نظم کو نو دس سال بعد عراق کے مشہور گلوکار، کاظم الساحر نے اپنے البم کے لئے گایا۔ البم کو اسی نظم سے منسوب کیا۔ یہ البم بعد میں عرب نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن کا اظہار بن گیا۔ جذبہ محبت کا اعلان بن گیا۔ اس البم کی ریلیز سے چند ماہ قبل ہی صدام حسین نے کاظم الساحر کو عراق سے نکل جانے کا اشارہ کردیا تھا۔ اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے کسی محفل میں انسانی حقوق سے محروم غریب عوام کی حمایت میں ایک گیت گایا تھا۔

تقریب کے اختتام پر عبدالعزیز کا دل ادونیس سے ملاقات کے لئے بے تاب ہوگیا۔ وہ بیک اسٹیج پر گیا جہاں چائے کا دور چل رہا تھا۔ عبدالعزیز نے بیگ سے ادونیس کا مجموعہ 'قصائدادٔ لی' نکالا اور اس کے قریب پہنچ کر کھڑا ہوگیا۔ ماہر نے اسے دیکھ لیا۔ اس وقت وہ ایک مصر کے شاعر سے گفتگو کر رہا تھا۔ ماہر سمجھ گیا عبدالعزیز کیا چاہتا تھا۔ اس نے اسے ادونیس سے ملایا۔ ادونیس کو یہ سن کر بے حد خوشی ہوئی کہ وہ ھندی ہے اور عربی شاعری سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اس نے کتاب پر دستخط کئے اور ساتھ ہی فرانس کا اپنا پتہ بھی لکھا۔ چند سوالات کے جواب مختصراً اور مدلل انداز میں دئے۔ پھر عبدالعزیز سے کہا کہ خط و کتابت کیا کرے۔ اس پیشکش سے عبدالعزیز کو بہت خوشی ہوئی۔

ادونیس اور نزار قبانی کو نوجوان شعراء اور ادباء گھیرے رہے۔ عبدالعزیز نے نزار قبانی کو عقیدت اور محبت بھری نگاہوں سے دیکھا اور زیرلب اس کی نظم ''رسالۃ تحت الماء'' کی چند سطریں گنگنائی۔ جنھیں مصر کے مشہور سنگر 'عبدالحلیم عبدالحافظ' نے گا کر لافانی کر دیا تھا۔

اگر تم قوی ہو

تو مجھے بچالو اس سمندر سے

مجھے تیرنا نہیں آتا

مجھے کھینچتی ہیں...... گہرے عمیق سمندر میں

نیلی...... نیلی......

کچھ نہیں ہے سوائے نیلے رنگ کے

نہ مجھے محبت کا تجربہ ہے

نہ میرے پاس کوئی کشتی ہے......

دس پندرہ منٹ ماہر اپنے دوستوں سے بات چیت کرتا رہا۔ پھر عبدالعزیز نے اسے اشارہ کر کے بتایا کہ فلائٹ کا وقت ہوا چاہتا ہے۔

ہوٹل سے باہر آ کر انہوں نے ٹیکسی پکڑی اور ائیر پورٹ کا رخ کیا۔

اس سفر نے اس کے اندر بہت ساری تبدیلیاں لائیں۔ اس کے سوچنے کے انداز کو نئی سمت عطا کی۔ اس نے شاعری کی طرف زیادہ سنجیدگی سے دیکھنا شروع کیا۔ جس نے خیالات کی ترسیل و تفہیم کو اس کے لئے آسان کر دیا۔ وہ ابہام اور کنائے سمجھنے لگا۔ ایک روز اس نے عربی کی مشقی بیاض پر لکھا؛ ''یہ سمجھنا ضروری ہے کہ انسان کن باتوں کو ادا نہ کرنے کے لئے دوسری باتیں کرتا رہتا ہے۔''

اس کی گفتگو میں رفتہ رفتہ اختصار آ گیا۔ اس کے خیالات میں ایک مثبت و منطقی استدلال......اب الفاظ کا غیر ضروری استعمال اسے کھلنے لگا۔ الفاظ کے بے معنی استعمال کرنے والوں کے جسم سے اسے عجیب سی بو محسوس ہوتی گویا بات کرنے والے کا باطن سڑ رہا ہو۔ اس نے ایسے لوگوں سے بات کرنا کم کر دیا جو لفظوں کے استعمال میں بے حس تھے۔

گانو واپسی پر جب وہ گھر سے باہر نکلا تب ذہن میں یہ بات آئی کہ ''راستے اور مسافر ایک دوسرے کی ضد میں صدیوں سے کیوں جیتے آئے ہیں۔'' تو وہ جانتا تھا ہے کہ اس جملے سے اس کی مراد کیا نہیں ہے۔۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اگر وہ یہ جملہ کسی کو سنائے گا تو سننے والا کچھ بھی نہیں سمجھے گا۔ اس جملے میں معنی کی متعیّن تعبیر نہیں ہے اور تعبیر کی شرح کے مسئلے سے وہ واقف ہو چکا تھا۔

قیامِ کویت کی عبدالعزیز کو سب سے بڑی دین ذہنی ساخت میں تبدیلی تھی جس کے سبب اس کے جملوں میں تخلیقی نثر کا لطف پیدا ہو گیا تھا۔

﴿٦﴾

کچی سڑک پر سرخ مٹی چمک رہی تھی۔ سڑک کے دونوں کناروں پر جو پیڑ پودے لگے ہوئے تھے ان پر سرخ مٹّی کی تہہ ہمیشہ چڑھی ہوئی رہتی تھی صرف بارش کے چار مہینے یہ کپڑے بدل کر مسکرایا کرتے تھے۔

وہیں موڑ پر ایک بہت پرانا جامن کا پیڑ تھا، پیڑ کے پاس ایک بہت بڑا پتھر تھا۔ اس پتھر کے متعلق دو باتیں مشہور تھیں (۱) یہ ہزاروں سال سے موجود ہے۔ (۲) اور یہ آسمان سے بھیجا ہوا ہے۔

آدی واسیوی جب بھی گانو میں آتے تو اس پتھر کے پاس ٹھہر کر دعا کرتے۔ ان کا

ماننا ہے کہ یہ مقدس پتھر ہے۔اس میں آسمانی طاقت ہے۔ مسلمان بچے اس پر چڑھ کر کھیلا کرتے۔عبدالعزیز کی نظراس پر پڑی تو اسے وہ دن یاد آ گئے جب وہ بھی اس پتھر پر بیٹھ کر دوستوں کے ساتھ گپ شپ کیا کرتا تھا۔ وہ پتھر کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے گردن اٹھائی اور جامن کی پھیلی ہوئی شاخوں کو دیکھا۔ جامن وہ کس اشتیاق سے کھایا کرتا تھا۔

لیکن جس بات نے اس پتھر کے پاس اس کے قدموں کو روکا وہ دوسری تھی۔جس روز سکینہ کے ساتھ وہ ندی کنارے بارش اور محبت میں شرابور ہوا تھا اس شام وہ بہت دیر تک اس پتھر پر اکیلے بیٹھ کر برسات میں بھیگتا بھی رہا تھا۔موٹی موٹی بوندیں اس کے سر پر برستی رہی تھیں۔

یخ بستہ ہواؤں نے جامن کی شاخوں کو سر بھی سرشار کر دیا تھا۔سرشاری سے وہ جھرجھری لیتیں تو پتوں پر جمع پانی کیف پرور موسیقی کے ساتھ گرتا۔اس دن عبدالعزیز نے نڈر ہو کر محبت کا لطف حاصل کیا تھا۔مہینوں کی تڑپ اور الجھن اس لطف کی تمازت سے اس کے اندر سے بہہ کر نکل گئی تھی۔ وہ مسرور اور بے حد خوش تھا۔اس کے دل کی پیاس سکینہ کی زمین کے لمس سے بجھ گئی تھی۔ لااعتباری اور ڈر کی جو حالت اس پر گراں بار ہوئی تھی اسے سکینہ کی خوشبو نے مٹا دیا تھا۔آج سکینہ نے اسے بانہوں میں بھر کر محبت کا اقرار کیا تھا۔

وہ سکینہ سے بدظن تھا۔جب اس نے کہا تھا ’’کچھ نہیں، تو چلے جا۔۔۔‘‘ تو اسے ایسا لگا تھا کہ یہ جملہ اس نے ناپسندیدگی کے ساتھ کہا ہے۔اس غلط فہمی نے اس کو دوبارہ اس کے گھر جانے سے روک رکھا۔اسے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر وہ پھر اس کے دروازے پر گیا اور اس نے دوبارہ اسے لوٹا دیا تو اس کا دل بری طرح سے ٹوٹ جائے گا۔اس کا دل وسوسوں سے بھر گیا تھا۔ جو سکینہ اور اس کے درمیان ہوا تھا وہ ناقابل فراموش اور

یکساں طور پر نا قابل یقین تھا۔ جوں جوں دن گزرتے گئے، اس کی یادداشت نے اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنا شروع کیا۔ وہ آنکھیں بند کر کے تمام لمحوں کو جب دوبارہ ذہن میں اجاگر کرنا چاہتا تو مناظر اور احساسات آپس میں گڈمڈ ہو جاتے۔ دوسرے واقعات، دوسرے لوگ، دوسرے اتفاقات بھی ان لمحوں ذہن میں در آتے اور وہ سوچ کے مقصود دھارے سے بھٹک جاتا۔ اتصال کا جو نغمہ اس کی روح میں محفوظ تھا وہی فراموشی کے حزنیے میں بدل جاتا۔

اس لئے جب سکینہ کے روبرو وہ بارش میں آم کے پیڑ کے نیچے کھڑا تھا اس وقت اس کے دل کا دماغ اور بدن سے رابطہ کمزور پڑ گیا تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ سکینہ بھی اس سے محبت کرنے لگی ہے اور اس سے ملنے کے لئے اتنی ہی بے قرار تھی۔ اس لئے مبہوت ہو کر وہ سکینہ کو دیکھتا رہ گیا تھا۔

مگر جب وقت نے کروٹ لی اور وہ کہانی کے دوسرے پڑاؤ پر تھا جہاں ندی کے بہاؤ میں محبت کا عرق رواں اس نے بہتے ہوئے دیکھا تب اس کا یقین۔۔۔ ایمان میں بدل گیا۔

اس خوشی سے اس کے اندر ایک شعلہ سا بھڑک اٹھا تھا ورنہ اتنی دیر تک بارش میں بھیگنے پر وہ کانپنے لگ گیا ہوتا۔

شام کو پتھر پر بیٹھ کر وہ بہت دیر تک بھیگتا رہا۔ برسات کی بوندیں شور کے ساتھ گر رہی تھیں۔ اس شور میں اس کے لب سکینہ کا نام لیتے رہے۔ اس کے ہونٹوں سے سکینہ کے نام کے حروف ادا ہوتے تو ایک گرم سانس اس کی حلق سے نکل کر بارش کی لہروں میں تحلیل ہو جاتی۔ یکایک، اس کی نظر ایک تکونی پتھر پر پڑی۔ اس نے اسے

اٹھایا اور دوبارہ پتھر پر چڑھ گیا۔ ایک نظر اطراف میں دوڑائی۔ لوگ گھروں اور بستروں میں دبک گئے تھے۔ البتہ اس کی عمر کے لڑکے رہ رہ کر یہاں وہاں بھاگم بھاگ کرتے دکھائی دیتے۔

جب اسے اطمینان ہو گیا کہ جامن کے پیڑ کے علاوہ اسے کوئی نہیں دیکھ رہا ہے تو اس نے تکونی پتھر سے جامن کے تنے پر مراٹھی میں سکینہ کے نام کے حروف بنائے۔ تنے کی خال بہت مضبوط تھی۔ اسے بڑی مشقت کرنا پڑی۔ اس کی ہتھیلی میں پتھر کی رگڑ سے جلن ہونے لگی۔ مگر اس نے بارش اور محبت کے نشے میں ڈوب کر کسی مدہوش شرابی کی مانند اپنا مشن جاری رکھا۔ اس نے نام کے حروف کاڑھے تھے نام نہیں لکھا تھا۔ ان کو ملا کر فوراً ''سکینہ'' بنانا دوسروں کے لئے آسان نہ تھا۔ پھر اس نے حروف کے گرد دل بنایا اور دبی زبان میں کہا۔ ''اس دل میں تو ہمیشہ رہے گی۔''

جوں ہی وہ جامن کے پیڑ کے نزدیک پہنچا اسے اپنا یہ جملہ یاد آیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک معصومانہ مسکراہٹ ابھری۔ اس مسکراہٹ میں پیڑ پر بنائے ہوئے نشان کو دیکھنے کا اشتیاق بھی شامل تھا۔ وہ بڑے پتھر پر چڑھ گیا۔ تنے کے اس حصے کو اس نے قریب سے دیکھا...... اس کے دل میں وہی پرانی بارش کا کیف دوبارہ لوٹ آیا۔ جہاں وہ حروف کاڑھے گئے تھے وہاں کی خال کے اتنے حصے کے گرداب باریک سیاہ ریشے پھیل گئے تھے۔ مگر آج بھی وہ ان حروف کو پڑھ سکتا تھا اس نے ہتھیلی پھیری ،آنکھیں اس کی پل بھر کے لئے بند ہوئیں۔۔۔ اسے یوں لگا اس نے ابھی ابھی سکینہ کے لمس کو محسوس کیا ہے۔ تنے کی کھردری سطح اس کے لئے گداز جسم کی ملائمت میں کیسے بدل گئی۔۔؟؟

وہ اداس ہو گیا۔ یہ محبت کے سبب پیدا ہونے والی اداسی تھی جو تنہائی کی طرح

زہریلی ہوتی ہے۔

وہ پتھر پر سے نیچے اتر گیا اور موڑ کاٹ کر آگے بڑھ گیا۔ اسے ڈر تھا کوئی اسے اتنے برسوں بعد اچانک اس حالت میں دیکھے گا تو جانے کیا سوچے گا۔ گانو میں ہر بات ایک کونے سے دوسرے کونے میں پل بھر میں پھیل جاتی ہے۔ وہ باتیں بھی جن کو دلوں میں محفوظ کرنے کی لوگ آپس میں قسمیں کھا لیتے ہیں۔ کوئی جادوئی طاقت تھی جو مجبور کر دیتی اور لوگ باتیں چھپانے میں ناکام ہو جاتے تھے۔

عبدالعزیز کے گانو میں قدم رکھنے سے پہلے ہی پورے گانو کو اس کی واپسی کا علم ہو گیا تھا۔ وہ جوں ہی اپنے رشتے داروں کے گھر پہنچتا اس کے دہلیز پر قدم رکھتے ہی چائے، ساندنے، گلوکوز بسکٹ، کھارے بٹر، گھاٹئے، اور گھر کا بنایا ہوا پھوے کا چوڑا ایک ٹیبل پر سجا نظر آتا۔ خلیجی ممالک سے لوٹنے والے پر لازم تھا کہ پیش کی گئی چیزوں میں سے وہ تھوڑا بہت کھائے۔ ورنہ اس کے بارے میں مندرجہ ذیل میں سے کوئی ایک جملہ گانو بھر میں گشت کرنے لگ جائے گا۔

۱) دینار سے گرمی چڑھ گئی ہے۔

۲) ہم کیا چائے میں زہر ڈالنے والے تھے۔

۳) اسے لگتا ہے ہم تعویز پلا دیں گے۔

۴) تھوڑا مغرور ہو گیا ہے۔

۵) اس میں پہلے جیسا اپنا پن نہیں رہا۔

۶) ارے کل ہمارا لڑکا بھی گلف جائے گا۔ آج ہی دنیا ختم نہیں ہوئی ہے۔

اس طرح کے لیبل سے بچنے کے لئے کوئی انکساری سے کام لے اور خوب گھل مل کر گفتگو کرے تو دوسری مصیبت۔ ایسے شخص کے بارے میں مندرجہ ذیل میں سے کوئی نہ کوئی بات پھیل جاتی۔

۱) اندر کی گانٹھ کا ہے۔ سب دکھاوا ہے۔
۲) ہاتھی کے کھانے کے دانت اور ہیں دکھانے کے اور۔
۳) اپنی ماں/باپ پر گیا ہے۔
۴) ہم کو ایڑا سمجھتا ہے۔
۵) بدھو کا بدھو رہا۔
۶) دولت سے عقل آتی ہے کیا؟

اہل کوکن نام رکھنے اور لیبل لگانے میں دوسری کسی قوم سے پیچھے نہیں ہیں بلکہ دو ایک قدم، آگے ہی ہوں گے۔ چوں کہ اس عمل میں سب کا رول ہے اس لئے ان بنیادوں پر آپس میں اختلافات نہیں ہوتے۔ یہ کلچر کا حصہ ہے گویا۔ گانو میں سب کے ایک سے زائد نام ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ نام جو والدین اور گھر والے رکھتے ہیں اور دوسرا یا دیگر نام جو گانو والے آپسی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ابراہیم کو ابو یا ابا کہا جاتا ہے۔ یہ دوسرا نام اہل کوکن کے طنز ومزاح اور ظرافت کی دلیل ہے۔ بعض خوش نصیب ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے اتنے زیادہ نام ہوتے ہیں کہ لوگ اصل نام کی جگہ کبھی کبھار فرضی نام پکارنے کی گستاخی کر بیٹھتے ہیں۔

﴿۷﴾

ظہر کی اذان تک وہ گانو میں اپنے قریبی رشتے داروں اور دوستوں کے گھروں کو پیر لگا چکا تھا۔ ''گھروں کو پیر لگانا'' کوکنی محاورہ ہے۔ جب کوئی شخص گانو سے دور ،روزگار کے لئے جا کر لوٹتا ہے، تب اس پر لازم ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے گھر جا کر ان سے ملے۔ سورل میں اسے ''گھرالا پایے لان یے'' کہتے ہیں۔ چوں کہ کوکنی باقاعدہ تحریری زبان نہیں ہے اس لئے کوکن کے ہر گانو کی لفظیات میں فرق ہے۔ ہر گانو کی بولی دوسرے گانو سے مختلف ہوتی ہے اس کے باوجود۔ کوکنی ایک بہت بڑی آبادی

کے کلچر اور لاشعور کی آئینہ دار ہے۔ کوکنی، مراٹھی زبان کی ایک دھارا لگتی ہے جس میں عربی اور فارسی کے الفاظ مل گئے ہیں۔ جو کوکنی ہندو افراد بولتے ہیں اس میں مراٹھی زیادہ ہوتی ہے۔

زبانوں کے حقوق کی طرح بولیوں کے بھی حقوق ہیں۔ بولی کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ زبانوں کی موجودگی میں بھی اسے زندہ رہنے، ترقی کرنے اور اپنے کلچر کو فروغ دینے کا موقعہ ملے۔ وہ زبان جو بولیوں پر حملہ آور ہو اور اپنے دبدبے کو قائم کرنے کے لئے ان کا مذاق اڑائے وہ زبان شر پسندوں، نسل پرستوں اور انسانی حقوق کے قاتلوں کی زبان ہوتی ہے۔ وہ زبان جو اقتدار کی طرف سے جبراً نافذ کی جاتی ہے وہ زبان نہیں بلکہ لوگوں کے گلوں میں غلامی کا طوق ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ زبان جو مذہبی سیاست کے نام پر، یا مذہبی جذباتیت کے نام پر لوگوں کے حلق میں ٹھوسی جاتی ہے اسے ابلیس کی مقعد سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ وہ زبان جسے مذہب کی شرط قرار دیا جاتا ہے وہ زبان دوسرے انسانوں کی توہین ہے۔ اور وہ زبان جسے غیر زمینی یا آسمانی کہا جائے وہ زبان انسانی تباہی کا راگ / منتر ہوتی ہے۔ جسے جب بھی اقتدار حاصل ہوگا زمین پر خون خرابے کے بادل منڈلانے لگیں گے۔

﴿۸﴾

عبدالعزیز گھر میں داخل ہوا تو اسے یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ اس کے بچپن کے دوست صابر، رفیق ونو اور رشید وٹے دار میں ہی اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اسکول کے دنوں میں یہ اس کے ہم جولی اور راز دار تھے۔ قریب آدھے گھنٹے سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی وہ کھڑے ہو گئے۔

انھیں دیکھتے ہی عبدالعزیز کے ذہن میں اسکول کے دنوں کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ وہ ان کے گلے ملا۔

چاروں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ پرانے دنوں کی باتیں۔ اسکول میں کی گئی شرارتوں کی باتیں۔ ان لڑکیوں کی باتیں جنھیں اسکول کی چھٹی کے بعد وہ ڈراموں کی ریہرسل کے لئے رکوا لیتے اور گپ شپ کیا کرتے۔ ان ٹیچروں کی باتیں جن سے نمبر بڑھوانے کے لئے وہ ان کی جھوٹی تعریف کیا کرتے۔

ان لوگوں کی باتیں جو اچانک اللہ میاں سے ملنے کے لئے دنیا کو خیر باد کہہ کر دوسری دنیا منتقل ہو گئے۔ گفتگو جاری تھی کہ یکا یک رشید نے کہا۔ ''خیر۔۔نماز کا وکت ہوگیا ہے۔''

''ٹھیک ہے تو نکل...... ورنہ تیرے ابّا...... خالی پھوکٹ، ہم لوگوں کے گھر پہنچ جائیں گے۔'' صابر نے کہا۔

......رشید نے اٹھ کر عبدالعزیز سے ہاتھ ملایا۔ اور باہر نکل گیا۔ ابھی وہ گلی کے موڑ پر پہنچا ہوگا کہ عبدالعزیز نے صابر سے پوچھا۔ ''اس کے والد تم لوگوں کے گھر کیوں پہنچ جائیں گے......''

''یار...... اتنے برسوں بعد تو گانو آیا ہے۔۔۔'' رفیق نے کہا۔

''تو کیا ہوا۔ ہوں تو اسی گانو کا۔۔'' عبدالعزیز نے رفیق سے براہ راست کہا۔

''گانو...... بہت بدل گیا ہے۔'' صابر نے قدرے تحمل سے کہا۔

''کیا بدلا ہے یار...... ہاں کچھ گھر بنگلوں میں بدل گئے ہیں۔ ۔ اور کیا؟'' عبدالعزیز نے صابر کی بات پر اپنی رائے رکھی۔

''ایسا نہیں ہے، ہم تجھے شام کو سمجھائیں گے۔ کھانا وانا کھا کر تو پہلے تھوڑا آرام کر لے۔ ہم واپس شام کو آئیں گے، تب تفصیل سے بات ہوگی۔'' رفیق ونو نے

بھانپ لیا تھا کہ عبدالعزیز بہت ساری تبدیلیوں کی سنگینیت سے ابھی واقف نہیں ہے۔

''اورسن! باہر چلنے کا ہے گھومنے...... زمانہ ہوگیا تیرے ساتھ بھٹکے ہوئے۔'' صابر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

حامی بھرتے ہوئے عبدالعزیز دروازے تک انھیں رخصت کرنے گیا۔ وہ پائے دان سے نیچے اترے۔ پھر مڑے، مسکرائے اور آگے بڑھ گئے۔

۹

عبدالعزیز وہیں دروازے پر کھڑا رہا۔ انھیں گلی میں ایک دوسرے کے کندھے پر باہیں ڈالے سڑک کی اور جاتے دیکھتا رہا۔ باہر دھوپ چمک رہی تھی۔ شاید پاس کی سڑک پر آٹو رکشا گزرا تھا۔ ہلکے شور کے ساتھ سرخ غبار ایک لکیر کی طرح ہوا میں اوپر اٹھتا دکھائی دیا۔

بچپن میں روزانہ انہی دوستوں کے ساتھ وہ دیر شام تک کھیلتا رہتا تھا۔ یہاں تک کے سرخ مٹّی اس کے پیروں، ہاتھوں اور چہرے پر ایک پرت بنالتیں۔ گھر لوٹنے پر مہرون اسے خوب کوستی۔ بلّی کے دانت تھے۔ پھر نہلاتی۔ مہرون اسے آنگن یا منگیلدار میں آسمان کے نیچے صابن لگا کر ناریل

کے کاتھے سے خوب ملتی۔ سرخ مٹّی سرخ جھاگ میں بدل جاتی۔ مہرون دو تین ٹوپ پانی اس کے سر پر انڈیل دیتی۔ وہ چلاتا۔ کودتا۔ ہنستا۔ اور جب کبھی صابن آنکھوں میں چلا جاتا تو دھاڑیں مار مار کر روتا۔ مہرون مزید پانی انڈیلتی اور آس پاس کے لوگ اس منظر سے لطف اندوز ہوتے۔

سرخ جھاگ تھوڑی دیر تک زمین پر گاڑھی پرت کی صورت منجمد رہتا۔ پھر پیاسی دھرتی پانی کے قطروں کو چوسنے لگتی۔ رات آجاتی۔ سرخ مٹّی وہیں رات بسر کرتی۔ دوسرے دن سورج مسکراتے ہوئے نیند سے بیدار ہوتا۔ زمین کی اوپری سطح پر جہاں

کہیں نمی ہوتی اسے چائے سمجھ کر پی لیتا۔ نینداس کی اڑ جاتی اور وہ نصف النہار کی طرف بڑھنے لگتا۔ سرخ مٹی کی کایا کلپ ہو جاتی۔ ہوا کی بارات گنگناتے آتی اور مٹی تتلیوں میں بدل کر اڑ جاتی۔

یہ چکر صدیوں سے جاری ہے۔ کوکن کی سرخ مٹی دھوپ میں چمکتی رہتی ہے۔ اور بارش میں لہو بن کر بہتی ہے۔ اس کا کوکن کے لوگوں سے بہت گہرا رشتہ ہے۔

مٹی اور آدمی، موسم اور آدمی، اور رنگ اور آدمی ایک دوسرے کی پہچان ہوتے ہیں۔ کوکن کا آدمی یہاں کی مٹی، موسم اور رنگوں سے فطری مطابقت رکھتا ہے۔

☆

وقت دبے پاؤں گزرتا گیا اور ایک روز مہرون یہ سن کر بھونچکی رہ گئی۔

''میں چڈی نہیں اتاروں گا۔''

''کیوں رے...... بڑی حیرانی کے ساتھ مہرون کی زبان سے ادا ہوا۔

''مجھے شرم آتی ہے۔''

مہرون ہنس ہنس کر گویا پاگل ہوگئی تھی۔ عبدالعزیز اپنا سا منہ بنا کر اسے دیکھتا رہا۔ مہرون نے جبراً اسے پکڑ کر اس کی چڈی اتاری اور صابن لگا کر اس کے پورے بدن کو کاتھے سے گھسنے لگی۔ وہ احتجاج کرتا رہا اور مہرون کہتی رہی۔ ''میرے سامنے کا کیڑا مجھے کہتا ہے۔ شرم آرہی ہے۔ کوئی بتاؤ...... ہے کوئی مجھے بتانے والا۔''

چند روز گزر گئے۔ مہرون نے بھی اس کی چڈی اتار کر اسے نہلانے کی ضد کرنا چھوڑ دیا۔ اب وہ خود بھی صابن ملنے لگ گیا تھا۔ مگر مہرون کو اس وقت تک تسلی نہیں ہوتی جب تک وہ خود ناریل کے کاتے سے اس کے بدن کے ایک ایک پور کو صاف ستھرا نہ کرے۔ نہلانے کے بعد وہ ٹاویل یا کسی کپڑے سے اسے پوچھتی۔ اس کے بالوں پر ناریل کا تیل لگاتی۔ کنگھی کرتی۔ کبھی کبھار اس کے بدن پر پاؤڈر بھی چھڑکتی۔

اس کی آنکھ اس وقت تک نہیں لگتی، جب تک اپنے بیٹے کو اپنے کلیجے کے آس پاس محسوس نہ کرتی۔ شاید اس لئے عبدالعزیز کی پیدائش کے بعد وقار حسین کو ایسا بھی لگتا تھا کہ اب مہرون کا لگاؤ ان سے کچھ کم ہو گیا ہے۔

عورت بیٹے میں شوہر کا عکس کیوں ڈھونڈتی ہے۔

چند مہینوں میں ہی وہ دن بھی آ گیا جب مہرون نے نیم گرم پانی بکٹ میں اتارا اور ناریل کا کاتالے کر آنگن میں آئی تو عبدالعزیز نے کہا میں خود ہی نہالوں گا۔ مہرون وہیں کھڑے رہ کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ ضد پر اتر آیا اور منگیلدار کے گڑ گے کو پھلانگ کر بھاگ گیا۔ وہ اس کے پیچھے دوڑی۔ دونوں کے درمیان پتھروں کی یہ موٹی دیوار حائل رہی۔

بالآخر مہرون نے ہتھیار ڈال دیے۔

عورت اپنے بچوں سے ہارنے میں کبھی ہتک محسوس کیوں نہیں کرتی؟

﴿۱۰﴾

ہوا میں منتشر سرخ مٹی کے ذرات کو آگے بڑھ کر درختوں کی شاخوں اور پتوں نے آسمان کی طرف جانے سے روک لیا۔ رکشا کا شور ہوا کے دوش پر دور چلا گیا۔ عبدالعزیز کے ساتھی گلی کا موڑ کاٹ کر سڑک پر پہنچ گئے۔

اس نے دروازے کے پٹ آگے کئے اور مڑ گیا۔

مرغے کے مسالے دار سالن کو جوش آ رہا تھا۔ مہک پڑی سے نکل کر منچا انگنیدار اور پھروٹے دار میں پہنچ گئی۔ شمیم منگیلدار میں شیشے کے برتن صاف کر رہی تھی جنھیں صرف مہمانوں کے آنے پر ہی استعمال کیا جاتا تھا۔

مہرون نے چولہے سے جلتی ہوئی لکڑیاں نکالیں۔ آگ بجھائی۔ سرخ انگاروں کو چولہے کے کنارے پھیلایا۔ ان پر مرغے کے سالن کا ٹوپ اتار کر رکھ دیا۔ پھر ایک ڈبے سے گھر میں بنائے دس بارہ پاپڑ نکالے۔ چولہے کے پیچھے برتنوں کی ٹوپلی میں سے پاپڑ اور بومبل تلنے کی پتیلی نکالی۔ اس میں مونگ پھلی کا تیل ڈال کر چولہے پر رکھا اور چمٹا ہاتھ میں لئے تیل کے گرم ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

اسی وقت عبدالعزیز پڑی میں داخل ہوا۔ مہرون نے اسے دیکھتے ہی کہا ''ہوگئی دوستوں سے ملاقات۔''

''ہوگئی۔۔ مگر ادھوری،۔۔ شام کو ہم لوگ باہر گھومنے جانے والے ہیں۔''

شمیم نے اس کی بات سنی۔ اس نے منگیلدار سے ہی اونچی آواز میں کہا۔

''تین سال بعد آئے ہو، پہلے کچھ دن گھر میں گزارنا۔۔۔ پھر بھٹکنے جانا۔''

''ارے چاچی ...... بھٹکنے وٹکنے نہیں جا رہا ہوں بس گانو کے آس پاس کسی کھیت میں بیٹھیں گے اور کیا!''

''کہیں بھی جانا مگر مغرب تک گھر آ جانا۔ آج تیرے ابا اور چاچا عصر بعد ہی دکان بند کر کے آنے والے ہیں۔ پرسوں اگر عروس نہ ہوتا تو آج دُکان کھولتے بھی نہیں۔ ''مہرون نے تیل میں پاپڑ ڈالتے ہوئے کہا۔

''مغرب تک تو آ ہی جاؤں گا......'' عبدالعزیز نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

شمیم پڑی میں داخل ہوئی۔ اس کی کمر پر دھوے ہوئے برتنوں کی ٹوکری تھی۔

مہرون نے تلا ہوا پپڑ نکال کر ایک ساسر میں رکھا۔ گھر میں بنائے ہوئے پاپڑوں کی مہک سے عبدالعزیز کی بھوک جاگ گئی۔ وہ مہرون کے قریب بسنے پر بیٹھ گیا۔ مہرون نے کہا۔ ''سوچتا کیا ہے؟ اٹھالے۔ تیرے لئے ہی تو بنا رکھے ہیں۔''

عبدالعزیز نے پپڑ اٹھایا۔ مہرون اسے ممتا بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔ عبدالعزیز نے اس کی گردن پر اپنی بانہیں ڈال دیں اور پیار سے اسے اپنی طرف کھنچا۔ اس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ مہرون اپنے بیٹے کی ان شرارتوں کی عادی تھی۔ یہاں اسے یوں لگا تھا کہ اتنے برس باہر رہ کر آیا ہے، سب شرارتیں بھول گیا ہوگا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح گرم چمٹا اس کے پیروں کے قریب لا کر کہا۔ ''چھوڑ شیطان ورنہ چٹکا دوں گی۔''

''دو...... میں نہیں ڈرتا۔''

مہرون نے چمٹا زمین پر رکھا اور پتیلی کے نیچے سے جلتی ہوئی لکڑی کو پیچھے کھینچا۔ پاس رکھے ہوئے گلاس میں انگلیاں ڈبائیں اور لکڑی پر پانی کے چھنٹے مارے۔ آگ بڑی حد تک بجھ گئی۔ پھر کہا۔ ''اچھا بابا۔ تو جیتا میں ہاری۔''

''یہ ہوئی نہ کوئی بات'' یہ کہہ کر عبدالعزیز نے اسے اپنی گرفت سے آزاد کیا اور سا سر میں سے دوسرا پپڑ اٹھالیا۔

❦

باہر سے آنے والی آواز اس کے کانوں پر پڑی وہ چولہے کے پاس سے اٹھا اور پائٹن کی اور مڑا ہی تھا کہ سلیم نے اس پر چھلانگ لگائی۔ عبدالعزیز نے اسے دونوں ہاتھوں میں کس کر دبوچ لیا۔ پھر اسے گدگدی کرنے لگا۔ وہ قہقہے لگا تا رہا۔ بچاؤ بچاؤ۔ گدگدی ہوتے گدگد ہوتے، میلوں میلوں میلوں گو، بووا۔ مایو۔ میلوں گو۔

مہرون اور شمیم کی نظریں ملیں۔ وہ زیرِ لب مسکرائیں۔ عارفہ جو کھڑے ہو کر تالیاں بجا رہی تھی اس نے کہا۔ ''بھائی چھوڑو مت، اس کو اور گدگدی کرو...... بہت کرو بہت کرو۔ اس نے کل میرے کو بہت ستایا تھا۔''

''چپ یہ بھوتنی'' سلیم نے عبدالعزیز کی گود سے ہی عارفہ کو ڈانٹا۔

''دیکھو...... یہ میرے کو بھوتنی بولتا ہے۔ اسکول میں بھی سب کے سامنے بولتا

ہے۔اس کو اب مت چھوڑو۔'' عبدالعزیز سے مخاطب ہو کر عارفہ نے کہا اور سلیم کو منہ بنا کر چڑانے لگی۔

''چپ بھوتنی نہیں تو بھائی کو بتا دوں گا۔تو بستر میں......'' اتنا کہہ کر سلیم زور زور سے ہنسنے لگا۔

''ماں دیکھو......سلیم کو......'' عارفہ نے زمین پر پیر پٹک کر رونے کا ڈرامہ کرتے ہوئے اپنی ماں سے کہا۔

''میں اسے گرم چمٹے کا چٹکا دوں گی اگر وہ بتائے گا۔'' عارفہ کو شمیم کے جملے سے تھوڑی تسکین ملی۔اس نے مڑ کر دوبارہ سلیم سے نظریں ملائیں۔اور ہاتھ کے اشارے سے چمٹا بتایا۔

''عزیز بھائی۔میں ہے نہ آپ کو بعد میں اکیلے میں بتاؤں گا۔'' زمین پر پیر رکھتے ہوئے سلیم نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے......'' اتنا کہہ کر وہ عارفہ کی طرف بڑھ گیا۔عارفہ کے سامنے بیٹھ گیا۔عارفہ کی آنکھوں میں ایک طرح کی ہچکچاہٹ صاف دکھائی دے رہی تھی۔وہ مڑ مڑ کر سلیم کو بھی دیکھے جا رہی تھی۔پھر اس نے عبدالعزیز کے کان میں کہا۔''اس کی باتوں کو سچ مت سمجھنا ہاں۔۔۔وہ بہت جھوٹا ہے۔''

''ارے بالکل نہیں ......'' اتنا کہہ کر عبدالعزیز نے عارفہ کو اٹھا کر اپنے کندھوں پر بیٹھا لیا۔عارفہ نے اس کے کان زور سے پکڑے۔وہ اسے گھمانے لگا۔عارفہ نے شور مچانا شروع کیا۔ان کے گرد سلیم بھی ناچنے لگا۔

مہرون اور شمیم اپنے کام بٹاتے ہوئے ان کی شرارتوں کو بھی دیکھے جا رہی تھیں۔شمیم کا دل اس منظر کو دیکھ کر بھر سا گیا تھا۔اگر وہ اسی طرح کچھ دیر اور قہقہے لگاتے رہتے تو شاید جذبات کی طغیانی اس کی پلکوں پر نمایاں ہو جاتی۔

﴿۱۱﴾

شمیم کھاتے پیتے گھر کی لڑکی تھی۔اس کا بڑا بھائی چھ سات برس سے کویت میں ملازم تھا۔چھوٹا بھائی بمبئی کے چند گجراتی تاجروں کو ہاپوس سپلائی کرتا تھا۔اس کے والد امتیاز پانڈے مہرون کے والد جعفر قاضی کے خاص دوست تھے۔جعفر قاضی کسان تھے کھیتی باڑی کے علاوہ امتیاز پانڈے کے ساتھ شادیوں اور محفلوں میں تاشا بجایا کرتے تھے۔شدت پسند مذہبی لہر سے پہلے اہل کوکن کی شادیوں میں کھالو باجا، شہنائی اور تاشے کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔یہ موسیقی مقامی کلچر کا حصہ تھی۔اس کے بغیر شادیاں قبرستان کی خاموشی لگتی ہیں۔

ہر خاص و عام اپنے آنگن میں تاشے اور کھالو کا پروگرام رکھتا۔لوگوں کے کانوں میں ان آلات کی آوازوں کے شریں ٹکڑے محفوظ تھے۔ان کے ردھم کو وہ اپنے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ محسوس کرتے تھے۔

مقامی موسیقی کی اس روایت سے یہاں کے جانور، پرندے، کیڑے مکوڑے، پیڑ پودے خوب واقف تھے۔سب جانتے تھے اس کا عام طور پر مطلب ہے۔شادی، دو دلوں اور جسموں کا سنگم۔اس موسیقی کی دھن سے یہاں کے موذی کیڑے بھی واقف تھے۔شہنائی کی مٹھاس سے وہ مگدھ ہو جاتے اور اپنے بلوں سے باہر نہیں نکلتے۔ تاشے اور کھالو بجتے تو بچھو اور سانپ بھی اپنے کنبے کے ساتھ اپنے اپنے مسکن میں اپنے بچوں کو پیار کرتے رہتے۔

جگنوؤں کو اس ردھم سے بڑی محبت تھی۔رات میں اور خاص کر برسات کی راتوں میں اگر تاشا بجتا تو جہاں تک ڈھول شہنائی، اور طبلے کی آواز جاتی وہاں سے یہ کھنچے چلے آتے اور جس گھر کے آنگن میں محفل سجی ہوتی۔اس کے ارد گرد کے درختوں کی ٹہنیوں پر بیٹھ کر جگماتے رہتے۔لطف اندوز ہوتے رہتے۔گویا وہ موسیقی کے ساتھ نور

کی لہروں کے سنگم کو سب پر ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

جنگل میں مور بے قرار ہو اٹھتے۔ان کے پیر خود بہ خود تھر کنے اور پنکھ لہرانے لگتے۔
فطرت اور موسیقی کا رشتہ زمین پر انسان کی آمد سے پہلے سے ہے بلکہ فطرت کا ارتقاء موسیقی کا ایک اظہار رہے۔ فطرت کے مظاہر میں موسیقی پنہاں ہے۔ موسیقی میں ایکانت اور ایکا گرتا ہے۔ موسیقی کے بغیر فطرت بانجھ اور تہذیبیں کھردری نظر آئیں گی۔ جس کلچر میں موسیقی کے لئے جگہ نہ ہو وہ کلچر مرثیوں کے علاوہ اور کچھ نہ ہو گا۔
حساس لوگوں کا اس سنگلاخ زمین میں دم گھٹ جائے گا۔

موسیقی دل کو نرم کرتی ہے۔اور جذبات کو چہرہ عطا کرتی ہے۔

۱۲

تاشے بجانا شمیم کے والد کا خاندانی پیشہ تھا۔انھیں اس پر بہت فخر تھا۔ وہ روزانہ گھنٹوں ریاض کیا کرتے تھے۔ مہرون کے والد کے لئے یہ نہ صرف جزوقتی روزگار بلکہ ذوق کی تسکین کا سامان بھی تھا۔ ہر کلچر کے اپنے جداگانہ تخلیقی سرچشمے ہوتے ہیں۔ ہر کلچر اپنے لاشعور کے اظہار کے لئے علحدہ نشانات رکھتا ہے۔ ہر کلچر کی اپنی مخفی علامات ہوتی ہیں۔ صحت مند لوگوں کا کام ان کا تحفظ کرنا ہے۔ استبدادی ثقافتوں کی یلغار سے انھیں بچانا ہے۔ چند سال بعد عبدالعزیز نے اس موضوع پر ایک مفصل مضمون لکھا اور یہ بتانے کی کوشس کی ...... کہ جابر ثقافتیں علاقائی و مقامی کلچر کو مٹانے کے لئے مندرجہ ذیل جواز یا حربے استعمال کرتی ہیں۔

(۱) مقامی کلچر کو جاہلیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(۲) مقامی کلچر کو اپنے کلچر کے مقابلے ادنیٰ ثابت کر کے اس کا تمسخر اڑانا۔

(۳) جابر ثقافتیں افراد کو اپنا محکوم بنانے کے لئے مذہب کی بنیاد رکھتی ہیں ابتدائی

معاشروں نے دوسروں پر فوقیت حاصل کرنے کے لئے مذاہب کو ایجاد کیا تھا اور اسے قبول عام بخشنے کے لئے ان کا رشتہ مافوق الفطرت مظاہر سے جوڑ دیا۔ جو انسان کے مجموعی لاشعور کا حصہ تھا۔ تحت الشعور پر اس کا گہرا اثر ہوا۔ بعد میں ترقی کرنے والی جماعتوں نے اپنے عقاید و نظریات کے فروغ اور انسانوں کے دوسرے گروہوں کو اپنا مطیع بنانے کیلئے کلچر کو ایک نسخے کے طور پر استعمال کیا۔

(۴) مذہب کے نسخے کے سہارے نفع نقصان اور گناہ ثواب کے ترازو میں احساسات کا احتساب کرنے کی ہدایات جاری کی جاتی ہیں۔ کلچر پر یلغار کا یہ بھی بہت آسان اور کارآمد ہتھیار ہے۔

(۵) بعض درمیانی عہد کی ثقافتوں نے اپنے کلچر کی بالادستی کو برقرار رکھنے کے لئے جہاں نئے مذاہب (زندگی گزارنے کا نظام) لوگوں کے لئے بنائے وہیں اپنے دستور میں بھی شامل کر دیا کہ مذہب اختیار کرنے والے افراد کو اپنا سابقہ کلچر ترک کرنا ہوگا۔ نہ صرف ترک کرنا ہوگا بلکہ اس کے اسفل اور مکروہ ہونے کا اعلان بھی کرنا ہوگا۔ ورنہ نئے مذہب میں ان کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

بہت دن ہو گئے تھے شمیم نے والد کو تاشا بجاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا مگر آج جب اس کے بچوں نے عبدالعزیز کی بانہوں میں کہرام مچایا تو ماضی میں سُنی گئی موسیقی کے ٹکڑے اس کے کانوں میں جاگ گئے تھے۔ اسے وہ دن یاد آ رہے تھے جب اس کے والد اپنے دوستوں کے ساتھ گھر کے آنگن میں ریاض کرتے تھے۔ اور وہ بیٹھ کر دل کی گہرائی سے انھیں سنا کرتی تھی۔ اس کے دل میں خیالات ابھرے ہی تھے کہ مہرون نے آواز دی...... ''شمیم چٹائی بچھا......''

پھر عبدالعزیز کی طرف دیکھ کر اس سے کہا۔ ''بیٹا ہاتھ دھو لو...... کھانا لگ گیا ہے۔''

کھانا کھاتے وقت مہرون شمیم اور عبدالعزیز نے بہت سارے گھریلو موضوعات پر گفتگو کی۔ عبدالعزیز نے آج اپنے کوٹے سے کچھ زیادہ ہی کھانا کھایا تھا۔ ہاتھ دھونے کے بعد اس نے ماں سے کہا کہ اب وہ تھوڑی دیر آرام کرے گا۔

سلیم چاہتا تھا وہ اس کے ساتھ کرکٹ کھیلے۔ عارفہ چاہتی تھی وہ اس کی گڑیا دیکھے اور اسے کہانی سنائے۔ عبدالعزیز نے دونوں کو سمجھایا وہ بعد میں ان کے احکامات پر عمل کرے گا۔ اس دوران شمیم نے سلیم کی آنکھوں میں دیکھا جس کا مطلب تھا ''ضد کرو گے تو بہت پٹائی ہوگی۔'' وہ ماں کے اشارے کو سمجھ گیا۔

عبدالعزیز درمیانی کمرے میں گیا۔ باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی بند کر دی۔ ٹی شرٹ اتار کر کھونٹی سے لگایا۔ چارپائی پر ایک نظر ڈالی اور دراز ہوگیا۔ اپنے دونوں ہاتھ سینے کے گرد لپیٹ لئے۔ آنکھیں موند لیں۔ اسے نیند سے زیادہ ایکانت کی ضرورت تھی۔ وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے کے لئے یکسوئی چاہتا تھا۔ صبح سے اسے وہ لمحے میسر نہ تھے جن میں اس کا دل سکینہ کی یادوں کو تازہ کر کے اس سے بات کرتا۔

اس نے آنکھیں بند کر کے یادداشت کی بھول بھلیوں میں جھانکنا شروع کیا۔ چہرے بلیک اینڈ وائٹ اور نگیٹیو فریموں میں اجاگر ہونے لگے۔ سکینہ کے چہرے کا کوئی حصّہ ابھرتا اور جھٹ سے کسی دوسرے رشتے دار، دوست یا شناسا چہرے کا کوئی حصّہ اس پر سایہ کر دیتا۔ اس نے کروٹ بدلی اور دیوار کی طرف کی منہ کیا۔ سکینہ کا چہرہ پل بھر کو مسکراتے ہوئے اسے دکھائی دیا۔ پھر اس نے دیکھا: سکینہ اسے گھر کی کھڑکی سے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھ رہی ہے۔ یہ منظر جھٹ سے اوجھل ہوگیا۔ پھر اس نے دیکھا: موسلا دھار برسات میں تکونی پتھر سے جامن کے تنے پر اس کے نام کے حروف لکھ رہا ہے۔ یاد کے اس ٹکڑے کے ساتھ ہی غیر شعوری طور پر اس کی پلکیں

کھلیں۔ وہ اپنی ہتھیلی کو نیم اجالے میں دیکھنے لگا۔

جس روز اس نے تکونی پتھر سے جامن کے تنے پر سکینہ کے نام کے حروف بنائے تھے اس شام جب وہ نہانے بیٹھا اور اس نے صابن کی ٹکیہ اپنی ہتھیلی پر ملی تھی، جلن کا بہت شدید احساس ہوا تھا۔ اس نے فوراً ٹھنڈے پانی کی بکٹ میں ہاتھ ڈال دیے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ حیران تھا کہ انگلیوں کے نیچے اور انگوٹھے کے سرے پر پھوڑ آ گے تھے۔ پھر جو دشا اس کی ہونی تھی ہوئی۔

بالآخر جب چھالے سوکھ گئے اور دوبارہ اس کی ہتھیلی پہلے جیسی ہوگئی تو اس نے ایک صبح جامن کے نیچے سے گزرتے ہوئے ٹھہر کر اس مقام کو دیکھا جہاں دل کا نشان بنا ہوا تھا اور اس میں سکینہ کے نام کے حروف لکھے گئے تھے۔ دو دن اچھی دھوپ نکلی تھی جس سے پیڑ کا تنا بھی سوکھ گیا تھا۔ اب حروف نمایاں نظر آرہے تھے۔ انھیں دیکھ کر اسے مسرت ہوئی۔ مسرور ہو کر اس نے اپنی ہتھیلی کو چوما اور جامن کے پیڑ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''محبت میں درد تو سہنا ہی پڑتا ہے۔''

۱۳
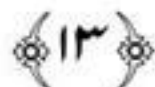
اس بار ہتھیلی دیکھنے پر اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں بلکہ صرف آنکھوں میں ایک چمک پھیلی۔ وہ چمک جس میں محبت کے راز پنہاں ہوتے ہیں۔ وہ محبت جو کسی پر عیاں نہ ہو۔ جب دل محبت کی رنگارنگی سے یادستاں میں بدل جاتا ہے تو روح کی کرنوں میں اضافی تاب پیدا ہوتی ہے۔ جس سے آنکھوں میں یہ چمک در آتی ہے۔ جسے دن کی روشنی میں واضح طور پر دیکھا یا محسوس نہیں کیا جا سکتا مگر تاریکی میں یہ چمک صاف نظر آتی ہے۔ اس چمک میں ایک ٹھنڈک ہوتی ہے۔ جو محبت سے محروم رہتے ہیں ان کی آنکھوں میں یہ چمک پیدا نہیں ہوتی اور اسی وجہ سے ان کی آنکھوں میں ایک طرح کی خشکی در آتی ہے۔ خشکی جس میں روح کے مرثیے مدفون ہوتے ہیں۔

سنگ دل، جابر اور انسانیت کے دشمن افراد کی آنکھیں اسی خشکی کے سبب قابل نفرت ہوتی ہیں۔ جو کلچر محبت کو مجموعی یادداشت میں کالعدم قرار دیتا ہے۔ وہ دراصل اپنی موت کا اعلان کرتا ہے۔ ''جو دستور محبت کو تسلیم نہیں کرتا وہ افراد کی ایسی جماعت کا بنایا ہوا ہوتا ہے جن کے دل شیطان کے قبضے میں ہوتے ہیں۔ کیوں کہ انسان سے پہلے محبت کی صفت اسی میں تھی۔ لیکن اسکی نرگسیت نے اسے اس وصف سے محروم کر دیا۔ اس لئے شیطان نے محبت کے جذبے کو فنا کرنے کی قسم کھائی ہے۔'' جامن کے پیڑ پر بیٹھی شگفتہ کی روح نے گلہری کو بتایا۔

اس نے عبدالعزیز کا جملہ...... ''محبت میں درد سہنا ہی پڑتا ہے۔'' سننے کے بعد شگفتہ سے پوچھا تھا۔ ''کیوں لوگ محبت کے دشمن ہوتے ہیں؟''

تب اسے اپنی محبت یاد آئی تھی جسے سماج کے دستور نے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اسی سبب وہ یہ سزا کاٹ رہی تھی۔ عبدالعزیز کے جملے کا سیاق وسباق اسے معلوم نہ تھا۔ اس لئے جو تعبیر اس نے بیان کی وہ جداگانہ تھی۔ یہ باتیں اس نے اشعر ابن نجومی اشعر ابن نجومی کی زبان سے سنی تھیں۔ یک رات ایک محروم عاشق نے اسے چالیس روپئے دئے تھے اور کہا تھا میری بے وفا محبوبہ پر کچھ ایسا سحر کرو کے وہ اولاد سے ہمیشہ محروم رہے، کام ہونے پر مزید چالیس روپئے دئے جائیں گے۔ شراب کے نشے میں عملیات کی کتاب کے اوراق پلٹتے ہوئے اس نے نوجوان کو وہ باتیں بتائی تھیں۔

۱۴
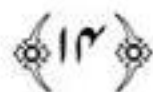
اپنی ہتھیلی بغل میں دبا کر عبدالعزیز دوبارہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ یادستان کی تاریک جھیل سے یوسف کا چہرہ ابھر آیا۔ اسپتال سے جب سکینہ گھر آئی تھی تب وہ اس کے لئے گوجڑ لے اور میتھی کے لڈو لے گیا تھا۔ اس وقت پہلی بار اسے ایسا لگا تھا کہ اس بار وہ سکینہ سے ملنے نہیں بلکہ اس کے بطن سے جو نیا چاند طلوع ہوا ہے، اس کا دیدار

کرنے جارہا ہے۔ اس روز سکینہ کے گھر میں مجاور حسین کے علاوہ اڑوس پڑوس کی عورتیں، بوڑھے اور بچّے بھی تھے۔ سکینہ کی ساس بھی اسی کمرے میں موجود تھی۔

جوان لڑکیاں یوسف کو گود میں لیے اس سے باتیں کررہی تھیں جسے وہ سن رہا تھا۔ اور شاید سمجھ بھی رہا تھا مگر ان باتوں کے جواب میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں ناکامیاب تھا۔

عبدالعزیز لکڑی کی ایک میز پر بیٹھ کر سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سکینہ نے ایک بار اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ دونوں مسکرائے تھے۔ دونوں جانتے تھے کہ وہ ایک دوسرے کی خوشی کا سبب ہیں ان کی محبت نے سارے ماحول کو شادماں بنادیا تھا۔ اس کی ساس جو اس سے ہمیشہ شاکی رہا کرتی تھی آج وہ خادمہ کی طرح اس کی دیکھ ریکھ کررہی تھی۔ پہلے وہ گھر پر شاذ ہی نظر آتی تھی پر یوسف کی ولادت نے اس کی سونی دنیا کو بھی ایک ساز دے دیا تھا۔ بعد میں اسی سبب عبدالعزیز کا سکینہ سے ملنا دشوار ہونے والا تھا۔ آج انھیں اس بات کا احساس نہ تھا اور نہ فکر......آج وہ خوش تھے۔ یوسف ان کی ممنوع محبت کا ثمر تھا۔ محبت کا یہ رنگ دنیا اور اس کے اصولوں کی کتاب میں ہمیشہ سے ممنوع رہا ہے۔ مگر عبدالعزیز اور سکینہ کو اس کتاب کے احکامات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ اس رشتے کے بغیر وہ خود کو ادھورا محسوس کرتے ہیں۔ اس محبت سے پہلے وہ زندہ......مگر زندگی سے محروم تھے۔ ان کے دل تھے مگر لذّتِ عشق سے بے نور۔ آج ان کے دلوں کے اس نور نے پگھل کر یوسف کی صورت اختیار کی تھی۔ وہ بے حد خوش تھے۔

سکینہ چارپائی پر لیٹی تھی۔ چارپائی کے نیچے ایک سیگڑی میں گرم کوئلے تھے جس سے ہلکا ہلکا دھواں بھی نکل رہا تھا۔ سردیاں شروع ہوگی تھیں۔ مجاور حسین کا مفلر اس نے کانوں کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ پاس ہی لکڑی کی ایک میز پر لوبان دان رکھا ہوا تھا۔ عبدالعزیز نے

میتھی کے لڈوں کا ڈبہ اور گوجڑلے سکینہ کی طرف بڑھائے۔ سکینہ نے ساس کو آواز دی۔
وہ فوراً آئی اور اس نے عبدالعزیز کے ہاتھوں سے وہ تحفے لے لئے۔

اس وقت عبدالعزیز کو معلوم نہیں تھا کہ سکینہ اس حالت میں نہیں ہے کہ وہ اٹھ کر بیٹھے اور اس کے تحفوں کو کھول کر دیکھے۔ جب وہ گھر سے نکلا تھا تب اس نے سوچا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے سکینہ کو دو تین لڈو کھلائے گا۔ پھر یوسف کو ماں کے بنائے ہوئے گوجڑلے میں لپیٹ کر اسے اپنے کندھے پر لے کر کھڑکی کے پاس کھڑا ہو جائے گا۔ اسے باہر کے درختوں کے نام بتائے گا۔

بعد میں جب بھی اس نے یہ بات یاد کی اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔

سکینہ کی ساس سے اس نے کہا کہ سامان ماں نے بھیجا ہے۔ بوڑھی کا چہرہ کھل گیا۔ اس نے وہاں بیٹھی ہوئی عورتوں کو مخاطب کر کے مہرون کی تعریف کی، یہ بات ظاہر تھی کہ پڑوس کی تین عورتیں جو عجلت میں خالی ہاتھ آئی تھیں، ان کو شرمندہ کرنا مقصود تھا۔ انھیں فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔

برسوں سے رواج تھا کے دیدار کے لئے آنے والے اپنے ساتھ گوجڑے، ٹوپلے، لڈو وغیرہ لاتے تھے۔ خالی ہاتھ آنے والے پر لازم تھا کہ وہ بچے کے سرہانے کچھ نقد ہی رکھ دے۔

تینوں عورتوں نے نکلنے سے پہلے اپنی پان کی تھیلی ڈھیلی کی۔ ایک نے دو روپئے دوسری نے پانچ اور تیسری (جسے اس صورت حال کے پیدا ہونے کا کسی طرح کوئی گمان نہ تھا۔) نے بارہ آنے یوسف کی ہتھیلی پر رکھے۔

سکینہ کو خراب لگ رہا تھا اس نے کہا۔ ''ارے کیا ضرورت ہے۔ آپ لوگوں کی دعا ہی بہت ہے۔''

''میں جلدی جلدی میں آ گئی تھی، میں نے ایک کلی والا ٹوپراں بنایا ہے۔ بہت اچھا

لگے گا۔کل آؤں گی۔‘‘جس عورت نے بارہ آنے یوسف کی مٹھی میں ٹھونسنے کی کوشش کی تھی اس نے یوسف کے گالوں کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

سکینہ کی ساس نے اڑکیتے میں سپاری دباتے ہوئے کہا۔’’بدام کھایا کر، پھر سب برابر یاد رہے گا۔‘‘ سب ہنس پڑے۔

’’اور تیرے آدمی کو بھی کھلا......‘‘ سپاری کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے اس نے دوسرا جملہ ادا کیا۔اس پر ساری عورتیں ہنس پڑیں۔وہ بھی جس پر یہ جملے داغے گئے تھے۔ باہر کے کمرے میں جہاں مرد بیٹھے تھے، وہاں یہ جملہ ایک بوڑھے کے کانوں پر پڑا۔ جس کا پورا دھیان عورتوں کی بات چیت پر لگا ہوا تھا۔اسے زور سے ہنسی آئی اور ٹھسکا لگا۔جس سے اس کے منہ میں پان کی جو پیک جمع تھی وہ اس کے کرتے پر گرگئی۔ پیک کا باقی حصّہ اس کی حلق میں اتر گیا جس کے سبب اس کی آنکھوں میں پانی بھر گیا۔

وٹے دار سے باہر جا کر اس نے پان تھوکا۔کرتا جھٹکا۔ایک لڑکے نے گھر میں سے ایک لوٹے میں پانی لایا۔بوڑھے نے منہ دھویا، کلی کی، اور دوبارہ آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی ضعیف بینائی میں اس کی مرحوم بیوی کی تصویر ابھر آئی تھی جس نے شادی کی پہلی رات کو اسے دس بادام کھلائے تھے اور کہا تھا۔’’ہر دن میں آپ کو بادام کھلاؤں گی۔۔۔تاکہ جو آج شروع ہو وہ ہمیشہ جاری رہے۔‘‘

دراصل اس کی بیوی کے والد کی گرم مسالوں کی دکان تھی اور وہ خود بچپن سے بادام کھانے کی شوقین تھی۔اس کی والدہ نے اسے رازدارانہ انداز میں بتایا تھا کہ جو مرد بادام کھاتے ہیں ان کی بیویاں ہمیشہ خوش رہتی ہیں۔۔۔‘‘یہ جملہ ادا کرنے کے بعد ماں نے بیٹی کو کہنی ماری تھی۔جس میں اس جملے میں نہ کہی گئی بات کا مفہوم بھی پوشیدہ تھا۔

☆

یوسف رونے لگا۔کم عمر لڑکی کی گود سے ایک عورت نے اسے لیا۔جھنجھنا بجا کر اس

کو بہلانے کی کوشش کی۔ جھن جھنے کی آواز سن کر وہ اور بلک بلک کر رونے لگا۔ سکینہ کی ساس نے پان کی پیک تھوکدان میں انڈیلی۔ نچلے ہونٹوں کی لالی کو ساڑی کے پلّو سے صاف کیا اور یوسف کو پڑوسن کے ہاتھوں سے لیا۔ یوسف کو دونوں ہاتھوں میں لے کر اس نے گایا۔

باواماڑانھان

سونیچاں پان

مامولاسانگ

مالاجھنجھونوھان

جب وہ اس گیت کی آخری لائن پر پہنچی تو اس لڑکی نے دوبارہ جھنجھونا بجایا۔ یوسف آنکھیں کھول کر گانا سن رہا تھا۔ اس کی نظریں دادی کے ہونٹوں کی حرکت پر تھی۔ جیسے ہی جھنجھنے کا شور اس کے کانوں پر پڑا۔ اس نے منہ بنایا اور ہچکی مار کر رونے لگا۔ اس بار رونے کی آواز پہلے سے بلند تھی۔ سکینہ کی ساس نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”مجھے لگتا ہے اسے بھوک لگی ہے۔“

سکینہ کے سرہانے اس کی سہیلی رضیہ پٹیل بیٹھی تھی۔ اس نے سکینہ کی ساس کے ہاتھوں سے یوسف کو لیا اور سکینہ کے پاس رکھتے ہوئے کہا۔ ”پہلے اسے دودھ پلا، کب سے بھوکا ہے۔“

سکینہ نے اسے قریب لیا تو اس کی سسکیاں بند ہوگیں۔ عبدالعزیز اٹھ کر باہر جانے لگا۔ سکینہ نے اسے اٹھتے ہوئے دیکھا۔ ان کی نظریں ملیں۔

عبدالعزیز نے یوسف کو سکینہ سے چمٹتے ہوئے دیکھا۔ سکینہ کے چہرے پر اس لمحے وہی روحانی مسرت تھی جو موسلا دھار بارش میں ندی کنارے شرابور ہونے کے بعد تھی۔ اس روز خوشی کی ترنگ میں وہ زمین پر لیٹ گئی تھی۔ اسے یہ بات بھی یاد نہ رہی

تھی کہ بھیگے سڑے گلے پتوں کے انبار کے نیچے کیچڑ ہے۔اوراس طرح کے کیچڑ میں بچھو رہتے ہیں۔عبدالعزیز نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھنچتے ہوئے کہا تھا۔"پاگل بچھو وچو کاٹ لے گا۔"

"تو کیا کسی بچّھو سے کم زہریلا ہے۔" فوراً سکینہ نے کہا تھا۔

"یہ مت بھولو پہلے تم نے مجھے کاٹا تھا۔" عبدالعزیز نے اس کے بلاؤز پر لگی مٹی کو صاف کرتے ہوئے کہا۔سکینہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔اس کی آنکھوں میں شرارت آمیز انداز میں دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔"میں تو بس پتوں پر لیٹ گئی تھی۔مجھے کیا پتہ وہاں بچھو ہوگا۔"

عبدالعزیز اس کے اشارے کو سمجھ گیا تھا۔اس رات کا خمار اس کے پورے بدن میں دوبارہ پھیل گیا تھا۔اس کی آنکھوں میں سکینہ نے اس گرم دھوئیں کو محسوس کیا۔جو اس رات گرم مرطوب ہوا کے یکا یک ٹھنڈ ہونے سے گاؤں کے اوپر فضا میں محلول تھا۔

یوسف کے ہونٹ ممتا کی مٹھاس سے لگے۔عبدالعزیز آنگن میں آکر رفیق ونو کے ساتھ بیٹھ گیا۔رفیق اس کے ساتھ بہت ساری باتیں کرتا رہا مگر اس کے دل میں ندی کا پانی بہت تیزی سے رواں تھا۔جس کے شور میں وہ کچھ اور سن نہیں پا رہا تھا۔

﴿۱۵﴾

یادستان کی تارایک جھیل سے یوسف کا دمکتا ہوا چہرہ اس کی بند آنکھوں میں سمایا۔کچھ دیر مسکراتا لہراتا رہا۔یہ کوئی طلسم نہ تھا۔اس کے باوجود نیند کے بادل بنے اور اسے وادی خواب میں بہا لے گئے۔

☆ وہ ہر دوسرے تیسرے روز یوسف کو دیکھنے چلا جاتا۔اس کے ساتھ مختلف آوازوں میں باتیں کرتا رہتا۔جانوروں کی نقل کرتا۔پیڑوں پر پرندے آبیٹھتے تو کھڑکی سے اسے بتاتا۔یوسف ہر چیز کو دیدے مرکوز کر کے دیکھنے کا عادی

سا ہو گیا تھا۔ جب وہ کوئی نئی آواز سنتا تھا اس کی پیشانی پر ایک شکن نظر آتی اور آنکھوں میں تجسس۔ اب سکینہ چلنے پھرنے لگ گئی تھی۔ اس کی ساس اس پر مہربان ہو گئی تھی۔ سارے کام کاج خود کرتی اور اسے آرام کرنے کی ہدایت دیتی۔ یوسف کو نہلا کر اس کے پورے جسم پر پاؤڈر لگاتی۔ سر کی ٹالو پر ناریل کا تیل لگاتی۔ صاف ستھرے کپڑے پہناتی۔ پھر گود میں لیٹا کر پانی کے قطرے اس کے منہ میں ایک چھوٹے چمچے سے اتارتی۔ کبھی جو جی چاہتا کوئی گیت گنگناتی۔

اب یہ واضح ہو گیا تھا کہ اسے جھنجھونے کی آواز پسند نہیں ہے۔ اس لئے ایسے سارے کھلونے پہلے ہی سے ایک طرف کر دیئے گئے جو جھنجھونے کی طرح بجتے تھے۔

مجاور حسین یوسف کی ولادت کے بعد پہلے سے زیادہ خدا پرست اور عبادت گزار ہو گئے تھے۔ جب بھی وہ گھر پر ہوتے یوسف کے ساتھ کھیلتے رہتے۔ سکینہ کیلئے انہوں نے کچھ زیورات بنوائے اور یوسف کے لیے چاندی کا کرگٹا بنایا۔ یوسف کو جب پہنایا گیا تو وہ بہت حیران ہوا۔ بار بار دیکھتا رہا کہ یہ کیا بلا ہے۔ اسے کرگٹا مصیبت لگنے لگا۔ وہ اسے کھینچنے لگا۔ جب اس کی نازک انگلیوں سے نہیں نکلا تو اس نے اپنا ہتھیار استعمال کیا۔ وہ زار و قطار رونے لگا۔ اس کی دادی سمجھ گئی کہ نئی چیز سے اسے الجھن محسوس ہو رہی ہے۔ اس نے فوراً کرگٹے کو نکال دیا۔ وہ مسکرایا۔ پھر کلکاریاں مارنے لگا۔

سکینہ کی ساس زیادہ تر اس کے کمرے میں بیٹھی یوسف کے ساتھ کھیلتی رہتی۔ عبدالعزیز چاہ کر بھی سکینہ سے اپنے دل کی کوئی بات نہ کر پاتا وہ جتنی دیر وہاں بیٹھا رہتا ادھر اُدھر کی باتیں کرنے پر مجبور رہتا۔ کبھی کبھار مہرون بھی آ جاتی۔ اور وہ سب مل کر گاؤں کی زندگی یا عورتوں کے نجی مسائل پر باتیں کرتے رہتے۔ جن سے عبدالعزیز اکتا جاتا۔

وہ وٹے دار میں چلا جاتا اور اکیلے بیٹھ کر ان دنوں کو یاد کرتا جب سکینہ کا قرب اسے

حاصل تھا۔

رفتہ رفتہ تصور میں محو رہنے کی اسے عادت لگ گئی۔ ماضی کی یادیں بامعنی اور لطف پرور بن گئیں۔ کبھی کبھار وہ ماضی کی ملاقاتوں اور محبت کے لمحوں کو اپنے تخیل سے مستقبل میں لے جاتا اور زیادہ خوب صورت بنانے کی کوشش کرتا۔ یہاں اسے آئینے کے سامنے کھڑے رہ کر اپنے چہرے کو متواتر دیکھتے رہنے کی بھی لت لگ گئی تھی، اپنے عکس سے وہ باتیں کیا کرتا۔ اس کے ہونٹوں پر مونچھوں کے نشان نظر آنے لگے تھے۔ وہ خود کو مونچھو میں کبھی داڑھی میں تصور کرتا۔ کبھی وہ صرف اپنی کلیاں بڑھی ہوئی تصور کرتا۔ ہو بہو ویسی ہی، جیسی ایک انگریز سائنس داں کی اس نے طبیعات کی کتاب میں دیکھی تھیں۔ وہ خود کو مختلف زاویوں سے دیکھتا اور مسکراتا۔ خود اپنی تعریف کرتا۔ ایک بار اس نے اپنے گالوں پر تھوڑا سا پاؤڈر لگایا یہ دیکھنے کے لئے کہ اگر وہ گورا ہوتا تو کیسا لگتا...... اسے بہت بھدا لگا۔ اسے پاؤڈر لگا اپنا چہرہ سرکس کے جوکر کی طرح نظر آیا۔ فوراً اس نے منہ دھویا۔ دوبارہ آئینے کے سامنے آیا۔ اپنے عکس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ۔ ۔ ”زیادہ چکنا بننے کی کوشش مت کر، ورنہ لوگ بولیں گے دوسرا محبوب علی آ گیا۔“

محبوب علی پڑوس کے گانو کا ایک شخص تھا جس کے لب ولہجے اور چال ڈھال میں نسائیت نمایاں تھی۔

۱۶

سکینہ اس بات کو محسوس کرنے لگی تھی کہ عبدالعزیز کے دل میں ایک خلاء سا پیدا ہونے لگا ہے۔ اس کی آنکھوں میں انتظار، ہجر کا نوحہ تھا۔ یوسف سے دونوں کو یکساں محبت تھی اس کے باوجود ایک بار عبدالعزیز نے اسے رقیبانہ نگاہ سے دیکھا تھا۔ لیکن فوراً اسے اپنی اس حرکت پر ندامت ہوئی تھی۔

اس احساس کو زائل کرنے کے لئے اس نے یوسف کو اٹھایا۔ وٹے دار کے آنگن میں لے گیا۔ جہاں امرود کے پیڑ کی چھاؤں میں اس نے اسے ایک فلمی نغمہ سنایا جوان دنوں ریڈیو پر بار بار بجتا تھا۔

ہمیں تم سے پیار کتنا یہ ہم نہیں جانتے
مگر جی نہیں سکتے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ے۔

اس کی آواز تو یوں ہی سی تھی مگر جذبات کی شدت سے گداز اور درد انگیزی پیدا ہوگئی تھی۔ یوسف اسے حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ عبدالعزیز کو پتہ نہ تھا کہ دروازے کے اس طرف کھڑے ہوکر سکینہ بھی سن رہی تھی۔

اس کی آنکھیں ڈبڈائیں۔ وہ جانتی تھی یہ نغمہ کسی طرح یوسف کے لیے گایا نہیں جا رہا ہے۔ اس کے جی میں آیا عبدالعزیز کو اپنی بانہوں میں بھرے، اسے پیار کرے ،اس کے ہونٹوں، گالوں اور پیشانی پر اپنی محبت کی رال پھیلا دے۔ اس کے بدن اور روح کے ہیجان کو اپنی طغیانی میں ڈبو لے۔ اس کی ناآسودگی اور تنہائی کو اپنے قہقہوں سے گلزار بنا دے۔

ایسے قہقہے جن میں تصنع کو راہ نہ ہو بلکہ جسم اور دل کے ارتباط کا اظہار جن کا محرک ہو۔ آدھورے اور محبت سے محروم رشتوں میں یہ فطری سرشاری نہیں ہوتی۔ جہاں جسم اور دل مغروق نہ ہوں وہاں محبت نہیں ہوتی ...... چاہے وہ ازدواجی، غیر ازدواجی۔۔ فطری، غیر فطری رشتہ کیوں نہ ہو۔ محبت کے بغیر یہ سب تماشا اور شطرنج کا کھیل بن جاتا ہے۔ دھوکا کھانے اور دھوکے میں رہنے والے، دونوں کو احساس ہوتا ہے کہ اس رشتے میں کمی ہے۔ مگر اس کمی کا اظہار کرنے سے ان کی زبان کانپتی رہتی ہے۔ ڈر رہتا ہے کہ اس اظہار سے تعلق کی عمارت منہدم ہو جائے گی۔ لوگ: سماجی، معاشی اور مذہبی سلاخوں میں مقید رہتے ہیں اس لیے اس عمارت کے ملبے سے زندہ نکلنے کی جسارت

نہیں کرتے۔ شاید اسی لئے تعلق کی عمارت کو، باہر سے رنگ وروغن لگا کر دیکھنے والوں کو مطمئن کیا جاتا ہے۔ اور اندر ہی اندر سرنگیں بنا کر دل کی نئی بستیاں تلاش کی جاتی ہیں۔ محبت کے بغیر ذات کی تکمیل ادھوری ہے۔ ہر انسان زندگی میں ایک نہ ایک بار اپنے سینے میں محبت کے لیے طغیانی محسوس کرتا ہے۔

سکینہ نے بھی ذات کی محرومی سے نجات کے لئے لمبی چھلانگ لگائی تھی۔ محبت حاصل کرنے کے لئے جسارت کا مظاہرہ کیا تھا۔ عبدالعزیز نے اس کی محبت پر اندھی عقیدت سے لبیک کہا تھا۔ ایک بار یوسف کو دودھ پلاتے ہوئے اس کی زبان سے ادا ہوا تھا۔ ''تو پیدا نہ ہوتا تب بھی میری محبت اس کے لیے پاگل رہتی۔''

یوسف کے کانوں پر یہ جملہ پڑتے ہی اس نے گردن موڑ کر ماں کی نگاہوں میں جھانکا تھا۔ اس کا چہرہ زرد مائل لگ رہا تھا۔ سکینہ کو لگا اس کا پیٹ بھر گیا ہے۔ چند منٹوں بعد جب اس نے دوبارہ اسے پالنے میں جھانک کر دیکھا تو وہ آنکھیں وا کئے آسمان میں جانے کس چیز کو سنجیدگی سے دیکھے جارہا تھا۔

❦

سکینہ چاہتی تھی عبدالعزیز سے اکیلے میں ملاقات کرے اور اسے بتائے کہ وہ خود بھی کس طرح اس کے فراق میں ادھ مری ہوگئی ہے۔ مگر اسے موقع نہیں مل رہا تھا۔ اس کا یقین تھا کہ محبت کرنے والوں کو ملانے کے لیے فطرت اپنا رول ادا کرتی ہے۔ فطرت اس کے لیے صرف اور صرف محبت کا تسلسل تھی۔ اسے نظر آنے والی ہر شئے محبت میں غرق تھی۔ محبت کا یہ بھی تو کمال ہے کہ جو دل اس دولت سے معمور ہوتا ہے۔ اسے کائنات میں حسن اور فطرت کے ہر مظہر میں ارتباط نظر آتا ہے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں محبت معجزے نہیں کرتی...... محبت خود معجزہ ہے۔ محبت منظر اور آنکھ کے درمیان کا فاصلہ مٹا دیتی ہے۔ اس نے دروازے کا پٹ کھولا، عبدالعزیز نے اسے دیکھا۔

دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ ابھری، ایک چہرہ دھوپ میں دوسرا اوٹے دار کی چھاؤں میں تھا۔ مگر فراق سے دونوں پر ایک پژمردگی سی تھی۔

عبدالعزیز یوسف کو لئے اس کی طرف بڑھا۔ ساس پڑی میں کھانا بنا رہی تھی۔ سکینہ نے ایک بار مڑ کر پیچھے دیکھا اور کہا۔ ''جمعہ کے دن میں میرے والد کے گھر جانے والی ہوں......آ جانا......''

باب پنجم

ہر ایک طرف سے مجھے آسماں نے گھیرا تھا

وادیِ خواب میں اس کی آنکھ ایک ایسے چمن میں کھلی جس میں چھوٹے بڑے پھولوں کا انبار تھا۔ پودوں کے پتے رنگ برنگی تھے۔ مگر ان پر صرف سفید رنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اسے حیرانی ہوئی۔ اس طرح کا باغ اس نے پہلے تصور میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ پھولوں کے قریب گیا۔ جھک کر ان کی خوشبو سونگھنے لگا۔ ان پھولوں میں خوشبو نہ تھی۔ وہ مایوس ہو کر وہیں بیٹھ گیا۔ ایک پودے کی شاخ اس کے سر سے ٹکرائی۔ وہ مڑا۔ ایک بہت ہی لطیف مہک اس نے محسوس کی۔ اس نے شاخ سے ایک پتہ توڑا جو گہرے سمندری رنگ کا تھا۔ اس پتّے کو نتھنوں سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ مہک کی لہر اس کے نتھنوں سے گزر کر اس کے ذہن میں پھیل گئی۔ اس مہک میں ایک طرح کا نشہ تھا۔ چند منٹوں تک اس نے آنکھیں بند ہی رکھیں۔ وہ مہک اس کے سرائے بدن

میں مسافر کی طرح بھٹکتی رہی۔اس کی تھکان اتر گئی۔مایوسی دور ہوگئی۔ایک تازگی اس کے بدن میں بیدار ہوئی۔اسے ایسا لگا وہ قوی ہیکل ہے۔، مافوق الفطرت طاقتوں کا مالک ہے۔اس وقت وہ چمن میں بیٹھا تھا۔

مہک کا نشہ جب پوری طرح پھیل گیا تو ازخود اس کی آنکھیں کھل گئیں۔چمن غائب تھا اور وہ گھنے جنگل میں کھڑا تھا۔جہاں سفید پھولوں کے پودے تھے، وہاں اب لمبے لمبے رائیول آموں کے پیڑ تھے جن کے درمیان بیر، کاجو، پیپل، جامن، اور برگد کے پیڑ تھے۔وہ پریشان ہوگیا۔اس نے چاہا کہ وہ کسی طرح وہاں سے بھاگ جائے۔اس مہیب سایہ دار درختوں کے نیچے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔وہ جس سمت بھاگتا تھا اسے جنگل مزید گھنا لگتا۔وہ تھک کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔پاس ہی ایک بل پر اس کی نظر پڑی۔پھر دوسرے، تیسرے، چوتھے، پانچویں، چھٹے......حد ہوگئی۔اس کے اطراف جہاں تک اس کی آنکھ دیکھ سکتی تھی، اسے بل ہی بل نظر آئے۔ان بلوں کے اطراف کریدی ہوئی سرخ مٹی تھی۔گویا یہ بل ابھی ابھی بنائے ہوئے ہوں۔

اس نے آنکھیں بند کرلیں۔اس نے آنکھیں بند کیں تو اس کے ذہن میں اسے پھر وہ چمن نظر آیا۔جہاں سارے پھول سفید رنگ کے تھے۔اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی۔اسے پھولوں کو دیکھنا بچپن سے اچھا لگتا تھا۔وہ سارے پھول جنت الفردوس کے پھولوں کی طرح مہک رہے تھے۔وہ ہر پھول کو دوسرے پھول کی مہک سے الگ کر کے سونگھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔بہت دیر تک وہ ان کی خوشبوؤں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

پھر موسلا دھار بارش شروع ہوئی۔بارش کی بوندیں رنگ برنگی تھیں۔اسے ایسا لگا بارش کی ان بوندوں سے پھولوں پر بھانت بھانت کے رنگ چڑھ جائیں گے۔لیکن یہ اس کی خام خیالی ثابت ہوئی۔بارش کی بوندوں میں دراصل ایک عجیب سحر تھا۔ان کے

گرنے سے سارے پھول دیکھتے یہ دیکھتے تحلیل ہوگئے۔ باغ ویران ہوگیا۔

اس نے مایوس ہوکر آنکھیں کھولی۔ آنکھ کھلتے ہی اس نے دیکھا۔ اس نے جو دیکھا ،اس سے اس کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، ڈر سے اس کے دل کی حرکت بیٹھ گئی۔ اس نے دیکھا چاروں طرف بلوں سے سانپ منہ باہر نکالے اپنی زبان باہر کر کے اسے دیکھ رہے ہیں۔ سانپوں کا رنگ سفید تھا۔ اس سے پہلے اس نے سفید رنگ کے سانپ نہیں دیکھے تھے۔ ان کی زبانیں ایک ساتھ باہر نکلتیں اور واپس چلی جاتیں۔ وہ اندھے سانپ نہیں تھے بلکہ ان کی بینائی عام سانپوں سے بھی تیز تھی وہ زبانیں سمت اور حرکت کا تعین کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنے کمانڈر کے نعروں کا جواب دینے کے لیے نکال رہے تھے۔ ان کا زہر دنیا کا سب سے کاری زہر تھا۔ ان کی سانسوں سے درختوں کے پتے سوکھ کر گرنے لگے۔

وہ اس کی طرف بڑھنے لگے۔ اس کی آواز حلق ہی میں دب گئی تھی۔ وہ چیخنا چاہتا تھا مگر آواز نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ اس کا بدن پسینہ پسینہ ہوگیا۔

❀

''عبدالعزیز۔۔اورے وہ عبدالعزیز......عبدالعزیز تیرے دوست آئے ہیں۔''

مہرون نے اس کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کا بدن پسینے میں بھیگا تھا۔ پیشانی پر پسینے کر قطرے تھے۔ مہرون نے جھک کر کھڑکی کھولی اور کہا:۔''اتنی گرمی ہے گھڑکی کھلی رکھ کر سونا چاہیے۔'' کھڑکی کھلتے ہی کمرے میں دھوپ کے ساتھ ساتھ ہوا کے جھونکے بھی آئے۔ اس نے ماں سے پوچھا۔''کون ہے؟''

''وہی......وہی تینوں......'' مہرون نے ڈرامائی انداز میں منہ بنا کر کہا۔ عبدالعزیز بھی مسکرایا وہ جانتا ہے اس کی ماں نے اس انداز میں کیوں کہا ہے۔ درحقیقت، اسکول کے دنوں میں وہ اکثر ان ہی کے ساتھ سیر سپاٹے کے لئے نکل جایا کرتا تھا۔ واپسی پر

دیر ہو جاتی تب اسے خوب ڈانٹ پڑتی۔ غصّے میں مہرون ان تینوں دوستوں کے نام لے کر انھیں برا بھلا کہتی۔ یہ ماجرا صرف عبدالعزیز کے گھر میں ہی نہیں ہوتا بلکہ ان تینوں کے گھروں پر بھی اس طرح کا کہرام مچا ہوتا۔ دوسرے روز یہ چاروں مزہ لے کر ایک دوسرے کو بتاتے کے ان کی والدہ نے غصے میں کیا کیا کہا۔ کن کن گالیوں سے نواز۔ اور خوب ہنستے رہتے۔ دوسری طرف ان چاروں کی مائیں جب کنویں پر ملتیں تو شیر وشکر ہو جاتیں۔

عبدالعزیز نے کھونٹی پر سے ٹی شرٹ نکال کر پہنا اور باہر نکلا۔ تینوں دوستوں کو دیکھ کر پل بھر کے لئے وہ سکتے میں پڑ گیا۔ تینوں نے سفید کُرتا پائجامہ پہن رکھا تھا اور ان کے سر پر سفید جالی دار ٹوپیاں تھیں۔ اسے فوراً چند منٹوں قبل دیکھا ہوا خواب یاد آ گیا۔

اس نے اطراف نظر دوڑائی۔ نہیں۔۔ وہ جنگل میں نہیں تھا۔ وہ سچ مچ اس کے دوست تھے۔ اور وہ جاگ رہا تھا۔ مگر بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم خواب میں دیکھتے ہیں کہ ہم نیند کی حالت میں نہیں ہیں اور جو کچھ ہوتا ہے ہمیں لگتا ہے وہ واقعی ہو رہا ہے۔

آج اس خواب کی اس کے پاس کوئی تعبیر نہ تھی اس نے اس خواب کو بھی محض مبہم شاعری پڑھنے کے سبب نظر آنے والے خوابوں کی طرح ایک خواب ہی سمجھا۔ لیکن دس برسوں بعد اس خواب کو یاد کر کے وہ خون کے آنسو رونے والا تھا۔ سفید پھول جن میں مہک نہ تھی۔ ان کے سانپوں میں بدل جانے کا مفہوم جس روز اسے سمجھ میں آیا وہ دن اس کی زندگی کا آخری دن تھا۔ وہ سب کس کمانڈر کے اشارے پر آگے بڑھیں گے اس راز کے کھلنے پر اسے سکینہ کا جملہ ''محبت کی ہر نشانی خطرناک ہوتی ہے۔'' یاد آنے والا تھا۔

یہ آخری جملہ اس کی زبان سے ادا ہوگا۔ یہ بات لوح محفوظ پر پہلے سے تحریر تھی۔

شگفتہ نے اس راز کو سب پر عیاں اس لئے نہیں کیا کیونکہ اسے یہ بھی معلوم تھا بعض اوقات اس میں ترمیم کی گنجائش ہوتی ہے۔

❦

چاروں نے پڑی میں بیٹھ کر سلیمانی چائے پی اور منگیلدار کی طرف سے باہر نکلے۔ ایک تنگ گلی سے گزر کر وہ گانو کے کنویں تک پہنچے۔ کنویں کے اطراف کوکم کے لمبے لمبے پیڑ تھے۔ اس کے بعد ایک برساتی ندی راستے میں پڑتی تھی۔ جسے عبور کرنے کر کے وہ چاول کے کھیتوں کی طرف نکل پڑے۔ فصل کٹ گئی تھی چونڈے دکھائی دے رہے تھے۔ چند کھیتوں میں اب تک دھان کے پینڈوں کا انبار تھا۔

کاجو کے ایک پیڑ پر وہ چڑھ کر بیٹھ گئے۔ بچپن سے ان کی عادت تھی کہ وہ پیڑوں پر چڑھ کر شاخوں پر بیٹھ کر بات چیت کیا کرتے تھے۔ کچھ دیر یہاں وہاں کی باتیں کرتے رہے۔ پھر رشید نے پوچھا۔ ''ارے، جب تو سو کر اٹھ کے آیا تھا، تبھی تو ہمیں حیرانی سے کیوں دیکھ رہا تھا؟''

''کوئی خاص بات نہیں تھی۔'' عبدالعزیز نے جواب دیا۔ ''پر تو پریشان لگ رہا تھا۔'' پھر رشید نے کہا۔

''ہاں! تم لوگوں کو ایک جیسے کپڑوں میں دیکھ کر چونک گیا تھا۔ عبدالعزیز نے کہا۔

''تھوڑے دن جانے دے۔ تو بھی اس طرح کے کپڑے پہن لے گا۔'' رفیق ونو نے کہا۔

''کیوں رے؟'' عبدالعزیز نے اس کی اور دیکھ کر کہا۔

''سفید کپڑے پہنا سنت ہے۔'' رشید نے جواب دیا۔

گانو کی حد سے باہر آنے کے بعد وہ اپنے سروں سے ٹوپیاں اتار کر جیب میں ٹھونس چکے تھے۔ ''اور ٹوپی نہیں پہنو گے تو۔'' صابر نے کہا۔

''تو کیا ہوگا؟'' عبدالعزیز نے پوچھا۔

''کچھ نہیں کوئی نہ کوئی پہنا دے گا۔'' رشید نے کہا۔

''کیوں؟''

''سنّت ہے۔'' صابر نے کہا۔

''اور داڑھی نہیں رکھو گے؟''

''نہیں۔'' قدر غصّے میں عبدالعزیز نے کہا۔

''مجبور ہو کر رکھ لے گا''۔۔۔رشید نے صابر سے کہا۔

''ہاں رکھنا تو پڑے گا۔'' صابر نے اس سے کہا۔

''کیوں زبردستی ہے کیا؟'' عبدالعزیز نے پوچھا۔

''نہیں......سنت ہے یار۔'' رشید نے کہا۔ جس کے چہرے پر ہلکی داڑھی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا ''اگر تو نہیں رکھے گا تو گانو والے رکھوالیں گے۔''

گزشتہ چند برسوں میں جماعت کا کام تیز ہوگیا۔ سورل کی مسجد 'مرکز' میں بدل گئی تھی۔ مختلف ریاستوں اور شہروں سے جماعتیں یہاں آتیں اور پھر اطراف کے گانوؤں میں دعوت کے کام کے لئے چلی جاتیں۔ ہر جمعہ کو عصر کی نماز کے بعد جماعت کے نمایندے گشت پر نکلتے۔ گھر گھر جا کر لوگوں سے ملتے، انھیں ان کی مذہبی ذمّے داریاں یاد دلاتے۔ انھیں جنّت میں لے جانے والے اعمال یاد دلاتے۔ اللہ کو ناراض کرنے والے کام کون کون سے ہیں بتاتے۔ پھر مغرب کی نماز بعد مسجد میں آ کر بیان، سننے کی دعوت دیتے۔

بیان بعض اوقات بہت جذباتی ہو جاتا جس میں مسلمانوں کی پسماندگی اور محرومیوں کو دین سے دوری کا نتیجہ بتایا جاتا۔ کافروں اور یہودیوں کی سازشوں سے پردا اٹھایا جاتا۔

جماعت لوگوں کو گناہوں سے بچنے، نیک اعمال کو اپنانے اور قرآن وحدیث کو اپنی زندگی میں برتنے کا درس دیتی ہے۔ ان ہی بھلی باتوں سے جماعت ہر خاص وعام میں مقبول ہوئی۔ کیونکہ ان خیالات میں ایسی کوئی بات بہ ظاہر نہ تھی جس کی کوئی مخالفت کرتا۔

رفتہ رفتہ تحریک بہت مضبوط ہوگئی۔ بوڑھوں، نوجوانوں اور نوعمر لڑکوں نے جماعت میں جانا شروع کیا۔ چار مہینے، چالیس دن، دس دن اور تین دنوں کے لئے بڑی تعداد میں لوگ آنے جانے لگے۔ ہر گھر میں جماعت کی نصابی کتاب کی قرأت ہونے لگی۔ مسجد میں روزانہ عشاء کی نماز کے بعد اسے پڑھا جانے لگا۔

لوگوں نے خود کو مومن کہنا شروع کیا۔ ایمان والا، غیر ایمان والا، بے دین، مشرک، کافر کا فرق انھیں سمجھ میں آنے لگا۔ اسلامی لباس، داڑھی، ٹوپی، برقعہ، تسبیح اور روزے کی اہمیت سے لوگ آگاہ ہوئے۔ بچوں کی مذہبی تعلیم وتربیت، لڑکیوں کے اخلاق و اطوار، نامحرم مردوں اور عورتوں کے درمیان درکار فاصلے کی طرف زیادہ زور دیا جانے لگا۔

عورتوں کو تمام نامحرم افراد سے بچنے بچانے کے لئے برقعے کو لازم قرار دیا گیا لیکن مردوں نے اس معاملے میں اپنے لیے کوئی لائحہ عمل نہیں بنایا۔ نہ عمل کیا۔

وقت نے جماعت کو ان لوگوں پر بھی مسلط کر دیا جو اس کی تعلیمات کو مانتے نہ تھے مگر سماج میں عزت سے رہنے اور لوگوں کے درمیان ''اچھا'' کہلانے کے لئے کرتا، پائجامہ، داڑھی، ٹوپی کو اختیار کر لیا۔

داڑی منڈ دانا کافروں، انگریزوں، یہودیوں اور شیاطین کا فعل کہلایا۔ اس لئے چارونا چار داڑھی رکھنے میں ہی لوگوں نے عافیت سمجھی۔ ہوتا یہ تھا کہ داڑھی نہ رکھنے پر ہر ملنے والا نصیحت کرتا اور کہتا: سُنّت کا مذاق اڑا رہے ہو، قیامت کا ڈر دل میں ہے

یا نہیں؟''

اسلامی کرن کی لہر جب تیز ہوئی تو اس کا ذہنوں پر اثر فطری تھا۔ دو باتیں بہت اہم ہوئیں (۱) دنیا کی چاہ اور ترقی ہیچ قرار دی گئی۔ (۲) اپنے عقیدے کے علاوہ، تمام عقائد مذاہب اور ثقافتی اظہار کو باطل قرار دے دیا گیا۔

پہلی بات نے مدارس کے قیام کو ہوا دی اور دوسری نے غیر مسلموں سے روابط کو کمزور کر دیا۔ جس کے نتیجے میں معاشرتی سطح پر تبدیلیاں شروع ہوئیں۔ سب سے تکلیف دہ رجحان ذریعہ تعلیم اور مقامی ثقافت کے تحت تھا۔ مراٹھی کو ہندوں کی زبان کہہ کر مراٹھی اسکولوں میں مسلم بچوں کو [غیر تحریری سطح پر] پڑھانا عیب قرار دے دیا گیا۔ اردو کو مسلمان کی زبان کہا گیا۔۔ ہندوؤں کے تہواروں میں شرکت، شرک ہوگئی جس نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان [نظر نہ آنے والی] خلیج پیدا کرنا شروع کر دیا۔

نتیجتاً چند برسوں میں اہل کوکن کا مشترکہ کلچر مجروح ہو کر عربوں اور شمالی ہند کی تباہ حال ریاستوں کا چربہ ہو گیا۔

۲

عبدالعزیز نے رشید کی بات کو سنجیدگی سے سنا اور رفیق ونو کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''گانو والے کیوں زبردستی کریں گے۔''

صابر کو ہنسی آئی۔

''ہنس کیوں رہا ہے۔ تو۔۔۔۔'' عبدالعزیز نے پوچھا۔

''تیری معصومیت پر'' رفیق نے جواب دیا جب کہ سوال صابر سے کیا گیا تھا۔

''تو کویت میں رہ کر آیا ہے۔ تجھے نہیں پتہ۔۔۔ اپنے دین میں داڑھی، ٹوپی اور سفید کپڑے پہننا فرض ہے۔'' رشید نے کہا۔

''فرض!!!!'' حیرت سے عبدالعزیز کی زبان سے ادا ہوا۔

''ہاں۔۔۔فرض۔۔۔۔جو ایسا نہ کرے وہ شیطان کا بھائی ہوتا ہے۔اسلام سے بغاوت کرنے والا ہوتا ہے۔۔۔'' رشید نے کہا۔

رفیق ونو جو رشید کی باتوں کو دھیان سے سن رہا تھا۔اس نے رشید سے مخاطب ہو کر کہا۔''عصر کی اذان کا ٹائم ہو رہا ہے۔تو نکل۔۔۔آج گشت کی ذمہ داری تیرے اوپر ہے نا؟

رشید نے عبدالعزیز کی طرف دیکھا اور کہا۔''یار، میرے ابّا اب ہفتے واری گشت کے ذمے دار ہیں مجھے نکلنا ہوگا۔ورنہ بگڑ جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔تو نکل۔۔۔اور کسی سے مت کہنا ہم لوگ کدھر ہیں۔'' صابر نے اس سے کہا۔

رشید نے شاخ سے چھلانگ لگائی۔اللہ حافظ کہا اور گاؤں کی طرف چل پڑا۔تینوں اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔پھر رفیق نے عبدالعزیز کو وہ ساری کتھا سنائی جو اس کی غیر موجودگی میں گاؤں میں ہوئی تھی۔اسے معلوم نہ تھا کہ مسجد کی از سر نو تعمیر ہوئی ہے۔اور اس کے ساتھ ہی ایک دینی مدرسہ ''اقسام العلوم'' کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔جس میں بچّوں کو قرآن حفظ کرایا جاتا ہے۔اس مدرسے کے بانی سکینہ کے شوہر مجاور حسین ہیں۔

***

مجاور حسین کا نام سنتے ہی عبدالعزیز کا دھیان اس کی باتوں سے ہٹ گیا۔

رفیق جماعت کے فرمودات اور لوگوں کے روزمرہ کے معمولات میں در آنے والی غیر فطری تبدیلیوں کا ذکر کر رہا تھا۔رفیق نے اس کے ساتھ مراٹھی میڈیم میں تعلیم حاصل کی تھی۔مراٹھی ڈراموں سے اسے بے حد لگاؤ تھا۔ڈرامہ کمپیٹیشن میں اس نے تعلقہ

کی سطح پر اسکول کے لئے کئی انعامات حاصل کیے تھے۔ اچھا اداکار تھا اسی خوبی کے سبب میٹرک کے بعد بھی اسکول کے پرنسپل اسے ہدایتکاری کے لیے اسکول بلاتے تھے۔ نانا صاحب مرگوپی کر، سدھا کر، کرمرکر، پرانچے اور پو۔ لا۔ دیش پانڈے اس کے پسندیدہ ڈرامہ نگار تھے۔ عبدالعزیز نے جب گریجویشن میں پوزیشن حاصل کی تھی تب رفیق نے اسے وجے تینڈلکر کا ڈرامہ ''سکھارام پائنڈر'' تحفے میں دیا تھا۔

اپنے سماج میں جماعت کے اثر سے در آنے والی تبدیلیوں سے وہ بے حد پریشان تھا۔ اسے جب بہت گراں گزرتا تھا تو وہ صابر کے سامنے اپنا فرسٹیرشن نکالتا۔ صابر کو اس سے بے حد عقیدت تھی۔ وہ اس کی باتیں سن لیتا اور دل میں محفوظ رکھتا۔ آج عبدالعزیز کے آنے کے بعد وہ اس موضوع پر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر رہا تھا۔ عبدالعزیز دیکھ تو اس کی آنکھوں میں رہا تھا لیکن کسی دوسرے منظر میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ منظر:

سکینہ نے کھڑکی کے پاس آہستہ سے اس سے کہا تھا کہ جمعہ کے روز اپنے والد سے ملنے جانے والی ہے۔ اس لمحے اس کی آنکھوں میں خوشی چھلک گئی تھی۔ ایک مدت سے وہ سکینہ سے ہم آغوش ہونے کے لئے بے قرار تھا۔ بڑی مشکل سے ایک ایک منٹ جوں توں اس نے کاٹا اور جمعہ کی نماز سے آدھا گھنٹہ قبل ہی وہ اس کے گھر پہنچ گیا۔ سکینہ کے والد نے فخرالدین کے لئے اپنے ہی احاطے میں ایک چھوٹا سا مکان بنوا دیا تھا۔ جہاں وہ اپنی اہلیہ اور دو بچوں کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ جب وہ حویلی نما مکان میں داخل ہوا عین اس وقت سکینہ کے والد اور فخرالدین نماز جمعہ کے لئے باہر نکل رہے تھے۔ عبدالعزیز نے دونوں کو سلام کیا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب

دیا۔ عبدالعزیز نے بتایا کہ ''سکینہ آپا سے ملنا ہے، تھوڑا کام ہے۔'' فخرالدین نے جواب دیا کہ ''وہ بچوں سے باتیں کررہی ہے، سامنے چلے جاؤ......''

عبدالعزیز احاطے میں بنے سرخ پتھروں والے مکان کے دروازے پر پہنچا۔ اندر سکینہ ایک میز پر بیٹھی تھی یوسف فخرالدین کی بیوی کی گود میں سورہا تھا۔ فخرالدین کی دو لڑکیاں اب خاصی بڑی ہوگئی تھیں۔ سکینہ کے قریب کھڑے رہ کر وہ سکینہ کو پہاڑے سنا رہی تھیں۔

عبدالعزیز خاموش کھڑا رہا۔ سکینہ کو دیکھتے ہی گویا اس کے قدم رک گئے تھے۔ اس کی سانس تھم سی گئی تھیں۔ سکینہ کے چہرے پر اس کی نظریں مرکوز تھیں۔ اسے ایسا لگا وہ وہاں ہے نہیں کہ آگے بڑھے۔ فخرالدین کی بڑی بیٹی کی نظر اس پر پڑی تو اس نے مڑکر اپنی ماں سے کہا۔ ''ماں ماں دیکھو......ایک لڑکا......''

اسے دیکھتے ہی سکینہ کھڑی ہوگئی۔ وہ چاہتی تھی دوڑ کر اس سے لپٹ جائے اور اس کے پورے بدن پر اپنے لبوں سے ایک عبارت لکھ دے۔ جس میں مہجور دنوں کے درد کا نوحہ محفوظ تھا۔ جس عبارت کو وہ روز اپنے سینے میں کروٹیں بدلتے ہوئے محسوس کرتی تھی۔ جس عبارت کو وہ اپنے بدن کی تبدیلیوں میں محسوس کرتی تھی۔ جب شوہر کے ساتھ ہم بستر ہوتی اس وقت بھی عبدالعزیز کا چہرہ اس کے شوہر کے چہرے پر چھا جاتا۔ اس دھند لکے میں یہ عبارت اس کے دل سے نکل کر اس کے لبوں تک آجاتی مگر جوں ہی مجاور حسین کا چہرہ اسے نظر آجاتا ایک احساس محرومی کے ساتھ یہ عبارت نہاں خانہء دل میں لوٹ جاتی۔

اس نے فخرالدین کی بیوی سے کہا۔ ''یہ میرے سسرال سے آئے ہیں۔ تم منے کو چادر پر سلا دو، میں ابھی آتی ہوں۔''

حویلی میں داخل ہوتے ہی بائیں ہاتھ پر ایک کمرہ تھا۔ وہ دونوں اندر گئے۔ کمرے میں چند بوریاں اور دو بڑی پیٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دیواروں کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ بوریوں سے الگ کر ایک اور دروازہ تھا۔ سکینہ نے اسے ڈھکیلا اور آگے بڑھی۔ یہ نسبتاً چھوٹا کمرہ تھا۔ اس میں اناج کے ڈبے اور چاول کی گونیاں تھیں۔ اس نے مڑ کر عبدالعزیز کو دیکھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز تھی۔ چہرے پر ڈر کی ایک تہہ تھی۔ اسے لگا اس کمرے میں وہ بیٹھ کر باتیں کریں گے لیکن ایسا نہ ہوا۔ سکینہ نے بلب جلایا تو عبدالعزیز یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ دائیں ہاتھ پر ایک اور دروازہ ہے۔ سکینہ نے اس دروازے کو ہلکے سے ڈھکیلا۔ اب وہ کیچن میں تھے۔

''سامنے کے دروازے سے بھی یہاں آسکتے تھے۔'' سکینہ نے چولہے کے سامنے کی کھڑکی کو بند کرتے ہوئے کہا۔

''تو پھر اتنے سارے کمروں سے گزر کر یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''میں نے اس دروازے پر باہر سے ٹالا لگا رکھا ہے۔''

''اور اگر تمھارے ابّا آگئے تو۔۔۔''

''تو کہہ دینا میں تمھاری بیٹی سے عشق کرتا ہوں''۔۔۔ وہ ہنسی'

''وہ میرا خون کر دیں گے۔''

''ٹھیک ہے تو میں کہہ دوں گی کہ...... کہ میں اس سے عشق کرتی ہوں......'' وہ پھر ہنسی۔

''اوہ شانی! تب بھی وہ میرا ہی کتل کریں گے۔'' عبدالعزیز نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ڈرتے ہو کیا؟''

عبدالعزیز سوچنے لگا کہ اس سوال کا کیا جواب دے۔ وہ چپ سادھے اسے دیکھتا

رہا۔ یکایک اس کے دل نے زبان کو حرکت دی، لفظوں کو روپ ملا۔ ''جہاں ڈر نہیں ہوتا وہاں محبت نہیں ہوتی۔''

اس جملے کو سن کر بہت ساری یادیں تازہ ہوگئیں۔ سکینہ نے اپنے پیروں میں ایک طرح کی کمزوری محسوس کی۔ اس کا دل عبدالعزیز کے قرب سے چھوئی موئی کے پودے کی طرح (پنی ہی نسیجوں میں) سکڑنے لگا۔ اس کے گالوں کا رنگ بدلنے لگا۔ جو عبارت اس کے اندر آشفتہ تھی وہ پل بھر میں یکجا ہو کر اس کی آنکھوں میں آٹھہری۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''تم یہاں کوکم لینے آئے ہو...... سمجھے! اگر کوئی آئے تو فوراً پچھلے کمرے میں چلے جانا۔''

عبدالعزیز کی نظریں اس کی زبان پر تھیں جس کا رنگ پیڑ پر لٹکے پکے ہوئے کوکم کی طرح شرابی تھا۔!! کتنے لمبے انتظار کے بعد آج وہ اس کے اتنے قریب کھڑا تھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا۔

''میں سچ مچ کوکم ہی لینے آیا ہوں۔''

کوکم کا نشہ اس کے منہ میں پھیل گیا۔ اور واقعی کچھ دیر پہلے سکینہ نے سوکھائے ہوئے کوکم کے کچھ ٹکڑے چوسے تھے۔ عبدالعزیز دیوار سے الگ کر بیٹھ گیا۔ سکینہ نے اس کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔ یوسف کی پیدائش کے بعد آج پہلی بار وہ یوں ایک دوسرے کے روبرو تھے۔ بہت دیر تک وہ یوسف سے متعلق باتیں کرتے رہے۔

اس ملاقات پر سکینہ نے عبدالعزیز کو بتایا مجاور حسین نے ارادہ ظاہر کیا ہے پانچویں جماعت تک اسکول کی تعلیم دلانے کے بعد وہ یوسف کو ایک مدرسے میں حافظ بننے کے لئے بھیجیں گے۔ وہ یوسف کو ایک بہت بڑا عالم دین بنانا چاہتے ہیں۔

گھر میں بھی نماز کی پابندی کی بار بار ہدایت کرتے ہیں۔ انھیں خوش رکھنے کے لئے ،نہ چاہتے ہوئے بھی دو چار رکعت پڑھ لیتی ہوں۔ یوسف کے قدموں سے گھر کا ماحول بدل گیا ہے۔ اس کی ساس اسے بیٹی کی طرح سنبھالنے لگی ہے اور مجاور حسین بھی اس کے لئے جی جان ایک کیے رہتے ہیں۔

عبدالعزیز کے لئے یہ باتیں تکلیف دہ تھیں۔ مگر وہ سنتا رہا۔ اسے احساس تھا، یوسف پر اس کا اختیار نہیں ہے اور نہ ہی سکینہ کے گھریلو زندگی پر۔۔۔ جب سکینہ کہہ چکی تو تھوڑی دیر کے لئے دونوں چپ رہے۔ صرف دونوں کی آنکھیں باتیں کرتی رہیں۔ پھر دونوں برسوں سے بچھڑے جسم و جاں کی طرح لپٹ گئے۔ دونوں کی روحوں میں ایک رنگ تھا جو ایک دوسرے میں سرایت کے لئے بدن کے قفل کرید رہا تھا۔ دونوں کی آنکھوں کی سفیدی یکا یک اس رنگ کے احساس سے سرخ ریشوں میں بدل گئی۔ دونوں کا وجود غائب تھا۔

❧

شام کو عبدالعزیز جب نہانے بیٹھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ صابن کا سفید جھاگ نیم شرابی رنگ میں بدل گیا ہے۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں جھاگ لے کر اپنی ناک کے قریب کیا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔ پھر سرشاری سے اس کی روح ندی کے بہاؤ کی طرح تازہ دم ہو گئی۔۔۔۔۔ اس جھاگ سے کوکم کی من موہک خوشبو آرہی تھی۔ وہ بہت دیر تک اس مہک کو سونگھتا رہا۔ ایک طرح کی مدہوشی اس پر طاری ہوگئی تھی۔ اگر مہرون نے آواز نہ لگائی ہوتی تو شاید اسے وقت کا اندازہ ہی نہ ہوتا۔

﴿5﴾

رفیق نے جب اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”تیرا کیا خیال ہے، یہ لوگ ہماری زندگی کو اور کس حد تک بدلیں گے؟“

تو وہ ہڑ بڑا گیا۔۔اس کی زبان سے بس اتنا ادا ہوا۔'' آ۔۔۔۔آہاں۔۔۔'' رفیق کو ایسا لگا عبدالعزیز اس پوری کہانی سے دل برداشتہ ہے۔اس لئے افسوس سے اس کی زبان سے یہ کلمہ ادا ہوا ہے۔

''لیکن آج تم دونوں ان کی طرح کپڑے پہنے ہوئے کیوں ہو؟'' تھوڑی دیر کی چپ کے بعد عبدالعزیز نے پوچھا۔

''یار میرے اور اس کے ابا پچھلے مہینے ہی جماعت میں چالیس دن کے لئے جا کر آئے ہیں؟'' صابر نے کہا۔

''تو کیا ہوا۔۔۔۔۔''

''یار۔۔۔۔ پینٹ اور شرٹ پہننے کو وہ مذہب کے خلاف کہتے ہیں ؛اور اجتے ما (اجتماع) کے دن کرتا پائجامہ پہننا ایکدم کمپّل سری ہو گیا ہے۔'' رفیق ونو نے اسے بتایا۔

''یعنی آج اجتماع ہے؟''

''ہاں۔۔۔۔۔۔جمعہ کا دن ہفتے واری !اجتے ما کا دن ہوتا ہے۔''

''پھر۔۔۔۔جانا نہیں ہے کیا۔؟'' عبدالعزیز نے پوچھا۔

''مگرب کے بعد بیان ہوتا ہے تب پہنچ جائینگے۔۔'' رفیق نے بتایا۔

''سالا میرا باپ بہت بگڑتا ہے، بیان کے ٹائم مسجد سے غیر حاضر پاتا ہے تو۔۔۔۔'' صابر نے کہا۔

''بیان میں کیا ہوتا ہے؟'' عبدالعزیز نے پوچھا۔

''بیان میں'' رفیق ٹھہر گیا......س کی نظریں صابر کے چہرے پر تھیں جو کچھ کہنے کے لئے''میں بولتا ہوں......بیان میں چھ باتوں پر زور دیا جاتا ہے۔''(اس نے چھ باتیں تفصیل سے سمجھائیں۔)

''یار، اس کے ساتھ اتنا کچھ ہوتا ہے نا کہ عقل کام نہیں کرتی۔۔ ہر چیز کو گناہ بتاتے ہیں۔گانا سننا اور گانا گناہ۔۔لڑکیوں کی طرف دیکھنا گناہ۔داڑھی نہ رکھنا گناہ۔ٹوپی نہ پہننا گناہ، تصویریں نکالنا گناہ۔تاشے بجانا گناہ، شہنائی گناہ۔۔۔ ہولی گناہ، دیوالی گناہ ، اتسو میں لیزم کھیلنا گناہ۔ ناچنا گناہ۔سگی بہنوں کے علاوہ دوسری تمام لڑکیوں سے بات کرنا گناہ۔۔۔بتاؤ۔۔۔۔بتاؤ اب کوئی کیا کرے۔۔''عبدالعزیز کا چہرا سنجیدہ ہوتا جارہا تھا۔اسے حیرانی ہو رہی تھی کہ خدا کا گھر کیوں کر اجتماعی کلچر کے خلاف اور افراد کے باہمی تعلقات کو تباہ و برباد کرنے کے لئے ایک پلیٹ فارم کے طور پر استعمال ہوسکتا ہے۔۔اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ جو لوگ برسوں سے ہندؤوں کے تہواروں کا حصہ بنے رہے ہیں، ان کی طرح زندگی گزارتے رہے ہیں ، ان کے ساتھ تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں۔ان کے ساتھ ایک ثقافت کا حصہ بنے رہے ہیں۔ یکا یک ہر چیز کو گناہ کی نظر سے دیکھنے لگیں گے۔

اس کے لئے خدا کا تصور افراد کا نجی معاملہ تھا۔اس کے لئے مسجد اور مندر عبادت کا مقام تھے۔ مذہبی سیاست کے لئے ان مقدس مقامات کا استعمال ہوگا اس بات کا اسے گمان نہ تھا۔ بلکہ اس سے پہلے مذہب......اس کا اپنا مذہب...... اور غیر مسلم دوستوں کا مذہب اس کے لئے کبھی مسئلہ نہ تھا۔اور نہ ہی مذہب کوئی دیوار تھی ان کے درمیان!!اس لئے عبادت گاہوں اور مذہبی سیاست کے درمیان کا رشتہ کس قدر گہرا ہوسکتا ہے، اس بات کا اسے اندازہ نہ تھا۔ وہ اس بات سے واقف نہ تھا کہ بعض مذاہب دوسرے مذاہب کے ارتقاء کے دشمن ہیں ......جن کے نزدیک صرف 'ہم مذہب لوگ مساوی ہیں باقی سارے مشرک، بت پرست، اور جہنمی......جن کی زندگی اسفل اور غیر مساوی ہے۔

''جب تک میں نہیں سنوں گا یقین نہیں کروں گا۔۔''عبدالعزیز نے کہا۔

''ٹھیک ہے تو چل ہمارے ساتھ۔'' صابر نے کہا گویا عبدالعزیز کو اکسا رہا ہو۔
''آج نہیں......آج، والد صاحب کے ساتھ بہت ساری باتیں کرنا ہے۔ کسی اور جمعہ کو۔''
''تجھے بہت افسوس ہوگا......میں تجھے جانتا ہوں۔'' رفیق ونو نے کہا۔
''دیکھیں گے یار......آخر ہے کیا یہ جماعت اور کہاں سے آئی ہے اور چاہتی کیا ہے۔'' عبدالعزیز نے کہا۔
''ٹھیک ہے بیٹے......چل اب نکلتے ہیں......سورج ڈوبنے والا ہے۔'' صابر نے اتنا کہہ کر کاجو کی شاخ، جو اس کے وزن سے جھک گئی تھی اس پر سے چھلانگ لگائی۔
تینوں جس راستے سے آئے تھے، اس پر چل پڑے۔ جو باتیں ان کے ذہنوں میں آرہی تھیں، کرتے رہے۔ سورج افق پر لیٹ گیا تھا شاید اس کی رگوں سے لہو کی پھوار لگی ہوئی تھی۔ جس کے سبب اردگرد پھیلے بادلوں کے ٹکڑے خون کی رنگت اختیار کرنے لگے تھے۔ کاجو کے دور تک پھیلے پیڑوں کے سر۔۔۔اس زرد اور سرخ لہو رنگ مدھم اجالے میں مغموم نظر آرہے تھے۔

❀

وہ کنویں سے کچھ دوری پر تھے۔
گاؤں کی چند عورتیں کنویں کے اطراف کے پتھروں پر بیٹھ کر کپڑے دھو رہی تھیں۔ دو لڑکیاں سروں پر تانبے کے ہانڈے اور کمر پر کلسی لیے، کوکم کے پیڑوں کے کنج سے گاؤں کی طرف لوٹ رہی تھیں۔
''بیٹے یاد ہے۔ یہاں آکر ہم لوگ پتھروں پر بیٹھا کرتے تھے؟'' رفیق نے عبدالعزیز سے کہا۔ عبدالعزیز کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی۔ صابر اس مسکراہٹ میں پوشیدہ بات کو سمجھ گیا تھا۔ اس نے فوراً کہا۔ ''پتلی پتلی کمر، کپڑوں کو دھوتے ہوئے ہلتی

ہے تو دیکھنے میں کتنا مزہ آتا ہے نا؟''

''گندی بات گندی بات......' رفیق نے منہ پر کلمے کی انگلی رکھ کر کہا۔

''اچھا گندی بات......تو ہی مجھے اور عزیز کو یہاں لے آتا تھا۔ بھول گیا۔'' صابر نے رفیق ونو کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تب ہم چھوٹے تھے۔'' جھٹ سے رفیق نے کہا۔ گویا کہنا چاہتا تھا کہ نوخیز جوانی کے کارناموں کو برا نہیں کہا جاسکتا۔

''تو اب تیرا جی نہیں کرتا۔'' صابر نے پوچھا۔

''اب دیکھنا چھوڑ دو۔۔۔ کچھ کیا بھی کرو۔'' عبدالعزیز نے کہا۔

''صابر اور رفیق ونو نے رُک کر فوراً ایک ساتھ کہا۔ ''یہ! تو نے کچھ کیا ہے کیا؟ کویت میں چانس ملا کیا؟''

عبدالعزیز ان کے اشتیاق کو دیکھ کر مسکراتا رہا۔

''یہ۔۔ بتانا۔ کیسا لگتا ہے، بولنا۔ بہت مزہ آتا ہے کیا؟'' صابر نے پوچھا۔

''کبھی خواب میں نہیں کیا؟۔۔۔'' عبدالعزیز نے پوچھا۔

''خواب میں تو ہوتا ہے مگر سچی کا کیسا ہوتا ہے۔'' صابر نے کہا۔

''وہ بھی خواب ہی ہوتا ہے۔'' عبدالعزیز نے جواب دیا۔

''کیا مطلب'' رفیق ونو نے پوچھا۔

''محبت میں جتنی بھی زندگی گزرتی ہے وہ ایک لمبی نیند ہے۔ اور اس میں پیار کے جو لمحے ہوتے ہیں وہ خوابوں کے سوا اور کچھ نہیں۔'' عبدالعزیز نے کہا۔

پھر اسے ایسا لگا کہ صابر اور رفیق کنفیوژ نہ ہوں۔ وہ اس بات کو آسانی سے سمجھانا چاہتا تھا مگر اس کا ذہن ناکام رہا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے سوچتا رہا۔ کس طرح سے انھیں بتائے کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔ صابر اور رفیق دونوں چپ تھے۔ انھیں ایسا لگا کہ

عبدالعزیز کی بات کو سمجھنے کے لیے شاید کچھ دیر چپ رہ کر اس پر غور کرنا بہتر ہے۔ وہ چند قدم آگے بڑھے۔ اس دوران عبدالعزیز کو یقین ہو گیا کہ ان ہی برسوں میں اس میں جو تبدیلیاں ہوئیں ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ باتوں کو وہ صرف ایک ہی طرح سے ادا کر سکتا ہے، چاہے ترسیل میں اسے ناکامی کا منہ ہی کیوں نہ دیکھنا پڑے۔ یہ احساس بڑا عجیب تھا۔ پل بھر میں وہ ساری چیزوں سے کٹ گیا۔ کنواں، پیڑ۔ کپڑے دھوتی ہوئی عورتیں۔ شام کی مدھم خاموشی میں پرندوں کے نغمے، ہوا کی موسیقی۔ سب سے کٹ کر وہ اپنے اندر غرق ہو گیا۔ وہ خود سمندر اور خود مغروق۔ ''کیا اسے ہی تنہائی کہتے ہیں۔''

کنویں کی دیوار پر وہ تینوں بیٹھ گئے۔ کوکم کے پیڑوں کے سائے ان پر لہرا رہے تھے۔ عورتوں نے عبدالعزیز کو دیکھا تو فوراً کھڑی ہو گئیں۔ پاس آئیں۔ وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے انھیں سلام کیا۔ بہت دیر تک وہ اس سے باتیں کرتی رہیں۔ جن کے رشتے دار خلیج میں تھے وہ ان ممالک کے بارے میں بھی سوالات پوچھتی رہیں۔

اس بات چیت سے عبدالعزیز کے مزاج میں جو یک لخت بیگانگی در آئی تھی وہ کم ہو گئی۔ اس کا موڈ دوبارہ پہلے جیسا ہو گیا۔ رفیق ونو اور صابر بھی گفتگو میں شریک ہو گئے۔ دس پندرہ منٹ وہاں گزرے۔ صابر نے کاڑنا (ڈول) لیا اور کنویں سے پانی نکالا۔ عبدالعزیز نے ہاتھ منہ دھویا۔ دو گھونٹ پانی پیا۔ کنویں کا پانی پی کر اس کا جی اور ہلکا ہو گیا۔ رفیق اور صابر نے بھی ہاتھ منہ دھویا اور پانی پیا۔ عورتیں دھوئے ہوئے کپڑے اپنی ٹوکریوں میں بھر رہی تھیں۔ اندھیرا گہرانے لگا تھا۔ تینوں دوست گاؤں کی طرف بڑھے۔ عورتیں سر پر ٹوکریاں لیے ان کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔ گاؤں میں وہ داخل ہوئے ہی تھے کہ مغرب کی اذان کی آواز ان کے کانوں پر پڑی۔ رفیق ونو نے عبدالعزیز سے کہا۔۔۔ ''چل بیٹے! اب ہم لوگ جلدی جلدی مسجد کی طرف نکل رہے

ہیں۔''

''کل ملیں گے۔''

''ٹھیک ہے تم لوگ نکلو۔۔۔اور ہاں کل میں نہیں ہوں۔ چپلون جانے والا ہوں۔ پرسوں......ٹھیک ہے''

''ٹھیک ہے۔''

''اچھا چل۔۔''

''چلو ٹھیک ہے۔''

﴿٦﴾

عبدالعزیز گھر میں پڑی کی طرف سے داخل ہوا۔ پڑی کے آنگن میں سلیم اور عارفہ پکڑا پکڑی کھیل رہے تھے۔

عارفہ نے عبدالعزیز کو آنگن کا کواڑ ہٹاتے ہوئے دیکھا تو جھٹ سے دوڑ کر اس کی طرف گئی۔ عبدالعزیز نے کوڑا بند کیا۔ عارفہ اس کے پیروں سے لپٹ گئی۔ عبدالعزیز نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ سلیم وہیں کھڑا رہ گیا۔ اسے اس بات کا افسوس تھا کہ کاش وہ پہلے دوڑ کر جاتا اور عبدالعزیز اسے اٹھا لیتا۔ عارفہ سے اسے حسد ہو رہی تھی۔ جو عبدالعزیز کے کندھے پر بیٹھی اسے چڑا رہی تھی۔ ابھی سلیم اس کو چڑاتا کہ دروازے پر شمیم آئی۔ ''ارے تم آ گئے ...... بھائی، کب سے تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔'' شمیم نے کہا۔

''ابا آ گئے ہیں؟'' عبدالعزیز کہتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔

''بہت دیر ہو گئی۔ باہر بیٹھے ہیں۔'' شمیم نے کہا۔

'' عبدالعزیز نے سلیم کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر عجیب الجھن نظر آ رہی تھی۔ شمیم نے عبدالعزیز کے کندھے پر سے عارفہ کو لیا۔ عبدالعزیز پڑی میں داخل

ہوتے ہوئے رک گیا۔ اس نے مڑکر سلیم کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''ناراض کیوں ہوا رے؟ تیرے سے چھوٹی ہے ناوہ...... بعد میں تجھے بھی کندھے پر اٹھاؤں گا۔''

سلیم خاموش کھڑا رہا۔ عبدالعزیز کو اس کے روہنسی چہرے پر ترس آیا۔ وہ مڑا اور اس نے سلیم کے گال پر ایک بوسہ لیا اور کہا۔ ''تھوڑی دیر بعد! ساتھ میں کھیلیں گے۔ ٹھیک ہے! چل جلدی سے مسکرا......''

عارفہ جو شمیم کی گود میں تھی اس نے منہ بنا کر اسے چڑایا۔ سلیم کے چہرے پر آتی مسکراہٹ پھر رُک گئی۔

''اوہو۔۔۔تم دونوں اب لڑنا چھوڑو گے یا تم کو کھانا کھلا کر سلا دوں۔''

''نہیں نہیں نہیں''...... دونوں کی زبان سے ساتھ میں ادا ہوا۔

عبدالعزیز حیران کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر شمیم نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''سونے کے نام پر ان کا کلیجہ نکلتا ہے۔ اور تم آئے ہو تو اب جلدی سونے کا سوال نہیں اٹھتا۔''

''چاچی میں یہ دیکھ کر حیران ہوں کہ سلیم ابھی روتڑا لگ رہا تھا اور اب دیکھو کیسا چہک رہا ہے۔'' عبدالعزیز نے سلیم کے ہنستے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کہا۔

''یہ ڈھونگی ہے! ڈرامہ بہت کرتا ہے، اس سے ہوشیار رہنا۔''

''اچھا!'' نوٹنکی، تجھے بعد میں ٹھیک کرتا ہوں۔'' عبدالعزیز نے کہا۔ سلیم زور زور سے ہنسنے لگا۔ وہ سب پڑی میں داخل ہوئے۔

چولہے کے پاس سے لکڑیوں کا دھواں اٹھ کر ساری پڑی میں پھیل رہا تھا۔ ہوا کا رُخ رہ رہ کر بدل رہا تھا۔ اس لیے مہرون نے چولہے کے پاس والی کھڑکی بند کر رکھی تھی۔ چاول کی روٹیاں بنانے کے لیے وہ آٹا گوندھ رہی تھی۔ چولہے پر توا گرم ہو رہا

تھا۔ایک طرف بڑے سے تھالے میں بانگڑا، مدیلی اور لیپ مچھلی کو نمک مصالحہ لگا کر رکھا گیا تھا۔ ماں کی طرف دیکھ کر عبدالعزیز نے کہا۔''ارے ماں اتنے دھوئیں میں کیوں بیٹھی ہو، کھڑکی تو کھول دو......' مہرون نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا......''ارے تو آ گیا، تیرے اّبا تیرا راستہ دیکھ رہے ہیں۔''میں تو کب سے آیا یہاں کھڑے رہ کر دیکھ رہا ہوں تمھارا دھیان تو صرف پٹ (اٹا) ملنے میں ہے۔'' شانے مذاق مت کر۔۔ میرا دھیان سب جگہ رہتا ہے۔'' مہرون نے کہا۔عبدالعزیز اور شمیم ہنسنے لگے۔شمیم کی طرف دیکھ کر مہرون نے پھر کہا۔''دیکھو تو! میں کیا اتنی بوڑھی ہوگئی ہوں جتنی یہ سمجھتا ہے۔''''ارے بالکل نہیں بھابھی ......آپ تو......آپ تو میرے سے بھی جوان ہو......'' عبدالعزیز نے قہقہہ لگایا اور شمیم کے کندھوں پر بانہیں ڈال کر ہنستا رہا۔

''تو بھی اس شیطان کے ساتھ مل کر میرا مذاق اڑا رہی ہے۔رک۔۔'' اتنا کہہ کر مہرون نے چولہے میں سے ایک جلتی ہوئی پتلی لکڑی نکالی اور کہا۔''تم دونوں کے گال پر ایک چٹکا دیتی ہوں۔''''ارے نہیں نہیں غلطی ہوگئی......'' عبدالعزیز نے کہا ......''آپ چاچی سے زیادہ نہیں، آنے والی بہو سے بھی زیادہ جوان ہو......'' شمیم کو اس بار ہنسی آئی ......لیکن مہرون کو عبدالعزیز کے اس جملے سے ایسا لگا عبدالعزیز نے زیادہ سنجیدہ بات مذاق میں کہہ دی ہو۔اس کا چہرہ اتر گیا۔اس نے لکڑی کو دوبارہ چول میں ڈال دیا اور گردن نیچے کیے آٹا ملنے لگی۔شمیم نے عبدالعزیز کی طرف دیکھا ......دونوں کے چہروں پر ایک طرح کی سرد لہر پھیل گئی ......

''ماں کچھ برا کہہ دیا......'' عبدالعزیز نے بسنے پر بیٹھے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''ماں بول نا؟ عبدالعزیز نے پھر کہا۔

چاول کی روٹی کو ہاتھوں پر بناتے ہوئے مہرون نے کہا۔''نہیں! پر اب سچ مچ اس

گھر میں بہو کا ہونا ضروری ہے، مجھے یاد ہی نہیں رہا۔۔۔‘‘

’’ارے ماں میں مذاق کر رہا تھا۔‘‘

’’تیری عمر کے لڑکوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔‘‘

’’سب کی نہیں...... دیکھو میرے دوست رفیق اور صابر کو...... ان کی کہاں ہوئی ہے؟‘‘

’’گدھے! وہ کماتے دھماتے نہیں ہیں! اس لئے کوئی لڑکی نہیں دے رہا ہے لیکن رشید کی تو ہوگئی نا؟‘‘

’’رشید کی۔۔۔‘‘

’’کیوں تجھے نہیں بتایا اس نے۔‘‘

’’نہیں ماں۔۔۔۔ شاید یاد نہیں رہا۔۔‘‘

’’سنگمیشور سے لایا ہے، جماعت میں اس کے باپ نے رشتہ کیا تھا۔ بولتا ہے مدرسے میں پڑھی ہوئی ہے۔‘‘

’’معلوم نہیں......‘‘

شمیم نے توے پر سے روٹی اتارتے ہوئے کہا۔ ’’بھابھی۔۔۔ فکر کیوں کرتی ہو۔۔۔ عبدالعزیز کے لئے دیکھنا کل سے ہی رشتوں کی لائن لگے گی۔۔۔ ہمیں رشتہ بھیجنا بھی نہیں پڑے گا۔۔‘‘

عبدالعزیز سمجھ گیا کہ ماں کی ناراضی کا سبب کوئی ایسا سنجیدہ نہیں ہے اس کی دلچسپی کم ہوگئی۔ وہ اٹھ ہی رہا تھا کہ سلیم دوڑتا ہوا آیا اور پڑی کے دروازے پر سے اس نے کہا۔ ۔’’چاچا بلا رہے ہیں۔۔‘‘
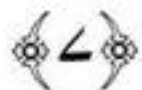
وٹے دار کے آنگن میں اس کے والد اور چچا کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے

جا کر ان سے ہاتھ ملایا۔ پیچھے سے سلیم ایک پترے کی کرسی لے آیا۔۔عبدالعزیز اس پر بیٹھ گیا۔ بہت دیر تک وہ باتیں کرتے رہے۔اپنے بیٹے سے وقار حسین برسوں بعد باتیں کر رہے تھے۔آج عبدالعزیز ایک باشعور آدمی کے طور پر ان کے سامنے بیٹھا تھا۔اس کی آواز اور باتوں میں پختگی تھی لہجے میں پہلے سے زیادہ کشش تھی۔وقار حسین کو اس گفتگو میں ایک بات کی توقع تھی کہ بات چیت کے دوران اس کی زبان سے۔۔۔ 'معافی مشکل'۔۔۔ 'اللہ کریم' جیسے عربی الفاظ سننے ملیں گے۔جب انھیں ایک گھنٹے تک ایسا کوئی لفظ سننے نہ ملا۔تو انھوں نے پوچھا۔'' بیٹے کیا وہاں انگلش لوگوں کے ساتھ تھے۔عربی بالکل نہیں سیکھی۔''

''آپ کو ایسا کیوں لگا۔'' عبدالعزیز نے اشتیاق سے پوچھا۔

''ارے جتنے لڑکے آج کل فورن سے آتے ہیں ان کی زبان پر ہر وقت '' معافی مشکل اور اللہ کریم ۔۔رہتا ہے۔'' وقار حسین نے سنجیدگی سے کہا۔

عبدالعزیز کو ہنسی آگئی وہ سوچنے لگا۔اب کیا کہے۔اپنے والد کی سادگی پر اسے حیرت نہ ہوئی۔اس جنریشن کے لوگ how are you اور Sorry کہنے والوں کے بارے میں کہتے تھے۔کیا انگلش بولتا ہے؟ اہل کوکن میں لسانی احساس کمتری نہیں ہے بلکہ تعلیمی پسماندگی ہے۔خلیج میں جھاڑو دینے والا آدمی بھی جب چھٹی پر وطن لوٹتا ہے تو وہ خود کو اہل سعود میں شمار کرتا ہے۔خود کو عرب تصور کرنے کی اِس وباء نے ان کی زبان پر عوامی عربی کے چند فقرے چڑھا دئے ہیں۔ویسے بھی تین چار برسوں میں کوئی بھی شخص عوامی زبان کا کچھ حصہ سیکھ لیتا ہے۔اس کا سبب ضرورت اور مجبوری ہوتی ہے۔لیکن گانو میں دوسروں کو امپریس کرنے کے لئے یہ عربی الفاظ کیوں استعمال کرتے ہیں اس کا سبب یہ جانیں یا ان کا خدا جانے۔یہ ایسا ہی ہے کہ ہم سنسکرت نہ جاننے والوں کے سامنے اس کے الفاظ یا تامل نہ جاننے والوں کے سامنے تامل بولنے کی حماقت کریں۔

''وہ کیا ہے نا جو لوگ عربوں کے گھروں میں ڈرائیونگ یا صاف صفائی کرتے ہیں یا دکانوں میں نوکری کرتے ہیں وہ بہت جلدی عربی سیکھ لیتے ہیں۔''

عبدالعزیز نے بہت سوچ کر جواب دیا۔

''تم نے بالکل نہیں سیکھی۔۔''حمید حسین نے پوچھا۔

''نہیں تھوڑی بہت سیکھی ہے مگر میرے بینک میں زیادہ تر لوگ برٹش تھے اس لئے زیادہ موقع نہیں ملا۔''

''تو پھر تیری انگلش گوروں کے جیسی ہوگئی ہو گی۔۔''وقار حسین نے فوراً کہا۔

عبدالعزیز نے سوچا اب کیا کہے۔ وہ چپ رہا۔ پھر اس نے جواب دیا۔''ہاں ابّا جان۔''اب اسے ہندوستان میں کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ اس لئے میں یہاں اس انگلش کا استعمال نہیں کر پاؤں گا۔''

وقار حسین اور حمید حسین نے ہونٹوں کو سکیڑ کر گردن ہلائی۔ جس میں حیرت کے علاوہ ایک مشکل کام کو انجام دینے پر خوشی اور تعجب کا ملا جلا اظہار مقصود تھا۔

عبدالعزیز دل ہی دل ان کے بھولپن پر مسکراتا رہا۔ عارفہ ایک کونے میں اپنے کھلونے بچھا کر کھانا بنا رہی تھی اور سلیم کرسی کے پاس کھڑا ہو کر بڑوں کی باتوں کو بہ غور سن رہا تھا۔

❦

''کھانا لگا دیں۔۔۔ مہرون بھابھی پوچھ رہی ہیں۔''شمیم نے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا۔

''کیا وقت ہو رہا ہے؟''

''پونے آٹھ۔۔۔۔''شمیم نے کہا۔

''بتاؤ! پتہ ہی نہیں چلا۔ کتنا وقت گزر گیا۔۔۔ وقار حسین نے شمیم کی طرف دیکھ کر

کہا۔ وہ مسکرائی۔

''اتنے دنوں بعد عزیز کے ساتھ جو بیٹھے ہیں۔'' مسکراتے ہوئے ہی شمیم نے کہا۔

''ہاں بھئی ہاں۔ ٹھیک ہے۔ چلو کھانا وانا ہو جائے۔'' وقار حسین نے کہا اور وہ کرسی سے اٹھ گئے۔

شمیم واپس مڑ کر پڑی میں چلی گئی۔ سلیم نے کرسیاں اٹھا کر دروازے کے پیچھے رکھ دیں۔ عارفہ کی ضد تھی پہلے عبدالعزیز اس کے بنائے ہوئے کھانوں میں سے کچھ کھائے ورنہ وہ گھر کے اندر نہیں آئے گی۔ عبدالعزیز نے پلاسٹک کے برتنوں میں سے جھوٹ موٹ کا کھانا کھایا۔ عارفہ کو بہت اچھا لگا۔ اس نے پوچھا۔ ''کھانا کیسا لگا۔''

''بہت اچھا بہت اچھا۔۔۔ نمک تھوڑا زیادہ تھا۔'' عبدالعزیز نے اس کے کھانے کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''نیا نمک ہے نا؟ اس لئے حساب نہیں رہا۔'' عارفہ نے فوراً کہا۔ عبدالعزیز اسے تکتا رہ گیا۔ بچے جو سنتے ہیں اس کا کتنا خوبصورت استعمال وہ کر سکتے ہیں اس کا بہترین نمونہ عارفہ کا یہ جواب تھا۔ اس نے عارفہ کو گود میں اٹھایا، اور پڑی میں چلا آیا۔ اس کے ہاتھ دھوئے اور کھانے کی چٹائی پر اسے اپنے ساتھ لیے بیٹھ گیا۔ دونوں نے ایک ہی پلیٹ میں کھانا شروع کیا۔

حمید حسین نے اس منظر کو دیکھا تو ان کی آنکھوں میں ماضی کے بہت سارے یادگار موسم لوٹ آئے۔ انہوں نے محبت بھری نظروں سے وقار حسین کے چہرے کو دیکھا۔ جو نظریں جھکائے چاول کی روٹی کے ٹکڑے کر رہے تھے۔ شاید وقار حسین اس بات کو محسوس کر چکے تھے۔ اس لئے بہت دیر تک انہوں نے نظریں نہیں اٹھائیں۔ انھیں احساس تھا اگر حمید کی نظریں ان کی نظروں سے ملیں گی تو دیدوں کے اس پار ٹھہرے ہوئے آنسو چھلک پڑیں گے۔ جب حمید چھوٹا تھا تو اسی طرح ایک ہی پلیٹ میں وہ

کھانا کھاتے تھے۔

وقار حسین آہستہ آہستہ کھایا کرتے تھے، تاکہ حمید کو کسی شئے کی کمی کا احساس نہ ہو۔

❦

تلی ہوئی لذیذ مچھلیاں، چٹنی، چاول کی روٹیاں، گھر کے پاپڑ، آم کا آچار اور پتلا سالن جس میں کوکن کی کھٹاس ہو تو کوئی کسی سے بات کرنے میں وقت کیوں ضائع کرے۔ سب کھانے میں مشغول ہو گئے۔

﴿۸﴾

کھانے کے بعد کچھ دیر عبدالعزیز آنگن میں چالیس واٹ کے بلب کی روشنی میں عارفہ اور سلیم کے ساتھ اس کی پڑھائی کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ دونوں گانو کی پرائیوٹ پرائمری اردو اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ عبدالعزیز نے جب ان سے کہا کہ مجھے کوتیائیں سناؤ۔ تو دونوں لمحے بھر کو چپ رہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ''کوتیا مطلب کیا؟ مہرون اور شمیم بھی پاس ہی بیٹھے تھے۔ شمیم نے سلیم سے کہا۔ ''چاچا کہہ رہے ہیں نظمیں سناؤ۔''

''دھت تیری کی، تو پھر کوتیائیں کیوں بولے؟ سلیم نے اپنی ذہانت کو چمکانے کے لئے ڈرامائی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے آگے کہا۔ ''نظمیں تو مجھے بہت یاد ہیں۔''

عارفہ اسے رشک بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی جسے ''لب پہ آتی ہے دُعا'' اور سارے جہاں سے اچھا'' کے صرف چند اشعار یاد تھے۔ عبدالعزیز خاموش تھا۔ اسے گمان نہ تھا کہ لفظ ''کویتا'' اتنی جلد پرایا ہو جائے گا۔ سلیم دونوں ہاتھ سینے کے پاس

باندھے گویا نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہوا اور ایک نظم شروع کی:

کیا امیوں نے جہاں میں اجالا ہوا جس سے اسلام کا بول بالا
بتوں کو عرب اور عجم سے نکالا ہر ایک ڈوبتی ناؤ کو جا سنبھالا
زمانہ میں پھیلائی توحید مطلق لگی آنے گھر گھر سے آواز حق حق
لیے علم وفن ان سے نصرانیوں نے کیا کسب اخلاق رومانیوں نے
ادب ان سے سیکھا صفہانیوں نے کہا بڑھ کے لبیک یزدانیوں نے
ہر ایک دل سے رشتہ جہالت کا توڑا
کوئی گھر نہ دنیا میں تاریک چھوڑا

﴿۹﴾

نظم جتنی اسے اسکول میں رٹائی گئی تھی اس نے طوطے کی طرح پڑھی۔ یقیناً بعض الفاظ کا تلفّظ درست نہیں تھا۔ اہل کوکن کے لئے اردو تلفّظ اتنا ہی اجنبی ہے جتنا عربوں کے لئے ہندی۔ اس کا سبب جغرافیہ اور مقامی زبان کی تہذیب کے ساتھ فطری طور پر آواز کی پِچّ کی ہم آہنگی ہے...... اہل کوکن مراٹھی آوازوں سے فطری طور پر قریب ہیں۔ اردو کے تلفّظ کا ان کی زبان کی ساخت کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے۔ جس طرح اردو علاقوں کے لوگ مراٹھی تلفّظ درست ادا نہیں کر سکتے بالکل اسی طرح اہل کوکن اردو تلفّظ کے ساتھ اہل اردو کسی طرح انصاف نہیں کر سکتے۔ بعد میں عبدالعزیز جب سلیم کے اردو معلم سے ملنے گیا اور ان کے ساتھ زبان اور ثقافت کے موضوعات پر گفتگو ہوئی تب اسے پتہ چلا کہ اہل اردو زبان کے معاملے میں کس قدر جذباتی اور متعصب ہیں۔ ’’نفیس زبان کی تہذیب کا مطلب علوم لسانیات کا شعور رکھنا نہیں ہوتا۔‘‘ ادونیس کا یہ جملہ اس وقت اسے بہت یاد آیا جب سلیم کے معلم نے کہا۔

''جو اردو تلفظ صحیح ادا نہیں کرتے ان کا ہمارے یہاں مذاق اڑایا جاتا ہے۔'' یہ جملہ لسانی انتہا پسندی کی مثال تھا۔ عبدالعزیز نے معلم کو سمجھانے کی کوشش کی تلفظ کا رشتہ جغرافیائی اثرات اور مقامی زبان کی آوازوں پر مشتمل ہوتا ہے......اس لئے دنیا میں کوئی فرد دوسری زبان کو لکھ پڑھ تو آسانی سے سکتا ہے مگر اس کی تمام آوازوں کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتا۔ مثال کے طور پر اس نے بتایا کہ ہندوستان کے لوگ ساری زندگی بھی مشق کریں تو عربوں کے حروف۔ ذ۔ ظ۔ض کے درمیان جو مہین فرق ہے اس کی ادائیگی میں مہارت حاصل نہیں کر سکتے۔ اردو معلم مالیگاوں کا رہنے والا تھا۔ جس کی تعلیم وتربیت اردو میں ہوئی تھی۔ اس کے تعلق سے یہ بات بھی مشہور تھی کہ وہ شاعر بھی ہے۔ جو بات بات میں لوگوں کو شعر سناتا ہے۔ اردو زبان کی تاریخ، اسالیب اور قواعد سے ناواقف گانو والوں کے نزدیک وہ اردو کا بہت بڑا پنڈت بن گیا تھا۔ یہ حال کوکن کے بیشتر گانوؤں میں باہر سے درآمد اردو معلموں کا تھا۔ جنھوں نے اپنی ملازمت کی خاطر اردو کو مسلمانوں سے جذباتی طور پر جوڑنے میں بہت منفی رول ادا کیا۔ انتہائی خراب درجے کا لسانی نمونہ، اردو کے نام پر عوام میں پیش کیا۔ لگ بھگ اسیّ فیصد اردو معلمین ایسے تھے جو اہل زبان تھے ہی نہیں بلکہ مہاراشٹرا ہی کے چھوٹے چھوٹے غریب قصبوں سے آئے ہوئے محروم افراد تھے۔ جن کی اردو قواعد اس حد تک خراب تھی کہ انھیں ''ہے'' اور ''ہیں'' کا شعور کبھی نہ ہوسکا۔ نہ تحریر میں نہ گفتگو میں۔ یہ کوڑا کرکٹ تھا جس سے اہل کوکن نے دنیا کی ایک خوبصورت زبان کو سیکھنے کی پہل کی مگر ثقافتی اور لسانی سطح پر ناکامیاب ہوگئے۔ کوکن میں ایسے بھی کئی گانو تھے جہاں اردو مدارس آزادی سے پہلے ہی کھل گئے تھے باوجود اس کے اردو تلفظ ادائیگی اور زبان کو وہ راہ نہ مل سکی جس سے تخلیقی فکر کے اظہار کا وہ وسیلہ بن پاتی۔ وہ لوگ جو کوکن سے تعلق رکھتے ہیں لیکن بمبئی میں قیام پذیر تھے یا تعلیم حاصل کرنے کے بعد بمبئی جاکر برسوں

مشق کرتے رہے ان کی مثال اس ضمن میں کمزور ہے۔ لیکن محض مکالمے کے لئے اگر اس بحث میں انھیں بھی شامل کرلیا جائے تب بھی یہ دیکھ کر افسوس ہی ہوگا کہ ستّر، اسّی برسوں کے ابتدائی عرصے میں کوکن سے ایک بھی سنجیدہ اور صف اول کا تخلیقی فنکار پیدا نہ ہوسکا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا زبان صرف شاعر پیدا کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ زبان کی کامیابی کیا صرف اس بات میں ہے کہ کتنے لوگ اس میں ادب لکھتے ہیں؟ قوموں کو ادب زوال سے بچاتی ہے یا معاشیت؟ عبدالعزیز جب اس معلم سے مل کر لوٹ رہا تھا تب املی کے پیڑ کے نیچے سے گزرتے ہوئے یہ سوالات اس کے ذہن میں آئے۔

❦

شگفتہ چاہتی تھی کہ وہ ان سوالوں کا جواب دے کہ ''زبان افراد کے خیالات کی ترسیل کے لئے ہے، سماج میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے ہے، علوم انسانی کو آگے بڑھانے کے لئے ہے۔ معاشرت کے میدان میں ترقی کی راہیں ہموار کرنے کے لئے ہے۔ ایسی زبان میں تعلیم حاصل کرنا خودکشی ہے جو آپ کو روزگار عطا نہ کرسکے، آپ کی غربت میں اضافہ کرے اور جس زبان میں آپ خواب نہ دیکھتے ہوں۔ جس زبان میں گفتگو کرتے ہوئے آپ ہمیشہ احساس کمتری کا شکار ہوں۔ جو دوسروں کی زبان ہو اور اس میں لغزشوں پر آپ کا مذاق اڑایا جائے۔ ایسی زبان میں سوچنا بھی کفر انسانیت ہے جس کی رگوں میں مذہبی سیاست اور منافرت کا زہر پوری طرح سے بھر دیا گیا ہو، جہاں اظہار خیال کے دروازوں پر حلال اور حرام کی تلواریں بچھادی گئی ہوں۔۔۔ جس کی کتابوں میں محبت کو ''جرم'' اور زندگی کو ''قید'' قرار دیا گیا ہو۔ جہاں اختلاف رائے کو ممنوع قرار دیا گیا ہو۔۔'' لیکن انسانی روح کی آواز بدن والوں تک نہیں پہنچتی۔ یہ بات اسے معلوم تھی۔ اس لیے وہ خاموش رہی۔

انسان کے علاوہ ہر مخلوق شگفتہ کی آواز کو سن سکتی ہے۔

زمین پر انسان نے الفاظ ایجاد کرنے کے بعد فطرت سے علیحدگی کا اعلان کر دیا تھا اس لئے فطرت کے دوسرے مظاہر سے رفتہ رفتہ وہ کٹ گیا۔ بعد میں خلیج بہت گہری ہوگئی۔ انسان قدیم سمعی توانائی سے محروم ہوگیا۔ اس لئے حشرات، جانور، درخت ، ہوا، ندی، سمندر اور موسم بھی اس سے بیگانے ہوگئے۔ اب جب کبھی صدیوں میں ایک بار کسی انسان کی قدیم الفطرت یادداشت جاگتی ہے اور وہ ان اشارات فطرت کو سننے کی کوشش کرتا ہے تو افسردہ ہو جاتا ہے اور سب سے بڑا خسارہ آوازوں کی سیاست ہے جسے سہارا بنا کر انسانوں میں تفریق کی جاتی ہے۔ ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔

شگفتہ نے یہ راز بھی عبدالعزیز کو اس روز بتانا چاہا تھا۔ وہ جانتی تھی سلیم کے اردو معلم سے مل کر عبدالعزیز بہت مایوس ہوا ہے۔ خاص کر جب معلم نے کہا۔ ''اردو کے بغیر مسلمان ادھورا ہے...... دین کی تعلیم آپ کیسے حاصل کریں گے؟'' مایوسی کے ساتھ لوٹتے ہوئے عبدالعزیز نے صرف اس سے یہ پوچھا تھا۔ ''دین کی تعلیم رسول نے اردو میں دی تھی کیا؟''

''نہیں جی...... کیسی بات کرتے ہو، رسول نے عربی زبان میں دی تھی نا!''

''اور یہ بتاؤ سری لنکا اور بنگلہ دیش کے مسلمان ادھورے ہیں کیا؟'' عبدالعزیز کی مایوسی میں میں اضافہ ہوگیا تھا۔

''نہیں جی...... وہاں کا کچھ معلوم نہیں ......'' معلم نے لجلجے لہجے میں جواب دیا تھا۔

''اگر معلوم ہوتا تو یہ نہ کہتے کہ اردو کے بغیر مسلمان ادھورا ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ اسکول کے احاطے سے باہر نکل گیا تھا۔

﴿۱۰﴾
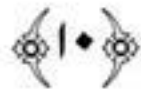
سلیم نے نظم ختم کی مہرون اور شمیم نے زوردار تالیاں بجائیں۔ سلیم کا سینہ پھول گیا۔ عارفہ نے سر کے بال کھجائے اور اس سے پہلے کہ عبدالعزیز نظم پر اپنے تاثرات دیتا اس نے ہاتھ باندھے اور کہا۔ ''میری نظم سنو مجھے یاد ہے۔'' تتلی آواز میں اس نے بلند خوانی شروع کی ......

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری

عبدالعزیز کو یہ نظم پسند آئی اس نے اسے گود میں اٹھالیا۔ چند منٹوں میں عارفہ کی آنکھ لگ گئی۔ سلیم مہرون کے پیروں پر سر رکھے ان کی باتیں سنتا رہا۔ نینداس کی پلکوں پر آٹھہری تھی مگر بہ جبر وہ سننے کی کوشش کرتا رہا۔ چند ہوا کے ٹھنڈے جھونکے آئے اس کی پلکوں کو بند کر گئے۔

﴿۱۱﴾

عبدالعزیز نے دونوں سوٹ کیس کی چابیاں حمید حسین اور شمیم کے ہاتھوں میں دے کر کہا۔ ''سب آپ کے لئے ہے؟'' مہرون کا چہرہ کھل گیا تھا۔ اس نے شمیم سے کہا۔ ''تیرے ہی ہاتھوں سے کھول ......دیکھیں کیا کیا لایا ہے؟''

شمیم، مہرون کی جانب دیکھ کر مسکرائی اور فوراً چابیاں وقار حسین کی جانب بڑھا کر کہا: ''آپ''

''آپ''

بالآخر وقار حسیں نے چابیاں اپنے ہاتھوں میں لیں۔

باب ششم

سنا نہیں جو کسی نے ہوا کا نوحہ تھا

''جو آدمی مرتد ہو جائے اس کا قتل واجب ہے۔'' یوسف نے عبدالعزیز کے سینے سے خنجر نکالتے ہوئے کہا۔

گانو کی پرائمری اسکول سے پانچویں جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد مجاور حسین نے امام کے مشورے پر عمل کیا اور رائے گڑھ کے ایک چھوٹے سے مدرسے میں حفظ کے لئے یوسف کو داخل کر دیا۔

یوسف اپنے ساتھ ایک وصف لے کر پیدا ہوا تھا جو لاکھوں کروڑوں انسانوں میں ایک یا دو کو نصیب ہوتا ہے۔

اس کا حافظہ اس قدر طاقت ور تھا کہ وہ بس ایک بار جس تحریر کو دیکھتا وہ اس کے ذہن میں محفوظ ہو جاتی۔ وہ جس واقعے ،منظر، چہرے اور نشان کو دیکھتا اس کی یادداشت میں ثبت ہو جاتا۔ یہی سبب تھا کہ ہر جماعت میں وہ اول نمبر سے کامیاب ہوتا گیا۔ اس کی طبیعت میں خاموشی تھی۔ زیادہ بات چیت کرنا اسے پسند نہ تھا۔ نہ وہ کلاس میں سوالات پوچھتا نہ جوابات دینے میں پہل کرتا۔ پہلے پہل تو کلاس میں اسے کند ذہن سمجھا گیا لیکن جب امتحانات تحریری صورت میں لئے جانے لگے تو اساتذہ پریشان ہو گئے۔ یہ ان کی سمجھ سے پرے تھا کہ پوری عبارت من وعن کوئی کس طرح اتار سکتا ہے۔ پرنسپل نے ایک روز مجاور حسین کو بلایا اور پوچھا: ''آپ کا بیٹا کیا دن بھر گھر میں جوابات یاد کرتا رہتا ہے؟''

میرا دماغ اسی لئے خراب ہوتا ہے کہ یہ پڑھتا نہیں ہے دن بھر یہاں وہاں بھٹکتا رہتا ہے' مجاور حسین کو یہ لگا کہ اسے خراب نمبر ملے ہوں گے اس لئے یہ بات انھیں بلا کر پوچھی جارہی ہے۔ انھیں بتایا گیا تھا کہ یوسف زیادہ تر وقت جنگل کی سرحد کے آس پاس دوستوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے جاتا ہے۔ انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کھیلنے کے بجائے بیٹھ کر کھیلنے والوں کو دیکھا کرتا ہے۔ اس کی طبیعت میں مشاہدہ کرنے کا رجحان زیادہ تھا۔ لیکن جب پرنسپل نے یہ راز کھولا کہ یوسف کے نمبر اسکول میں سب سے زیادہ ہیں۔ بعض پرچوں میں سو میں سے سو یا ننانوے۔ تو وہ حیران رہ گئے۔ انھوں نے پرنسپل سے مخاطب ہو کر کہا۔

''جناب آپ سے کوئی غلطی ہوئی ہوگی۔ وہ پرچے کسی اور کے ہوں گے۔ ایک بار واپس سے تپاس لو......''

''ہم نے دس بار پورے پرچے چیک کئے ہیں۔ اور سارے ٹیچروں کی میٹنگ بھی لی ہے، سب حیران ہیں کیوں کہ وہ کلاس میں کبھی سوالوں کے جواب نہیں دیتا تھا۔''

''کہیں اس نے نقل تو نہیں کی۔......''

''اس طرح نقل کرنا ناممکن ہے، لیکن پھر بھی ہم چاہتے ہیں کہ اس کا ایک بار اور امتحان لے کر دیکھیں۔'' پرنسپل نے کہا۔

''جیسی آپ کی مرضی جناب، کل اسے بھیجتا ہوں......'

﴿۳﴾

سارے پرچے اسی آرڈر میں دوبارہ لئے گئے۔ کلاس میں تین معلمین نگراں رکھے گئے۔ پرنسپل نے خود کئی بار اس کمرے کا چکر لگایا جہاں وہ پرچہ لکھ رہا تھا۔ سارے پرچے ختم ہوئے تو دوبارہ مجاور حسین کو اسکول میں بلایا گیا۔ اس بار پرنسپل کے کمرے میں اسکول کے تمام ٹیچرس کی موجودگی میں پرنسپل نے اس کے پرچے مجاور حسین کے سامنے رکھے اور کہا۔ ''یہ اللہ کا کرشمہ ہے،۔ ہم نے اپنی زندگی میں اتنا طاقتور حافظہ کسی کا نہیں دیکھا۔'' ایک جلگاؤں کے ٹیچر جو حساب پڑھاتے تھے، انھوں نے کہا۔ ''آگے چل کر جب یہ بورڈ کا امتحان دیگا تو اسکول کا نام پوری ریاست میں روشن ہوگا۔''

''ہاؤ......' شولاپور کی ایک استانی نے ہاں میں ہاں ملائی۔

مجاور حسین کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح کھل گیا۔ انھوں نے بہت دیر تک اساتذہ سے بات چیت کی۔ اس کے بعد وہ سیدھے مسجد گئے اور وہاں وضو کر کے انھوں نے شکرانہ کی دو رکعت نماز ادا کی۔ ان کا جی بھر آیا تھا۔ آنسو تھمنے کا نام نہ لیتے تھے۔ اللہ کے حضور میں انھوں نے دعا کی: ''اے میرے رب! تو نے مجھے اولاد سے نوازا، جب میں پوری طرح سے ناامید ہوگیا تھا۔ اور اب اسے جو یاد کرنے کی طاقت دی ہے وہ تیرا کمال ہے۔ اللہ مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ اور میں اس پر انشاء اللہ ضرور عمل کروں گا۔ اے اللہ مجھ سے اگر کوئی خطا ہوئی تو مجھے معاف کر، تیرا گنہگار بندہ ہوں میرے رب مجھے ایمان پر قائم رکھ (آمین)''

﴿۴﴾

سکینہ سے مجاور حسین کی شادی ان کے لئے کسی خواب کی تعبیر کی طرح تھی۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے دل کی باتیں سکینہ سے کہنے میں ایک طرح کا سکون محسوس کیا تھا۔ شادی کے بعد دو برسوں تک تو انھوں نے اس بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا کہ آخر کیوں سکینہ کی گود اب تک بھری نہیں ہے۔ وہ ہر بات میں خدا کی مصلحت پر ایمان رکھتے تھے۔ پھر عموماً نماز کی ادائیگی کے بعد اولاد کے لئے دعا کرنے لگے۔

ایک روز انھوں نے اپنی دعا میں اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر انھیں فرزند نصیب ہوا تو وہ اسے دین کی تعلیم اور ترویج کے لئے وقف کر دیں گے۔ سکینہ جب بھی ان سے اس معاملے میں گفتگو کرتی تو وہ اندر ہی اندر محرومی اور افسردگی محسوس کرتے۔ وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے کہ ان کا یقین اللہ پر ہے اور فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہت جلد اللہ ان پر اپنی نعمت کے دروازے کھول دے گا۔ وہ سکینہ سے اس بات کو چھپانے کی کوشش کرتے کہ وہ خود بھی بہت دکھی ہیں۔ جماعت سے وابستگی کے باوجود انھوں نے سکینہ کے کہنے پر کئی بار پڑوس کے گانوؤں کی مزاروں پر جا کر دعا کی تھی۔ ایک بزرگ ہستی کے مزار پر انھوں نے منّت بھی مانگی تھی۔ اس راز کو انھوں نے سکینہ پر کبھی نہیں کھولا۔

ان کے ایک دوست نے انھیں گجانند نائی کی دواؤں کے فائدے بتائے۔ جسے خود تین برسوں تک اولاد نہیں ہوئی تھی۔ پھر گجانند کی دوا کھانے کے تین مہینے بعد ان کی اہلیہ کو حمل ٹھہر گیا تھا۔ مجاور حسین کے لئے یہ دشوار تھا۔ انھوں نے امام صاحب کی دی ہوئی تعویزوں کو پانی میں ڈبو کر پینے کو ترجیح دی۔ سال ڈیڑھ سال تک اس نسخے کو اپنائے رہے۔ بالآخر ایک روز ان کی صبر کا پل ٹوٹ گیا اور وہ گجانند نائی کی دکان پر پہنچ گئے۔ گجانند نے انھیں شام ڈھلے اپنے گانو سے باہر کے چوراہے پر بلایا۔ وہاں انھوں

نے اسے پوری تفصیل سنائی۔ گجانند نے کچھ سوالات پوچھے اور مسکرا کر کہا فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔ آپ ایک ہفتے بعد ملئے۔

اسی ہفتے حمید حسین کی شادی تھی۔ اس رات انھیں گھر واپسی میں بہت دیر ہونے والی تھی اس لئے انھوں نے سکینہ سے کہا تھا کہ بہتر ہے وہ وقار حسین کے گھر ہی قیام کرے۔ چند روز قبل ہی ان کی والدہ سے سکینہ کی تو تو میں میں ہوئی تھی جس کے سبب دونوں کی بات چیت بند تھی۔ مجاور حسین نہیں چاہتے تھے کہ ان کی غیر موجودگی میں پھر کوئی بات ایسی ہو کہ ان کی والدہ سکینہ کو برا بھلا سنانے لگے۔ مجاور حسین کی والدہ یوں بھی اب سکینہ کو چھوٹی موٹی باتوں میں بانجھ پن کا طعنہ دینے لگی تھی۔ جس سے گھر کا ماحول خراب ہو گیا تھا۔

گجانند سے انھوں نے اولاد کی محرومی کو دور کرنے کا علاج شروع کیا یہ بات انھوں نے سکینہ کو نہیں بتائی۔

﴿۵﴾

سکینہ کے دل میں بھی عجیب سا ڈر تھا۔ اس نے بھی تیسرے مہینے میں قدم رکھنے تک یہ بات ان سے پوشیدہ رکھی تھی۔

﴿٦﴾

مجاور حسین سے جب سکینہ نے حمل ٹھہرنے کی بات کہی تھی اس وقت ان کی دونوں آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ انھوں نے اس کی پیشانی پر بوسہ لیا تھا اور فوراً شکرانہ کی نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے تھے۔ انھیں محو عبادت دیکھ کر سکینہ کے چہرے پر ایک مبہم مسکراہٹ پھیلی تھی۔ نماز بعد وہ دوبارہ اس کے ساتھ بیٹھ کر بہت ساری باتیں کرتے رہے جس میں اس کے لئے ہدایات بھی تھیں کہ اب وہ کس طرح چیزوں کو اٹھائے، کس طرح چلے، کس طرح کھانے پینے کا خیال رکھے وغیرہ وغیرہ۔ اس دوران سکینہ کے چہرے پر

وہ مسکراہٹ اسی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ مجاور حسین نے اس مسکراہٹ کو اس کی ماں بننے کی خوشی سمجھا۔ پھر انھوں نے الماری سے دوسو روپئے نکالے اور گھر سے باہر چلے گئے۔

سیدھے گجانند نائی کی دکان پر پہنچے۔ اسے ایک طرف لے گئے اور اس کے ہاتھوں میں روپئے رکھے۔ یہ ایک بڑی رقم تھی ایک مشت اتنی بڑی رقم گجانند نائی کو کسی نے نہیں دی تھی۔ دونوں نے کچھ نہ کہا۔ دونوں کے چہرے پر خوشی تھی۔ ٹھیک ایک مہینے بعد گجانند نائی نے اپنا آبائی مکان کرائے پر ایک میمن تاجر کو دیا اور نو دو گیارہ ہو گیا۔ دراصل گجانند نائی کو اپنے نسخوں کی کامیابی پر یقین ہو گیا تھا۔ اس کا خیال تھا اس کاروبار میں اگر جلدی منافع حاصل کرنا ہے تو اسے کسی شہر کا رخ کرنا چاہیے۔ مجاور حسین کی دی گئی رقم کے ساتھ اس نے اپنی جمع کی ہوئی پونجی ملائی تو اسے لگا اب محبت بھرے دل کی شوخی آنکھوں سے اتر کر سکینہ کے پورے بدن میں پھیل گئی۔ الفاظ اس کے اندر چھوئی موئی کے پتوں کی طرح سمٹ گئے تھے۔ لب اس کے ساکت تھے اور دل میں ایک پُراسرار خواہش......وہ چپ رہی۔ اس کی چپ میں ہزار ارادے تھے۔ جنھیں عبدالعزیز پڑھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ ان کے درمیان کے سارے پل وہ عبور کر چکے تھے۔ حالانکہ اب انھیں ایک دوسرے کی قربت کم نصیب تھی۔ گانو میں دو چار گدھ جیسی نظروں والے افراد بھی تھے جن کے بارے میں عام رائے یہ تھی کہ وہ باطن کے تہہ خانوں میں محفوظ عبارتوں کو پڑھنے میں بھی ملکہ رکھتے تھے۔ ان سے بچنا بھی ضروری تھا۔ دوری جہنم تھی اور قرب جنّت ...... چنانچہ جب بھی وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے تب جہنم سمٹ کر جنّت میں معدوم ہو جاتی۔ انھیں ایک دوسرے کو چھوئے بغیر ایسا لگنے لگتا کہ وہ لذت لمس سے سرشار ہیں۔ الفاظ کی ادائیگی کے بغیر انھیں لگتا شدت جذبات کا اظہار ہو چکا ہے۔ سکینہ کھڑکی کی طرف بڑھی۔ باہر موگرے کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ امرود کی شاخ پر ایک سفید کبوتر بیٹھا ہوا تھا۔ آم کے ایک چھوٹے سے پیڑ

پر دو گلہریاں ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔

کھڑکی کے پاس کھڑے رہ کر اس نے کبوتر کو دیکھا۔ کبوتر بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عبدالعزیز نے پوچھا۔ ''کبوتر خوبصورت ہے نا؟ کس کا ہے؟'' سکینہ نے آنکھیں ملاتے ہوئے کہا۔ ''میرا......''

''ارے آپ نے کہاں سے لایا۔'' عبدالعزیز کو لگا واقعی اس نے کہیں سے خریدا ہے۔

''یہ یہیں پر تھا...... یک دن بس میں نے پیار سے اس کے پروں کو چھوا......اور وہ میرا ہو گیا۔''

''پھر تم نے اسے باہر کیوں رکھا ہے۔؟'' عبدالعزیز اس کے اشارے کو سمجھ گیا تھا۔

''میں نے اس سے پیار کیا ہے، اسے قید نہیں۔۔'' سکینہ نے جواب دیا اور پھر کبوتر کی طرف دیکھنے لگی جو گلہریوں کو دوڑتے ہوئے دیکھ کر عجیب سی آواز نکال رہا تھا۔

''کیوں؟'' عبدالعزیز نے پوچھا۔

باہر دیکھتے ہوئے سکینہ نے جواب دیا۔۔۔ ''کیونکہ قید میں محبت مر جاتی ہے۔''

عبدالعزیز کچھ کہنے کے لئے بڑھا ہی تھا کہ یوسف کی آواز آئی۔

''ماں!۔۔۔ بسکٹ کا پڑا کدھر ہے؟''

سکینہ فوراً اس کی جانب بڑھی۔ عبدالعزیز وہیں کھڑا رہا۔ یوسف نے عبدالعزیز کو دیکھا۔ دیکھتے ہی اس نے نظریں ماں کی طرف پھیر لیں۔ وہ دونوں پڑی کی طرف چلے گئے۔ جہاں بسکٹ کے پیکٹ رکھے ہوئے تھے۔

۸

کالج کی تعلیم کے لئے لامحالہ اسے گاؤں چھوڑ کر چپلون میں رہنا پڑا۔ اس وقت اسے

یوسف کی یاد بھی اتنی ہی پریشان کیے رہتی تھی جتنی سکینہ کی۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے جب وہ چند روز کے لئے گاؤں آتا۔ یوسف کے لئے چاکلیٹ اور بسکٹ ضرور لے آتا۔

سکینہ نے ہی اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ تعلیم کا سلسلہ ترک نہیں کرے گا۔ گاؤں سے باہر رہنے کا سیدھا مطلب تھا سکینہ سے دور، اور یہ بات گراں بار تھی۔ اس نے بہت باتیں بنائی تھیں مگر سکینہ نے اس کی ایک نہ سنی تھی۔ وہ چاہتی تھی عبدالعزیز اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ ایک دوپہر جب وہ اس کے والد کے گھر 'کوکم' لینے کے لئے گئے تھے اس وقت تاریک کمرے میں جہاں الفاظ کان کی لو تک آکر فضا میں ساکت ہو جاتے تھے۔ سکینہ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس سے وعدہ تھا کہ ہر تکلیف کو سہہ کر وہ کالج کی تعلیم پوری کرے گا۔

۹

وہ چپلون سے ہفتے بھر کی چھٹی پر اسی لئے آتا تھا کہ سکینہ اس دوران والد کے گھر جانے کا منصوبہ بنا سکے۔ اگر وہ ہر مہینے کالج سے لوٹتا تو اتنے روز چھٹی نہیں کر پاتا۔ پھر سکینہ کو اس بات کا بھی خیال رکھنا ہوتا تھا کہ اس کے والد کی مصروفیت کب اور کتنی ہے۔ ان کا ملازم اور اس کی بیوی کس کام میں جٹے ہوئے ہیں۔ کئی دفعہ تو ایک روز پہلے جا کر اسے چھٹی دے دیتی۔ فخرالدین کو ایسا لگتا چوں کہ انھوں نے بچپن میں اس کی دیکھ بھال کی تھی اس لئے وہ اس قدر چھٹیاں دیتی ہے۔ سکینہ نے یہاں فخرالدین کی بیوی کو کچھ کپڑے اور روپۓ بھی دیے تھے۔ اس کے بچوں کے لئے یوسف کو تحفے میں ملے ہوئے کھلونے بھی دیے تھے۔ دوسری ہی سالگرہ کے بعد یوسف کی دلچسپی کھلونوں میں پوری طرح ختم ہوگئی تھی۔

﴿۱۰﴾

تیسری جماعت میں قدم رکھنے تک یوسف نے مدرسے میں قرآن ختم کر لیا تھا۔ اس کی آواز میں بہت زیادہ مٹھاس تو نہیں تھی البتہ اعراب کے بغیر بھی درست پڑھنے کی اس کی خوبی نے امام صاحب کو مرعوب کیا تھا۔ کلمے اور دعائیں تو پہلے ہی یاد کر چکا تھا۔

﴿۱۱﴾

سکینہ ایک روز اس کے سامنے بلند آواز میں تلاوت کر رہی تھی۔ وہ ایک طرف بیٹھا سنتا رہا۔ جب سکینہ نے قرآن مجید کو چوم کر طاق پر دوبارہ رکھا تو اس نے سکینہ کو بتایا کہ اس کی قرآت میں اصلاح کی ضرورت ہے اور کئی الفاظ کا تلفظ بھی بہت زیادہ خراب ہے۔ سکینہ کے لئے یہ باتیں بڑی حیرانی کا سبب تھیں۔ اس لئے نہیں کہ ان خامیوں کو اس کے سامنے رکھا جا رہا تھا بلکہ جس عمر میں یوسف تھا اس عمر کے بچوں کو اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے اس نے کبھی نہیں سنا تھا۔ اس عمر میں تلفظ اور اعراب کی غلطیوں کے بارے میں سوچنا اسے عجیب سا لگا۔ اس دن سکینہ نے بات ٹالنے کے لئے کہا: ''جب تو تھوڑا اور بڑا ہو جائے گا تب مجھے پڑھنا سکھانا۔''

''جو غلطیاں آپ کر رہی ہیں وہ بتانے کے لئے مجھے بڑا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اب تک کی اپنی زندگی میں سکینہ کسی کی باتوں سے خائف نہیں ہوئی تھی۔ باتوں کو پیچ دے کر سننے والے کو پریشانی میں ڈالنے کا ہنر اسے حاصل ہے۔ وہ ایسے جملے ادا کرنے میں مہارت رکھی تھی جو کثیر المعنی ہوا کرتے تھے۔ کنایوں سے بھرے ہوا کرتے تھے۔ لیکن یوسف کے اس جملے نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کے پہلے یوسف کے ساتھ اس کی باتیں عام موضوعات پر ہوا کرتی تھیں۔ مثلاً کھانے، کپڑے

،شرارتیں، دوست، حساب کتاب اور اسکول......آج وہ یوسف کے اندر کے آدمی کی آواز سن رہی تھی۔

یوسف تو اتنا کہہ کر باہر چلا گیا لیکن سکینہ وہیں ہزار سوالوں کے گرداب میں گھر گئی۔ ماضی، حال اور حال جاری اس کی آنکھوں کے سامنے آویزاں تھا۔ وہ لمحے جن میں اس نے سکون پایا تھا۔ اسے بچھو بن کر ڈسنے لگے۔ وہ خود کو گنہگار سمجھنے لگی۔ اسے خود سے نفرت سی ہوئی۔ اسے اپنے جسم سے عجیب سی آوازیں نکلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ پہلے کبھی اسے اس بات کا احساس نہیں ہوا تھا کہ جو کچھ عبدالعزیز کے ساتھ وہ کر رہی ہے، وہ گناہ ہے۔ اس نے سوچا۔ ''کیسی پٹی بندھی ہوئی تھی میری آنکھوں پر...... میں اندھی ہوگئی تھی۔ میں ندی کے بہاؤ میں بہہ گئی تھی۔ بارش نے میرے تن من کو دھندلا دیا تھا۔ اب میں کیا کروں؟''

وہ سوچتی رہی۔ طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن میں پیدا ہوتے رہے۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ یہاں تک کے بالآخر اس کی آنکھیں منجمد ہوگئیں۔

❦

آنکھیں یہاں بند ہوئیں اور وہاں ایک مہیب خواب میں کھلیں۔ ایک ٹیلے پر وہ برہنہ کھڑی تھی۔ حد نظر سبز، زرد، اور گہرے نیلے رنگ کے سانپ تھے جو اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رفتہ رفتہ اس کے بدن میں عجیب تبدیلی ہوئی۔ اس نے دیکھا اس کا پیٹ ابھر آیا ہے۔ سانپ اس کی طرف تیزی سے بڑھنے لگے۔ اس نے نظریں اوپر کر کے آسمان کو دیکھا۔ سارا آسمان ہلکے نیلے رنگ کی چادر کے علاوہ اور کیا تھا۔ بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہیں تھا۔ سانپوں کے خوف نے اس کی آواز کو اس کے گلے میں ہی دبا دیا تھا۔ آنسو اس کی آنکھوں میں نہ تھے۔

مرنے کے لئے تیار ہو کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ چاہتی تھی جو ہونا ہے

جلدی سے ہو جائے۔ تڑپ تڑپ کر مرنے کی بجائے وہ جھٹ سے موت کی وادی میں جانا چاہتی تھی۔ اس نے دعا کی۔ ''اسے کوئی بڑا سا سانپ نگل لے''

مگر ایسا نہ ہوا۔ وہ انتظار کرتی رہی۔ جب انتظار کی طوالت نے بھی اسے مایوس کیا تو اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں۔ وہ حیران رہ گئی۔ اس نے پاگلوں کی طرح چیخنا شروع کیا۔ اس کی آنکھوں سے خوشی سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس کے سامنے عبدالعزیز کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پھول تھا جو گل نرگس سا دکھائی دیتا تھا پر اس میں چمیلی سے مشابہ لطیف مہک تھی۔

❧

اس کی آنکھ خواب کے اس حصے میں کھل گئی۔ حیرانی اب بھی اس کے چہرے پر لٹک رہی تھی۔ وہ کھڑکی کے پاس گئی۔ باہر گلاب کی شاخ پر چند کلیاں تھیں۔ ایک طرف سدابہار کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ وہ پڑی کے باہر آئی اور پڑوسن کے بیٹے کو بلایا۔ اس ایک روپیہ دیا اور اس سے کہا۔ ''عبدالعزیز کو اکیلے میں ایک طرف لے کر کہنا، میں نے فوراً بلایا ہے۔ ارجنٹ ہے۔''

❧

پھر وہ پڑی میں آئی۔ چولہے پر اس نے چائے کے لئے پانی رکھا۔ اس میں پات ڈالی۔ پانی نے جوش لیا تو چائے پتی ملائی۔ دو کپ نکالے۔ اتنے میں عبدالعزیز بھی پہنچ گیا۔ مئی کا مہینہ تھا۔ سالانہ امتحان ختم ہوئے چند ہفتے ہوئے تھے۔ عبدالعزیز گرمی کی چھٹیاں گزارنے کے لئے گانو آچکا تھا۔

❧

پڑی میں کرسیوں پر وہ بیٹھ کر چائے پیتے رہے۔ اندر ایک کمرے میں اس کی ساس سو رہی تھی۔ چائے پیتے ہوئے اس نے عبدالعزیز کو پہلے اپنا خواب بتایا پھر

یوسف کا وہ جملہ، جس نے اسے بُری طرح سے احساس گناہ میں مبتلا کر دیا تھا۔

عبدالعزیز نے خاموشی سے اس کی ساری باتیں سنی۔ جب وہ چپ ہوگئی تو اس نے کہا۔ ''ہمارے ڈر ہمارے خواب بنتے ہیں۔ لیکن تمہارا خواب یہ بھی بتاتا ہے کہ میں ہمیشہ تمھارے لئے حاضر رہوں گا۔ لیکن کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے میری زندگی لمبی نہیں ہے۔ سکینہ نے مرجھائے ہوئے چہرے سے اسے دیکھا پھر اس نے پوچھا۔ ''مجھے گناہ کا احساس کیوں ہوا؟''

عبدالعزیز کچھ دیر خاموش رہا۔ سکینہ کو ایسا لگا عبدالعزیز کے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے۔ اس لیے اس نے کہا۔ ''گناہ تو گناہ ہے۔ احساس تو ہوگا ہی۔'' عبدالعزیز کو شریفہ پاؤسکر اور اس کے استاد شندے کی یاد آرہی تھی۔ جن کے ساتھ چند ہفتے قبل ہی ''گناہ'' کے موضوع پر ایک طویل گفتگو میں اس نے حصّہ لیا تھا۔ وہ پروفیسر شندے کی دلیلوں سے متاثر تھا۔ جس نے انسانی ذہن کے ارتقاء اور اجتماعی لاشعور جیسے نفسیاتی نکات کے ذریعے ''گناہ'' کو ایک لاشعوری وسوسہ قرار دیا تھا۔ اس نے انتہائی آسان زبان میں ان نظریات کے مفہوم کو سکینہ کو سمجھایا۔ سکینہ کو اس کی باتیں پُرلطف لگیں۔ اسے احساس ہوا کہ واقعی کالج کی تعلیم نے عبدالعزیز کی ذہانت میں اضافہ کیا ہے۔ علمی نوعیت کی باتیں سن کر اسے خوشی محسوس ہوئی۔ پھر وہ بہت دیر تک دوسرے موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ جب عبدالعزیز لوٹنے لگا تو اس نے دوبارہ اس سے کہا۔ ''اب مجھے یوسف کی نظروں سے ہر بات کو پوشیدہ رکھنا ہے۔ تم بھی اس بات کا خیال رکھنا۔'' چند روز بعد انہوں نے یہ طے کیا کہ جب بھی یوسف گھر میں موجود گا عبدالعزیز جلدی لوٹ جائے گا۔

﴿۱۲﴾

جب مجاور حسین نے اپنے فیصلے سے یوسف کو آگاہ کیا وہ بے حد خوش ہوا۔ سکینہ کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ کسی طرح سے یوسف کو اپنے سے دور ہوتے ہوئے دیکھنے کے لئے تیار نہ تھی۔ مجاور حسین نے اسے بہت سمجھایا بالآخر وہ بھی راضی ہوگئی۔ اس کے باوجود اس کے چہرے پر ایک طرح کی اداسی کئی دنوں تک رہی۔ یوسف کے بعد گانو میں گویا بچوں کو اسکول سے نکال کر مدرسوں میں حفظِ قرآن کے لئے بھیجنا ایک طرح کا فیشن بن گیا۔ لوگوں نے اسے اپنے لئے آخرت میں جنّت میں جانے کا ویزا قرار دیا۔ جو بچے تیار نہ ہوتے انھیں مار پیٹ کر، جلی کٹی باتیں سنا کر جبراً بھیجا جاتا۔ اس بات سے اسکول کے پرنسپل اور اساتذہ بہت پریشان تھے۔ انھیں یہ ڈر ستانے لگا کہ اگر اسی رفتار سے لوگوں نے اسکول کی تعلیم کو چھوڑ کر مدرسوں میں جانا شروع کیا تو وہ دن دور نہیں جب بچوں کی تعداد اتنی کم ہو جائے کہ اسکول بند کرنے کی نوبت آجائے۔ یوں بھی اسکول کو صد فی صد گورنمنٹ کی گرانٹ بھی نہیں ملی تھی۔

حفظ کرنا یوسف کا میدان تھا۔ اور پڑھنا وہ سیکھ چکا تھا۔ چنانچہ مدرسے والوں کے لئے اس پر محنت کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے جوش وخروش کو دیکھ کر علماء حیران تھے۔ ایسے زیرک طالب علم سے ان کا سابقہ نہیں ہوا تھا۔ جسے محض چند گھنٹوں میں اتنا کچھ یاد ہو جاتا ہے جتنا یاد کرنے میں دوسروں کو مہینوں لگ جاتے ہیں۔

﴿۱۳﴾
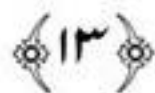
بمبئی، لکھنؤ اور دلّی کے علماء کا ایک وفد مدرسے میں بلایا گیا۔ جنھوں نے یوسف کی اس کرشمائی صفت کا معائنہ کیا اور اس کے لئے علحیدہ نصاب مرّتب کیا۔ ایک سال کے مختصر عرصے میں اسے قرآن حفظ ہو گیا تھا۔ مگر اس کا امتحان نہیں لیا گیا۔ مدرسے نے

سالانہ جلسے میں اس کے والد کو مدعو کیا اور بتایا کہ آئندہ سال یوسف کی تعلیم اور قیام کا خرچ دلّی کی ایک ٹرسٹ ادا کرنے والی ہے۔ مجاور حسین یہ بات سن کر زیادہ خوش نہیں ہوئے کیونکہ جو بچّے غریب ہوتے تھے ان سے یوں بھی مدرسہ فیس نہیں لیتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ فیس ادا کر سکتے ہیں۔ تب مہتمم مدرسہ نے بتایا کہ اس کی خوبیوں سے علماء کا ایک وفد بے حد خوش ہوا ہے۔ یہ ان کا فیصلہ ہے، نہ صرف اس سے کوئی فیس لی جائے گی بلکہ اس کے اخراجات کے لئے اسے ہر مہینے پچس روپئے ملا کریں گے۔

یوسف کی عمر تیرہ سال تھی۔ اس کے باوجود اسے حفظ کرنے والے طلبہ کا معلم بنا دیا گیا۔

عصر بعد اسے ایک گھنٹہ عربی ''صرف ونحو'' کا درس دیا جاتا۔

ایک سال بعد ''فارسی'' زبان کی قوائد اسے پڑھائی گئی۔

اس طرح تین سال گزرے۔ اس دوران مدرسے کے کتب خانے میں موجود اردو، عربی اور فارسی کتابوں کا اس نے مطالعہ کیا۔ مدرسہ بھی اس کی ذہانت کو اپنے لیے استعمال کرنے لگا تھا۔

رمضان کی چھٹی کے بعد دوبارہ مدرسہ شروع ہونے پر مدرسہ کمیٹی نے اس کے والد کو بُلایا اور انھیں بتایا کہ ''اب آپ کے بیٹے کی ''عالم'' کی پڑھائی شروع ہوگی۔ مجاور حسین ہر بات پر اللہ کا شکر ادا کرنے لگے تھے۔

یوں بھی وہ بے حد خوش تھے کہ یوسف نے رمضان میں گانو کی مسجد میں تراویح کی نماز پڑھائی ہے۔ پورا گانوان سے بے حد خوش تھا۔ یوسف ایک مثالی لڑکا بن گیا تھا۔ لوگ اسے اشتیاق اور رشک سے دیکھا کرنے لگے۔ دینی مسائل پر اس سے مشورہ لینے کیلئے لوگ دور دور سے آتے۔ یہ سب دیکھ کر سکینہ تو ڈرسی جاتی تھی۔ بلکہ اب وہ واقعی اپنے بیٹے سے ڈرنے لگی تھی۔ وہ اس کے سامنے بڑے احتیاط سے رہتی۔ وہ

جتنے دن گھر میں رہتا سکینہ کی نیند اُڑی رہتی۔ وہ ہر پل اس کی خدمت میں حاضر رہنے میں اپنی خوشی محسوس کرتی۔

''کیا اس آدمی کے قتل سے دین کے دشمن خاموش ہو جائیں گے۔'' اس کے مدرسے کے ساتھی نے پوچھا۔

یوسف نے اسے صرف اتنا بتایا تھا کہ جس کا صفایا کرنا ہے۔ اس نے ہمارے مذہب، ہماری زبان، ہماری تعلیمات کا کھلے عام مذاق اڑایا ہے۔ اس کی شیطانی زبان پر روک لگانا ہماری مذہبی ذمہ داری ہے۔ چونکہ یوسف کو عالم و مفتی کی سند مل چکی تھی۔ اس لئے اس کی رائے کو فتوے (اردو میں اب اس لفظ کے معنی 'لازمی کام' یا 'فرض دین' بھی لیا جانے لگا ہے۔) کا درجہ حاصل تھا بالخصوص ان نوجوان لڑکوں کے نزدیک جو اس کے طالب علم اور معتقد تھے۔

گھنے جنگل کے درمیانی حصے میں جھاڑیوں کو ہٹاتے ہوئے وہ راستے کی طرف بڑھنے لگے۔

راستہ بہت طویل تھا۔ خاموشی سے ان کے دل منجمد نہ ہوں اس لئے یوسف نے انھیں تفصیل سے بتانا شروع کیا۔

﴿۲﴾

اس کے والدین بہت شریف لوگ ہیں۔ بہت محنت سے انھوں نے اسے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی۔ اس کے بعد کسی رشتے دار کے تعاون سے یہ کویت میں ملازمت کے لئے گیا تھا۔ اسے گانو کے لوگ پہلے بہت چاہتے تھے لیکن جب یہ کویت سے واپس آیا تو اس آدمی کا دماغ خراب ہو گیا۔

میں جب بہت چھوٹا تھا تو یہ اکثر ہمارے گھر آیا کرتا تھا۔ میری والدہ نے اس کے

بچپن میں اس کی تعلیم میں مدد بھی کی تھی۔ وہ اکثر میری والدہ کے چھوٹے موٹے کام کیا کرتا تھا۔ میرے والد بھی اسے بہت پسند کرتے تھے۔

دونوں ساتھی اس نسبت کو سن کر حیران تھے۔

یوسف نے بتایا۔ ''میری والدہ اس پر بہت اعتبار کرتی تھی۔ انھیں کیا پتہ تھا کہ دنیاوی تعلیم حاصل کر کے اس کا دماغ ابلیس کے اشاروں پر کام کرے گا۔ کہتے ہیں وہ تین برسوں تک کویت میں رہا ہے۔ چھٹی پر گاؤں آنے کے بعد مہینے بھر میں اپنے پرانے طرز کے گھر کو توڑ کر اسی جگہ ایک بنگلہ بنوایا۔ اس وقت وہ گاؤں کا خوبصورت بنگلہ تھا۔

ڈھلوان سے اترتے ہوئے یوسف کے دوست کا پیر پھسلا، وہ لڑکھڑایا۔ تینوں ہنسنے لگے۔ یوسف نے کہا۔ کچھ دیر بیٹھ جاتے ہیں۔ دونوں ایک سیاہ پتھر پر بیٹھ گئے۔ ایک نے پوچھا'' پھر کیا ہوا؟''

پھر اچانک ایک دن لوگ یہ جان کر حیران ہو گئے کہ وہ واپس کویت ملازمت کے لئے نہیں جانے والا ہے۔ اس کی کوئی دوست چپلون میں تھی۔ مجھے اس کا نام تو یاد نہیں پر سنا ہے وہ سیاسی ذہنیت رکھتی تھی۔ مذہب بے زار تھی۔ مذہب کو فرسودہ نظام کہتی تھی۔ یہ اس کی باتوں میں بہک گیا۔ اور اس کی طرح معاشرے کو سدھارنے کے لئے ایک ہفتہ واری اخبار میں مضامین لکھنے لگا۔ اس کی سفارش پر ہی اسے بینک میں ملازمت ملی۔ اچھے عہدے پر فائز تھا۔

جو ساتھی پیر پھسلنے کی وجہ سے لڑکھڑایا تھا اس نے یوسف کو لمحے بھر کے لئے چپ دیکھا تو فوراً پوچھا: '' پھر کیا کیا اس نے؟''

کیا نہیں کیا؟ اس نے ایک روز [دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا] یہ واقعہ میرے گاؤں سے مدرسے لوٹنے کے تین مہینے بعد ہوا تھا جس کی رپورٹ مجھے بعد میں امام صاحب نے دی تھی۔ جماعت کا ایک ساتھی بیان کرنے کے بعد لوگوں کی چلّے کے لئے تشکیل

کررہا تھا۔ جب اس سے پوچھا گیا تو اس نے کھڑے ہوکر بہت ہنگامہ کیا۔ وہ ساتھی سہارنپور سے آئے تھے۔ بے چارے فوراً گھبرا کر بیٹھ گئے لیکن اس کمینے نے لوگوں کو ورغلانے کے لئے، فتنہ پیدا کرنے کے لئے جانے کتنی دیر تک بکواس کی۔''

''آخر کہنا کیا تھا سور کا؟'' دوسرے ساتھی نے پوچھا۔

اس کا دماغ خراب تھا۔ اس نے لوگوں سے کہا یہ لوگ ہمیں فرقوں میں بانٹ دیں گے۔ ہمارا کلچر تباہ کردیں گے۔ وہ کلچر لفظ کا بہت استعمال کرتا تھا۔ مجھے تو بعد میں کسی نے بتایا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف سازش کرنے والی پارٹیوں سے جڑا ہوا تھا۔

اس کی حرکت سے ایک بہت بڑا نقصان یہ ہوا کہ جو لوگ اندر ہی اندر جماعت کے خلاف تھے، لیکن منہ کھولنے کی ہمت نہیں کرتے تھے انھوں نے متحد ہوکر الگ مسجد بنا دی۔ جس نے آگے چل کر مدرسے کی صورت اختیار کر لی۔ اس میں بریلوی نظریات کو فروغ دیا جاتا ہے۔

''ایک مچھلی سے کبھی کبھی پورا تالاب گندہ ہوجاتا ہے۔'' اس کے ساتھی نے کہا۔

اس آدمی کے سبب جماعت کی محنت رائیگاں گئی۔ ورنہ بہت پہلے درگاہ کو مسمار کر کے وہاں اسلامی لائبریری تعمیر ہوگئی ہوتی۔ اس نے پمفلٹ تقسیم کر کے لوگوں کو گمراہ کیا۔ پولیس اور انتظامیہ کو خبر کی۔ بریلوی حضرات کو راستہ مل گیا اور وہ بھی درگاہ کے دفاع میں سامنے آگئے۔ رفتہ رفتہ گیارھویں شریف، مولود وغیرہ جیسی برائیاں جو جماعت کی محنت سے مٹنے لگیں تھیں دوبارہ شروع ہوگیئں۔

''تو کیا یہ شخص بریلوی تھا؟۔۔۔'' ساتھی نے پوچھا۔

''نہیں۔۔۔بالکل نہیں۔ یہ مذہبی طور پر کسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔''

''پھر اس نے بریلوی نظریات کے لئے کام کیوں کیا؟'' دوسرے ساتھی نے پوچھا۔

''یہ اس کی منشا نہ تھی۔ مگر اس کے بعض کاموں سے انھیں فائدہ ضرور ہوا۔ بعد میں وہ بھی اس کے خلاف ہو گئے تھے۔''

''کیوں۔۔۔؟'' ساتھی نے پوچھا۔

گانو کی اردو اسکول کے چیرمین بریلوی ہیں۔ ابھی دو سال پہلے انھوں نے اردو میڈیم سے جونیر کالج شروع کرنے کا اعلان کیا تھا۔ آرٹس اور کامرس کے بچوں کے لئے اس سوّر نے اس کی بھی مذمت کی۔ اس کا کہنا تھا کہ اردو کا رشتہ کوکن کی تہذیب سے نہیں ہے۔ اور اس سے مستقبل کی معاشیت کو خطرہ ہے۔

''یعنی سالا......ردو کا دشمن تھا۔''

''بالکل درست......اسی لئے مجھے لگتا تھا کہ وہ دشمنان اسلام سے ملا ہوا ہے۔''

''لیکن اردو سے دشمنی کیوں؟'' دوسرے ساتھی نے پوچھا۔

''مجھے امام صاحب نے وہ مضمون پڑھ کر سنایا تھا جو ایک مراٹھی روزنامے میں شائع ہوا تھا۔''

آدمی ذہین تھا۔ شیطان ذہین لوگوں کی صورت میں ہی تو سامنے آتا ہے۔ اس نے لکھا تھا۔ اردو نے شمالی ہند میں ترقی کی ہے اس کے باوجود اب وہاں اس زبان میں تعلیم حاصل کرنے والے ختم ہو گئے ہیں۔ اس کا بہتان تھا کہ اردو میں مذہبی باتوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہ اردو اخباروں کے بھی سخت خلاف تھا۔ اس کا کہنا تھا اس زبان کی بالادستی کوکنی لوگوں کو ان کی تہذیبی تاریخ سے کاٹ دے گی۔

''میری سمجھ میں نہیں آیا......مطلب کیا کہنا چاہتا تھا۔'' دوسرے ساتھی نے پوچھا۔

''اسے اسلامی تعلیمات کی بالادستی کھٹکتی تھی۔ اسے اردو اخبار کھٹکتے تھے۔ کیونکہ یہ مسلمان بھائیوں کو مذہبی احکامات سے واقف کراتے رہتے ہیں۔ اردو میں اسلامی اقدار کے فروغ کے لئے زور دیا جاتا ہے۔ پہلے بہت سے کافر اور بے دین لوگ اردو

میں لکھتے پڑھتے تھے اور انھوں نے اردو کو کفر کے رنگ میں رنگا دیا تھا مگر یہاں پندرہ بیس برسوں سے وہ شیطانی عناصر ختم ہو رہے ہیں اور اردو خالص دینی و اسلامی زبان بن رہی۔ اس بات سے وہ نالاں تھا۔''

''تہذیبی تاریخ کا مطلب کیا ہے؟'' اس ساتھی نے پوچھا، جس کے دماغ کی سوئی شاید چند منٹوں سے وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ یوسف نے ایک اکھڑی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی اور پھر کہا۔ ''میں نے اسے مرتدیوں ہی نہیں قرار دیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ اس کے ایسے ہی خیالات تھے۔ جب ہم نے باقاعدہ گاؤں کی مسجد سے لگ کر مدرسے کی بنیاد رکھی اور وقتاً فوقتاً لوگوں کے پوچھنے پر غیر شرعی حرکات کے خلاف فتوے دینے شروع کیے تو اس آدمی نے میرے خلاف مہم چھیڑ دی۔''

''اس کے اپنے بچے وچے نہیں ہیں کیا؟'' شاید یہ سوال بہت دیر سے پوچھنے والے کے دل میں تھا۔ اس لئے یکا یک اس نے پوچھا۔

''نہیں، اس نے شادی نہیں کی......''

''کون ایسے بے دین کو اپنی لڑکی دیتا......'' دوسرے ساتھی نے کہا۔

''نہیں بات ایسی نہیں تھی، میری والدہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کسی سے محبت کرتا تھا۔''

''تو پھر کیا اس کی لیلی کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔'' ساتھی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں ماں نے بتایا تھا کہ وہ عورت چپلون میں رہتی ہے اور وہ بھی اسے چاہتی ہے۔''

''مطلب شادی شدہ؟''

''ہاں!'' یوسف نے کہا۔

''پھر تو اچھا ہوا اس زانی کا قتل ہم نے کیا۔ ہمیں ثواب ملے گا۔'' ساتھی نے کہا۔ اس جملے میں کسی اہم مذہبی فریضے کی ادائیگی سے پیدا ہونے والی فطری خوشی کا احساس بھی جھلک رہا تھا۔

آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ اب یوسف اس کے دل کے ایک گوشے میں ڈر نے منہ کھولنا شروع کیا تھا۔ اسے رہ رہ کر یہ بات یاد آ رہی تھی کہ ایک آدمی کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہوتا ہے۔

''بے دین آدمی کبھی وفادار ہو سکتا ہے؟ اس نے اس عورت کو بھی دھوکا دیا ہوگا۔ ؟'' دوسرے ساتھی نے کہا۔

''ایسے کافر لوگ اپنے شیطانی عقائد کے ساتھ وفادار رہتے ہیں، ابو جہل کو بھول گئے؟'' ساتھی مسکرایا۔

''وفادار اپنے عقائد سے حضور کے چچا بھی رہے۔ ہے نا؟'' پھر اس نے کہا۔

''ہاں! رسول اقدس ﷺ نے بہت کوشش کی مگر وہ پرانے عقائد سے آخری دم تک جڑے رہے۔''

''یہ سوّر کن عقائد سے جڑا تھا۔'' ساتھی نے پوچھا۔

یوسف کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا اور کہا ''چلیے ۔۔ ۔ گاؤں کی سرحد تک جاتے جاتے اندھیرا ہو جائے گا۔ باقی باتیں میں تمھیں چلتے ہوئے بتاتا ہوں۔ اب تم لوگ سیدھے ایس۔ ٹی اسٹینڈ پر چلے جانا۔ میں تمھارا سامان اگلے ہفتے اپنے ایک ساتھی کے ذریعے پہنچا دوں گا۔

باب ہفتم

وہ نیلی جھیل تھی یا آسماں کا ٹکڑا تھا

یوسف خوش نصیب تھا۔ اسے مدرسے سے نکلنے کے بعد اپنے مذہبی علم کو گلی کوچوں، مسجدوں اور خانقاہوں اور میں چند روپیوں کی خاطر بیچنا نہیں پڑا۔ اس کے والد نے مسجد سے لگی زمین پر دینی مدرسے کی بنیاد رکھی۔ گانو کی مسجد کمیٹی نے خلیجی ممالک میں ملازمت کرنے والے افراد کو اس بات کی اطلاع دی اور ان سے بھی مالی تعاون کی درخواست کی۔ چند مہینوں میں اتنا روپیہ جمع ہو گیا کہ دو منزلہ عمارت تعمیر ہوگئی۔ جس میں قیام اور کھانے کا اہتمام بھی کیا گیا۔

یوسف نے اپنے سابقہ مدرسے سے دو معلمین درس و تدریس کے لئے مقرر کیے گئے۔ یوسف کے دو شاگرد، جو چالیس کلو میٹر دور ایک گانو کے رہنے والے تھے۔ انھیں انتظامی کاموں کے لئے مقرر کیا گیا۔

اب گانو کے بیش تر گھر معاشی طور پر خوشحال ہو گئے تھے۔ ہر گھر سے ایک خاص رقم مدرسے کے لئے مقرر کی گئی۔ بچوں کی فیس کے ساتھ ساتھ خلیجی ممالک سے عطیات آنے لگے مدرسہ دیکھتے ہی دیکھتے مقبول ہو گیا۔ دوسرے ہی سال طلبہ کی تعداد اتنی ہوگئی کہ مزید چار کمرے تعمیر کرنے پڑے۔ لوگوں کو اپنے بچوں کو مدرسے میں داخل کرنے کے لئے کئی روز مدرسے کے چکر لگانے پڑتے۔ مدرسے کی تاسیس کی تاریخ ایک سنگ مرمر پر چھ دسمبر ۱۹۹۲ تحریر ہے۔

یوسف کو قبل از وقت مفتی کی سند ملی۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اتنے کم عرصے میں یہ مرتبہ پانے والا وہ پہلا شخص تھا۔ اس کی قدر و منزلت مدرسے کے طلبہ اور اساتذہ میں یکساں تھی۔ اس کے جاننے پہچاننے والے حضرات کی فہرست بہت طویل تھی۔ اس کی یادداشت سے اس کے معلّمین بھی ایک طرح کی احساس کمتری میں گرفتار ہو گئے تھے۔ نتیجتاً اس کی مدح سرائی بہت زیادہ ہونے لگی۔

جب تک وہ گانو میں تھا اس کے مزاج کی خاموشی اسے گھیرے ہوئے تھی۔ اسے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ یاد کرنے کی جو صفت اس کے اندر ہے وہ کوئی اہم چیز ہے۔ اسے تو بعض اوقات ایسا لگتا تھا کہ ہر اسکول میں ایک لڑکا اس کی طرح ہوگا۔ چنانچہ اس نے اس بات پر کبھی زیادہ دھیان نہیں دیا۔ لیکن جب اسے مدرسے میں حفظ قرآن کے لئے داخل کیا گیا اس وقت اسے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ جس طرح اور جس رفتار سے وہ پڑھی ہوئی عبارت کو دوبارہ بغیر دیکھے ذہن میں اجاگر کر سکتا ہے۔ دوسرا کوئی نہیں کر سکتا۔

اس کے ساتھ قریب ایک سو پچاس بچوں نے مدرسے میں داخلہ لیا تھا۔ مگر وہ سب گھنٹوں بیٹھ کر ہزاروں بار ایک ایک سطر کی بلند خوانی کیا کرتے تھے۔ قریباً چار سو طالب

علم پہلے ہی مدرسے میں حفظِ قرآن کے لئے داخل تھے۔ جن میں بعض کئی برسوں سے متواتر قرآن کی آیات کو یاد کرنے میں دن رات مشغول تھے۔ ان کے دماغ کی فائلوں میں قرآن پھر بھی محفوظ نہیں ہو پایا تھا۔

ان کی مشق کو دیکھنے کے بعد یوسف کو احساس ہوا کہ اس کی صلاحیت عام نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اپنی ہی محبت میں گرفتار ہونے لگا۔ اب وہ یہ چاہتا تھا کہ سب اس کی برتری کا اقرار کریں اور اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں۔ آگے چل کر ایسا ہی ہوا۔ اس کی یادداشت کا راز کھلتے ہی پورا مدرسہ اس کی اجارہ داری میں آ گیا۔ اس کے معلمین نے اسے اللہ کی طرف سے تحفہ قرار دیا۔

یوسف کو ''صرف ونحو'' کی پوری کتاب چند ہفتوں میں یاد ہو گئی تھی۔ مگر قواعد کو یاد کرنے سے زبان میں مہارت حاصل نہیں ہوتی۔ یہاں اسے اس بات کا احساس ہوا کہ ''یاد'' ایک چیز ہے اور ''فہم'' دوسری۔۔۔ یاد اور فہم کے علاوہ ایک اور چیز ہے ''ادراک''، جس کا اسے کبھی شعور نہ ہو سکا۔ اصولوں کے اطلاق میں مہارت حاصل کرنے میں اس نے خود کو پوری سنجیدگی سے جھونک دیا۔ اسے یہ ڈر ستانے لگا کہ اگر یہ بات کھل جائے کہ اسے یاد سب ہوتا ہے مگر وہ دوسری صورتوں میں اطلاق نہیں کر سکتا تو اس کی اہمیت کم ہو جائے گی۔

اس نے زبانوں کے اصولوں کو سمجھنے کے لئے کتابیں پڑھنا شروع کیا۔ اردو کی کتابیں لائبریری میں زیادہ تھیں اس نے ان میں سے چنندہ کتابیں پڑھیں، فارسی کتابوں کو بار بار پڑھتا رہا۔ ان میں جو نئے الفاظ آتے۔ انھیں ایک علیحدہ بیاض میں درج کرتا۔ ان کے معنی لغت میں سے لکھتا اور یاد کرتا۔ پھر مشکل عبارتوں کی تشریح کرتا۔ بعض شاعروں کے دیوان پڑھے۔ جہاں اسے ایسا لگتا کہ وہ شعر میں کی گئی بات کو سمجھ نہیں پا رہا ہے تو کسی سے اس کا ذکر نہیں کرتا بلکہ اپنے طور پر شعر کو عبارت میں

تبدیل کرتا اور جو معنی اخذ ہوتے اس کو حتمی معنی سمجھتا۔ یہ اس کی بہت بڑی خامی تھی۔ اسی سبب معنی کی تعبیر کی خوبی اس میں پیدا نہ ہوئی نتیجتاً ''ادراک اور شعور'' کے لئے اس کا ذہن پختہ نہ ہوا۔

تین سال کے عرصے میں اس نے عربی اور فارسی میں مہارت حاصل کرلی۔ اس کے معلمّین اب اس سے زبان کے معاملے میں پیچھے رہ گئے تھے۔ اسی لئے فقہ، مسلک، احادیث اور قرآن کے متن کی تفہیم کے مسائل سمجھاتے ہوئے وہ اس کے سامنے ہڑبڑا جاتے۔ اسے، احادیث کی ضخیم کتابوں سے...... صفحے نمبر کے ساتھ حدیث کو بیان کرنے میں جو ملکہ تھا، وہ قابل رشک تھا۔

اس کی ستائش اس قدر ہوئی کہ اس کی خود سے محبت نرگسیت میں بدل گئی۔ اس اندھی محبت میں وہ دن رات جینے کا عادی ہوگیا۔ قسمت نے کروٹ لی اور وہ مدرسے کا منتظم اعلی بن گیا۔ لوگ اس سے شرعی، دینی، خانگی، سماجی، سیاسی مسائل پر اس کے خیالات جاننے کے لئے دور دراز سے آنے لگے۔ اس نے اپنے بعض احکامات کو فتوے قرار دینا شروع کیا۔ اس کے شاگردوں نے یہ بات بھی اڑادی کہ جو ان احکامات کی خلاف ورزی کرے گا وہ اللہ اور اس کے رسول کا دشمن ہوگا۔

یوسف کی باتیں لوگ سرآنکھوں پر رکھنے لگے۔ جب اسے احساس ہوا کہ اس کے فرمودات کا اثر کتنا ہے تو اس میں خوشی کی ایک ترنگ جاگی اور اس کے نشے میں وہ چور چور ہوگیا۔ سارا گانو اس کا معتقد تھا۔ سوائے عبدالعزیز اور اس کے دوست رفیق ونو کے۔ ۔ ۔ رفیق ونو کھل کر یوسف کے احکامات اور فتوؤں پر کچھ نہیں کہتا۔ عبدالعزیز کے ساتھ رہتا اور اس کی باتوں کو دوسروں تک پہنچاتا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ یوسف کو عبدالعزیز کھٹکنے لگا۔ اسے ایسا لگتا تھا یہ آدمی اس کے اقتدار، اس کے مرتبے ،اس کی صفات، اس کی یادداشت، اس کی تعلیم اور اس کے وقار کو چیلنج کرتا ہے۔ اسے

عبدالعزیز سے نفرت ہوگئی۔

یوسف نے مدرسے کی تاسیس کے بعد وقتاً فوقتاً کئی احکامات جاری کیے ان میں سے بعض مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱) گاؤں کی تمام عورتیں اور بالغ لڑکیاں پردے کے بغیر گھروں سے باہر نہ نکلیں۔

۲) فلمی گانے سننا اور گانا حرام ہے۔

۳) جن گھروں میں ٹیلی ویژن آ گیا ہے، وہ بے حیائی کو دعوت دے رہے ہیں۔ ٹیلی ویژن کو فوراً پھینک دو۔

۴) ایسی اسکول میں لڑکیوں کو نہ بھیجا جائے جس میں لڑکے بھی پڑھتے ہوں۔

۵) غیر محرم سے بات چیت کرنا حرام ہے۔

۶) شراب حرام ہے۔

۷) مرد کرتے پائجامے پہنا کریں۔ یہ مسلمانوں کا لباس ہے۔

۸) داڑھی نہ رکھنے والوں پر سخت عذاب ہے۔

۹) ٹخنوں سے اوپر پائجامہ پہنا جائے۔

۱۰) بچوں کو بت پرستوں کے اثرات سے بچانے کے لئے انھیں اردو میں ہی تعلیم دلوائی جائے۔

۱۱) شادی میں گانا بجانا اور گیت گانا غیر اسلامی ہے۔

۱۲) عرس اور مزاروں کا اسلام میں کوئی مقام نہیں ہے یہ شرک کے مترادف ہے۔

۱۳) ہندوؤں کے تہواروں میں شرکت، گناہ ہے۔

۱۴) ٹوپی پہننا لازم ہے۔

کویت سے واپسی کے دوسرے روز عبدالعزیز چپلون جانے کے لئے گھر سے نکلا۔شریفہ سے ملنا اس کا مقصد تھا۔

املی کے پیڑ کے نیچے سے وہ گزرا۔شگفتہ کی روح اس وقت پیڑ پر نہیں تھی۔شاخوں نے اسے دیکھا اور آپس میں سرگوشی کی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ایک ڈھلوان پہاڑی سے اتر کر دس منٹ کی پیدل مسافت کے بعد بازار تھا۔ جہاں سے ایس ٹی یا پرائیوٹ بس پکڑنا تھا۔

سکینہ کا گھر سرراہ تھا۔

جب سکینہ کا مکان اسے دور سے دکھائی دیا۔اس کے پورے بدن میں وہ لہر دوڑ گئی جسے گذشتہ چوبیس گھنٹوں سے اس نے مصروفیت کے بہانے دبائے رکھا تھا۔وہ جانتا تھا کہ اگر چند ساعتوں کے لئے بھی وہ تنہا ہو جائے گا تو سکینہ کی یادیں اور اس کی محبت کی تپش اس کو مات دے دے گی اور وہ اس کے دروازے پر پہنچ جائے گا۔

کویت جانے کے چند سال پہلے ہی اس نے سکینہ کے گھر جانا بند کر دیا تھا۔ طے یہ ہوا تھا کہ جب سکینہ اسے پیغام بھیجے گی ''کوکم'' لینے آنا تو وہ سیدھا اس کے والد کے گھر پہنچ جائے گا۔

یہی سبب تھا کہ وہ سکینہ کی یادوں سے فرار کی کوشش کر رہا تھا۔ جب اس کی نظر سکینہ کے گھر پر پڑی تو اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ''جب تک میں اسے اپنی آمد کی اطلاع نہیں دوں گا وہ کس طرح ملاقات کے لئے ماحول بنائے گی۔'' اسے بہت افسوس تھا کیونکہ اس نے نیند سے اٹھتے ہی سکینہ کو اپنی واپسی کا پیغام نہیں پہنچایا تھا کفِ افسوس ملتا ہوا وہ آگے بڑھا۔

اس نے کھڑکی میں سکینہ کو دیکھا۔

وہ ٹھہر گیا۔زمین اس کے پیروں کے نیچے آسمان بن گئی۔اس کی سمجھ میں نہیں آرہا

تھا کہ کس طرح قدم آگے بڑھائے۔ سکینہ نے ہاتھوں کے اشارے سے اسے بلایا۔ لیکن اسے ایسا لگا یہ سراب ہے۔ اس کی آنکھوں کا فریب ہے۔ ہوسکتا ہے وہاں وہ موجود نہ ہو۔

وہ ایک ایسے پرندے کی طرح تھا جو تصویرِ آسمان میں مقید تھا۔ اس کے کانوں میں سکینہ کی آواز پڑی۔ ''ارے عزیز...... می می سکینہ۔''

آواز کے ارتعاش نے تصویرِ آسمان پر بنے پرندے میں روح پھونک دی۔ اس نے اپنے پر پھڑ پھڑائے۔ اس کا پورا بدن برسوں کے انجماد سے برف کی زنجیروں میں بدل گیا تھا۔ ایک آواز اس کے اندر کڑکڑائی۔ اس کی حلق سے نکلا۔۔۔ ''سکینہ! آپ'' اتنا کہہ کر وہ ٹھہر گیا۔ اس نے ایک نظر اردگرد دوڑائی اور کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ راستے اور کھڑکی کے درمیان ایک سُرخ پتھروں کی دیوار تھی۔ دیوار کے اس پار کھڑے رہ کر اس نے بہت دیر تک سکینہ سے باتیں کیں۔

آگے بڑھتے وقت اس نے کہا کہ شام کو مہرون کچھ سامان پہنچا دے گی۔ سکینہ اسے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ راستے پر دوبارہ پہنچا تو سکینہ کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ دیدوں پر پھیلی پانی کی تہہ کے سبب اسے سارا منظر دھندلا دکھائی دینے لگا۔ اس نے آنسو نہیں پونچھے۔ وہ چاہتی تھی کہ اسے کوئی شئے واضح اور صاف دکھائی نہ دے۔

۲

عبدالعزیز راستے پر چلنے لگا تو اس کے دل و دماغ میں یادیں روشن ہوگئیں۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ ڈھلوان پہاڑی راستہ اس نے کب عبور کیا اور کب وہ ایس۔ ٹی میں بیٹھا۔

چپلون مارکیٹ میں ہی شریفہ پاؤسکر کا مکان تھا۔ اس نے دروازے پر دستک

دی۔ ایک خاتون نے دروازہ کھولا۔ عبدالعزیز نے کہا کہ وہ شریفہ سے ملنے سورل سے آیا ہے۔ خاتون نے وہیں سے شریفہ کو پکارا۔

شریفہ دو روز قبل ہی بمبئی سے چپلون آئی تھی۔ ایم۔ اے انگریزی ادب سے پاس کرنے کے بعد وہ بمبئی چلی گئی تھی۔ اپنی خالہ کے گھر رہ کر اس نے صحافت کی ڈگری حاصل کی۔ پھر ٹائمز آف انڈیا میں بہ طور رپورٹر ملازمت اختیار کر لی۔ گذشتہ دنوں اسے ٹیفائیڈ ہوا تھا اور یہاں اس کے لیے دو تین رشتے بھی آئے ہوئے تھے۔ اس لیے اس کے والد نے اسے فون کر کے گانو بلا لیا تھا۔

شریفہ نے اسے دیکھا تو اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے سامنے عبدالعزیز ہی کھڑا ہے۔ وہ لمحے بھر کو گنگ رہ گئی۔ پھر اس کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ جس خاتون نے دروازہ کھولا تھا وہ کام والی تھی۔ اسے لگا شریفہ اس آدمی کو دیکھ کر پریشان ہے، مبہوت ہے۔ اس نے شریفہ کو کہنی مارتے ہوئے کہا۔ ''دروازہ بند کر دوں کیا۔ لگتا ہے کسی دوسری شریفہ کو یہ ڈھونڈتے ہوں گے۔''

''ارے نہیں نہیں!''

''نہیں! مطلب آپ ان کو پہچانتی ہو......!''

''ہاں! تُو اندر جا......'' اتنا کہہ کر شریفہ نے عبدالعزیز سے ہاتھ ملایا۔

شریفہ کا مکان ایک پرانے طرز کا بنگلہ تھا جس کے اطراف مختلف پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے۔ اس کے والد چپلون کے نامی گرامی لوگوں میں تھے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی ایک بڑا سا ڈرائینگ روم تھا۔ ایک دیوار پر شیشے کی فریم میں مکہ مدینہ کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ اُس کے نیچے ساگوان کی لکڑی کی بنی میز تھی۔ عبدالعزیز اس پر

بیٹھ گیا۔ سامنے دیوان تھا۔ جس پر شریفہ بیٹھ گئی۔ دیوان سے لگ کر میٹل سے بنا ہوا ٹیبل تھا جس کی سطح پر شیشہ لگا ہوا تھا۔ اس ٹیبل پر کچھ فائلیں اور کتابیں تھیں۔ شریفہ کی والدہ نے ایک کمرے سے پوچھا۔

''کون آیا ہے؟''

''عبدالعزیز، بھول گئیں یا یاد ہے؟''

''ارے! برسوں سے کہاں غائب تھا۔''

''آپ خود آ کر پوچھ لیجے۔''

''دو منٹ ۔۔۔ آ رہی ہوں۔''

شریفہ کی والدہ عبدالعزیز کے چچا کی شادی میں اس کے گاؤں گئی تھی۔ قادر حسین جب بھی اپنے کام کاج سے چپلون آتے ان کے یہاں بھی چکر لگا لیتے تھے۔

شریفہ کی والدہ ساڑی کی مِری کھونستے ہوئے کمرے سے باہر نکلی۔ عبدالعزیز نے اٹھ کر ان کو سلام کیا اور آگے بڑھ کر ان سے ہاتھ ملایا۔ وہ بھی دیوان پر شریفہ کے ساتھ بیٹھ گئی۔

عبدالعزیز نے انھیں کویت کی ملازمت، قیام اور واپسی کی ساری روداد مختصراً سنائی۔ تب شریفہ کی والدہ نے کہا۔ ''اب تم لوگ باتیں کرو میں چائے وائے کا انتظام کرتی ہوں۔'' جب وہ اٹھ کر جانے لگی تو عبدالعزیز نے اپنے ہینڈ بیگ سے ایک پارسل نکال کر ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ آپ کے لئے ہے۔''

''ارے بیٹا تکلیف کیوں کی۔؟''

''ماں رہنے دو، عزیز ہم لوگوں کو بھی کالج میں بہت تکلیف دیا کرتا تھا۔'' شریفہ نے جھٹ سے کہا۔ تینوں کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''میرے لئے کچھ نہیں لایا۔ وہ پارسل تو تم نے ماں کو دیا ہے۔'' شریفہ نے اُس کی طرف مڑ کر کہا۔

''یہ کتاب میں نے تمہارے لیے لائی ہے۔''

شریفہ نے اس کے ہاتھوں سے کتاب لی۔ اس کی حیرت کا ٹھکانا نہ تھا، جب اس نے کتاب کا سرورق پڑھا۔ اس کتاب کی اسے مہینے بھر سے تلاش تھی۔ یہ ایک عجیب اتفاق تھا۔ ایسے اتفاقات زندگی میں تو ہوتے ہیں مگر جب کہانیوں میں بیان کیے جائیں تو غیر حقیقی لگتے ہیں۔ کہانیوں کی ایک خوبی یہ بھی تو ہے کہ اس میں غیر حقیقی باتیں حقیقی لگتی ہیں۔ اور زندگی کی حقیقتیں غیر حقیقی اور ڈرامائی۔ یہ فرائڈ کی مشہور کتاب The interpretation of dreams تھی۔ عبدالعزیز نے اسے بتایا کہ وہ اپنے ساتھ اس کی دی ہوئی کتاب کویت لے گیا تھا اور رہ رہ کر اس کو پڑھا کرتا تھا۔ شریفہ کو یہ بات سن کر سب سے زیادہ خوشی ہوئی۔ یہ خوشی اسے روبرو دیکھنے سے زیادہ طاقتور تھی۔ اسے اندازہ ہوا کہ واقعی عبدالعزیز اس کی قدر کرتا ہے۔ پھر عبدالعزیز نے ماہر عفافی کی دوستی کے بارے میں بتایا۔ اس نظم کے بارے میں بتایا جو اس نے صرف اور صرف شریفہ کے لئے عربی سے ترجمہ کی تھی۔ مگر پتہ بھول جانے کے سبب پوسٹ نہ کر سکا۔ شریفہ نے انتہائی مشتاق لہجے میں کہا کہ ''کل ہی مجھے پوسٹ کر دینا۔ خدا جانے پھر تم چپلون کب آؤ......'' عبدالعزیز نے حامی بھری۔ شریفہ کی والدہ ایک ٹرے میں دو کپ چائے لے آئی۔ اس کے پیچھے پیچھے ملازمہ بسکٹ اور گھر میں بنا ہوا چوڑا لے آئی۔ عبدالعزیز کو شریفہ نے بتایا کہ اس کی والدہ کو قریب سال بھر سے ذیابطیس نے پریشان کر رکھا تھا۔

شریفہ کی والدہ نے عبدالعزیز کے گھر والوں کی خیر خیریت پوچھی اور دوبارہ کیچن میں چلی گئی۔ ان کے اندر جاتے ہی عبدالعزیز نے پوچھا۔ ''ڈگری لئے ہوئے تمھیں

بھی تین چار سال تو ہو گئے ہوں گے۔ کیا کر رہی ہو......؟''

اس نے ساری روداد سنائی......اسے یہ سن کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی ہوئی کہ شریفہ کی انگریزی نظموں کا مجموعہ ''The Last Rituals'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ شریفہ اپنے بارے میں اسے اور بہت ساری باتیں بتاتی رہی۔ بمبئی کے دوستوں کے بارے میں، Leftist صحافیوں کے بارے میں، ہندوستانی صحافت کے بارے میں۔۔۔۔۔مگر تھوڑی دیر کے لئے وہ جہاں تھا وہاں نہیں تھا۔

شریفہ ہمیشہ اسے خود سے ایک قدم آگے نظر آتی۔ اس کی آزادی پسند روح اور قسمت پر اسے رشک آتا۔ کئی بار وہ شریفہ کے چہرے پر سکینہ کے چہرے کی پرچھائیاں دیکھتا اور وقتی تنہائی کا شکار ہو جاتا۔ اسے اپنے اندر......اپنی محبت میں، جس میں اس نے اپنے آپ کو پوری ایمان داری سے جھونک دیا تھا ایک لمحاتی خلاء سا جان پڑتا۔ یہ ایک بجھے ہوئے، سردائے ہوئے، کشش سے محروم سیارے کے ایک ''سیاہ نشان'' میں بدلنے جیسا خالی پن تھا۔ ایسا پہلے بھی کئی بار ہوا تھا۔ اس نے اس کیفیت پر خاصا غور بھی کیا تھا۔

اب وہ اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ یہ بھی ایک 'سراب' ہے۔ یہ واحد شئے ہے جو پائیدار سے پائیدار محبت کو کمزور کرتی ہے۔ دوسروں کی امتیازی صفات کا موازنہ اپنے دل میں بسنے والے انسان کی صفات سے نہیں کرنا چاہیے کیونکہ محبت صفات کی خاطر نہیں ہوتی۔ محبت خود ایک صفت ہے۔ اس خیال نے اس کو سکینہ سے ہمیشہ ہمیش کے لئے باندھ دیا تھا۔

جب عبدالعزیز کو دوبارہ اس کے جملے پوری طرح سنائی دینے لگے تب اس نے اس سے پوچھا۔

''اور بمبئ میں کوئی ملا تمھیں۔''

شریفہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ چپ رہی۔ وہ بھی نظریں ملانے کی بجائے ٹیبل پر رکھی کتابوں کی طرف دیکھنے لگا۔

''ہاں''......شریفہ نے آہستہ سے کہا۔

''Great! مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی ہے۔'' عبدالعزیز نے ٹیبل پر سے ایک کتاب اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ''جرنلسٹ ہے؟''

''نہیں......ردوشاعر ہے۔''

''اردوشاعر!'' عبدالعزیز کو حیرت ہوئی۔

''حیرت کی کیا بات ہے؟''

''میرا مطلب ہے!'' عبدالعزیز کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا کہنا چاہیے۔ وہ پل بھر کے لئے ٹھہر گیا اس نے کہا۔ ۔ ۔'' Then,he may be a religious fanatic.

شریفہ نے دائیں گال کو سکیڑتے ہوئے کہا۔ ''کس نے تمھیں یہ بتایا کہ اردو شاعر fanatic ہوتے ہیں؟''

''میرے بھتیجے نے کسی ،الطاف حالی کا نام لیا تھا ،اس کی نظم اس نے یاد کی ہے، مجھے اس میں تاریخ پرستی نظر آئی۔''

''اور کتنے شاعروں کو تم نے پڑھا ہے۔''

''مجھے اردو نہیں آتی، تمھیں تو پتہ ہے، لیکن اب چوں کہ تھوڑی بہت عربی سیکھی ہے۔شاید پڑھنے کی کوشش کروں تو......''

''ضرور پڑھو۔تاکہ تمھاری غلط فہمی دور ہو۔''

''مطلب!......Theyarenotrigid''

''بالکل نہیں اردو شاعری دنیا کی سب سے لبرل شاعری ہے۔''

عبدالعزیز شریفہ کے جملے کو سن کر پریشان ہوگیا۔ اس کا تاثر یہ تھا کہ اردو مذہبی انتہا پسندی کی مبلّغ ہے۔ اس سے پہلے کے وہ کچھ کہتا شریفہ کی ماں کیچن سے باہر آئی اور اس نے کہا۔ ''بیٹے تمھیں کھانا کھا کر جانا ہوگا۔''

''ارے نہیں نہیں، کیوں تکلیف کر رہی ہیں۔''

اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ اتنے برسوں بعد آئے ہو۔۔۔''

شریفہ نے ماں کی طرف مڑ کر کہا۔۔ ''یہ کھانا کھا کر جائے گا۔ اچھی مچھلی منگوا لینا۔''

عبدالعزیز شریفہ کی ماں کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ وہ واپس کیچن میں چلی گئی۔

''لیکن اس زبان میں جو مذہبی جماعتیں کام کر رہی ہیں وہ ہمارے کلچر کے لئے خطرہ بنتی جارہی ہیں۔'' عبدالعزیز نے بالآخر وہ بات کہی جو اس کے دل میں تھی۔

''پہلی بات زبان اور ادب میں فرق ہے......زبان کی سیاست اور ادب کی جمالیات میں فرق ہے۔'' پھر شریفہ نے اس سے پوچھا :Aesthetics، کا مطلب سمجھے نا؟''

"Ofcourse yaar"......لیکن تمھیں ایسا نہیں لگتا زبان کی سیاست، ادب کو متاثر کرتی ہے؟''

''مانتی ہوں! [لیکن اس سے خراب ادب پیدا ہوتا ہے۔] مجھے یہ بات منظور ہے کہ اردو زبان یہاں چند برسوں سے مذہبی بنیاد پرستوں کا ہتھیار بنتی جارہی ہے۔

عبدالعزیز نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمھیں ایسا نہیں لگتا چند برسوں بعد یہ عناصر اور طاقتور ہو جائیں گے۔؟''

''مانتی ہوں!''

''اس سے ادب میں بھی ان عناصر کو فروغ ملے گا......''

''لگتا نہیں۔ کیونکہ اردو ادب میں ترقی پسندی کی روایت بہت مضبوط ہے، البتہ اگر یہ کمزور پڑ گئی تو......''

''مذہب پرستی حاوی ہوگی تو وہ الطاف حالی کی طرح کی نظمیں۔''

''اوہو......ارے الطاف حسین حالی کہو، ۱۸۵۷ کی جنگ کے بعد جو مسلمانوں کی حالت تھی اس کے اثرات اس پر بہت تھے۔ یار......وہ شاعر ٹھیک ٹھاک تھا۔''

''myGod!'' وہ انیسویں صدی کا شاعر تھا۔''

''اور کیا۔ اس لیے تو کہا ہے تم پہلے شاعری پڑھو۔''

''ٹھیک ہے وہ تو میں پڑھ لوں گا۔ پر مجھے ڈر ہے اردو زبان composite کلچر کے لیے خطرہ نہ بن جائے۔''

''او بے وقوف! اردو composite کلچر ہے۔''

''رہی ہوگی''......عبدالعزیز نے تیکھے انداز میں کہا۔ پھر شریفہ سے نظریں ملائیں اور کہا۔

''لیکن زبان کی تعلیم میں مذہبی رنگ گھل رہا ہے، مذہبی پرستی کی تبلیغ ہو رہی ہے، وہ سب دیکھ کر لگتا ہے چند برسوں میں یہ صرف اور صرف ایک مخدوش کلچر کی علامت بن کر رہ جائے گی۔''

شریفہ کو عبدالعزیز کا یہ بہتان بہت گراں گزرا۔ اسے لگا یہ اس کی اردو کے تحت بے جا نفرت ہے۔ یہ اس کا ڈر ہے۔ ایک خوف ہے۔ جس کے سبب وہ دنیا کی سب سے میٹھی زبان کے بارے میں بکواس کر رہا ہے۔ لیکن اس وقت محض گفتگو کی لذّت کو برقرار رکھنے کے لیے اس نے پوچھا:۔ اگر ''اسلامی کلچر کی علامت بن بھی جائے تو پریشانی کی کیا بات ہے؟''

عبدالعزیز نے تاثر سے عاری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''ارے اسلام تو امن وسلامتی کا مذہب ہے۔'' شریفہ نے اس کے چہرے کے خالی پن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''I agree'' عبدالعزیز نے کہا۔

پھر کیا پرابلم ہے؟

''پروبلم مذہب نہیں...... مذہبی سیاست ہے کلچر اور زبان کی بالادستی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''سیدھی سی بات ہے۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو خالص عربی کلچر کے رنگ میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ مقامی رسم ورواج، تہوار، تہذیب پر قابض ہونا چاہتا ہے۔'' اسے ماہر عفافی کا ایک جملہ یاد آیا اس نے فوراً اپنے جملے کے ساتھ جوڑ کر کہا۔ ''جو مذہب اقتدار کا نشہ چکھ لیتا ہے، وہ اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے دوسرے مذاہب کو جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس میں کامیابی کے لئے اپنے کلچر کو دوسرے تمام کلچرز سے بالاتر اور افضل قرار دیتا ہے (اپنی زبان کو میٹھی، پاک اور مکمل قرار دیتا ہے، زیر اقتدار زبانوں کو جاہلیت کی پروردہ اور اس کے ادب کو کم تر۔'')

''Youspeaklikeanexpert'' شریفہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مذاق مت کرو۔''

''اب نہیں کروں گی...... مگر گفتگو کی شروعات جس بات پر ہوئی تھی وہ میں نے مذاق میں کہی تھی۔

''What???''

''کہ جس سے میرا چکر چل رہا ہے وہ اردو شاعر ہے۔''

''Verybad'' عبدالعزیز نے منہ بنا کر کہا۔

﴿۴﴾

شریفہ نے اسے بتایا کہ یہاں اس کے لئے تین رشتے آئے ہوئے ہیں۔ دو لڑکے چپلون کے ہیں۔جن میں سے ایک دبئ میں ملازمت کرتا ہے دوسرا بینک میں آفیسر ہے۔تیسرا رشتہ ایک مسجد کے امام کے بیٹے کا ہے۔وہ شمالی ہند کے رہنے والے ہیں۔ان کا لڑکا اسکول میں اردو پڑھاتا ہےاور شاعر ہے۔پھر شریفہ نے اسے بتایا کہ ان برسوں اس نے انگریزی اور ہندی میں اردو شاعری خوب پڑھی ہے۔اردو کی شعری روایت،آزاد خیالی،رواداری، مذہبی ہم آہنگی،تہذیبی اختلاط اور جمہوری ہے۔

عبدالعزیز نے اس سے کہا کہ ایک دو سال میں وہ خود اردو سیکھ لے گا۔ اس موضوع پر تب بات کرے گا۔

پھر وہ دوسرے کئی موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔وہاں ظہر کی اذان ہوئی اور وہ کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔

کھانا کھانے کے بعد عبدالعزیز اس کی ماں سے کچھ دیر تک کویت کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔

عبدالعزیز نکلنے لگا تو شریفہ نے کہا کہ وہ بس اسٹینڈ تک اسے رخصت کرنے آرہی ہے۔عبدالعزیز نے کہا۔''کوئی بات نہیں۔میں چلا جاؤں گا۔'' لیکن وہ نہیں مانی۔

بابِ ہشتم

وہاں بھی تیری صدا کا غبار پھیلا تھا

رات کے کھانے کے بعد وہ بہت دیر تک آنگن میں بیٹھ کر عارفہ اور سلیم کے ساتھ کھیلتا رہا۔ایک طرف گھمیلے میں [مچھروں اور کیڑوں کو بھگانے کے لئے] دھونی جل رہی تھی۔جس کا دھواں اطراف کے اندھیرے کی طرف بڑھ کر غائب ہو جاتا تھا۔آسمان کے تارے پلکوں کو جھپکا جھپکا کر انھیں دیکھ رہے تھے۔کبھی کبھار کوئی الّو بولتا،کبھی کہیں سے کتّوں کے بھونکنے کی آواز آتی......دیواروں کے چھیدوں میں جاگتے حشرات کے نغموں کی تان بہت تیز ہو جاتی تو گانو کی تاریکی مزید مہیب جان پڑتی۔

ایک ایک کر کے سب گھر میں جا کر لیٹ گئے تھے۔
عبدالعزیز آنگن میں بیٹھے کہکشاں کے حسن کو دیکھتا رہا۔

سارا آکاش اسے دعوتِ نظّارہ دے رہا تھا۔ وہ جس قدر دھیان سے ایک ایک تارے کو دیکھتا گیا۔ آسمان کی وسعت بڑھتی گئی۔ اس کی نگاہوں میں آسمان کا نقشہ اتر گیا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور دوبارہ روشن تاروں کو ذہن کی چادر پر اجاگر کرنے لگا۔

چند لمحوں میں آسمان ، اس کے اندر سما گیا۔ پھر یکا یک سارے روشن تارے بجھ گئے۔ اندھیرا چھا گیا۔ تارے اس کی دھیان کی صلاحیت کے سامنے آنکھ مچولی کھیلنے لگے...... چند لمحوں بعد دھیان کی چادر پر سکینہ کا مسکراتا ہوا چہرہ نمایاں ہوگیا۔ وہ چاہت سے اس چہرے کے نقوش دیکھتا رہا۔ ایک لطیف خوشی کے احساس سے اس کا چہرہ کھل گیا۔ امرود کے تنے کے پاس چھوئی موئی کا پودا رات کی خاموشی میں اپنے پتّے سکیڑ کر سو رہا تھا۔ لیکن عبدالعزیز کے چہرے پر بننے والی خوشی کی لہروں نے ان کے گالوں کو جا کر چھوا وہ حیرانی سے آنکھیں وا کئے اسے گھورتے رہے۔ ان کی اس نادانی اور محبت کی خوشی کی سرشاری کو دیکھ کر امرود کا پیڑ بہت دیر تک مسکراتا رہا۔

تخیّل کی چادر پر سکینہ تھی۔ گویا ندی کنارے مسلسل بارش میں بھیگنے کے بعد اس کے سامنے کھڑی ہو۔ محبت کی آگ میں خاک بسر ہوتے ہی فطرت نے ایک طلسمی کشش اس کے چہرے پر فطرت نے پھیلا دی تھی۔ جس کا نقش عبدالعزیز کی روح پر گہرا ہے گویا سکینہ کا ہر لمس اس کے جسم پر داغ دیا گیا تھا۔

۲

سکینہ سے مہرون کی ملاقات بازار میں ہوئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ ہفتے بعد عبدالعزیز کو لانے بمبئی جانے والی ہے۔ اس دن سے سکینہ کو گویا فالج ہوگیا تھا۔ وہ گھنٹوں ایک ہی جگہ پڑی رہتی۔ عبدالعزیز کے ساتھ اپنی زندگی کا پورا سفر یاد کرتی۔ جہاں اس کا ذہن بھٹک جاتا وہاں سے دوبارہ نئی ابتداء کرتی۔ اسی سبب اسے اندازہ

نہیں ہو پاتا کہ آخر کتنا وقت وہ ایک مقام پر گزار چکی ہے۔ وقت اس کے لئے ایک ہالہ تھا۔ وہ تنہائی کا ذائقہ چکھنے لگی تھی۔ اس احساس تنہائی میں ایک لذّت تھی۔

چند مہینے قبل ہی یوسف تراویح کی نماز پڑھانے کے بعد 'عالم' کی تعلیم کے لئے دوبارہ مدرسے لوٹ گیا تھا۔ مجاور حسین چار مہینوں کے لئے جماعت میں گئے تھے۔ گھر میں اس کی ساس تھی۔ جو دن کا بیشتر وقت گاؤں میں رشتے داروں کے گھر گزارتی تھی۔ اکیلا پن اسے پہلے بھی محسوس ہوتا تھا لیکن پڑوس کے گھروں میں جا کر ادھر ادھر کی باتوں میں وقت کاٹنے سے کم ہو جاتا تھا پر جب سے اسے معلوم ہوا کہ عبدالعزیز لوٹ رہا ہے اس کا دل ساری دنیا اور مافیہا سے کٹ کر صرف اپنی ذات پر مرکوز ہو گیا۔ اسے احساس ہونے لگا کہ عبدالعزیز کی غیر موجودگی میں جو برس اس نے گزارے ہیں وہ کس قدر بے معنی گزرے ہیں۔ اس نے بارہا آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ اس کا عکس اسے حیران نگاہوں سے دیکھتا اور اس سے پوچھتا۔ ''اتنے سال کہاں تھی تو۔۔۔؟''

وہ چاہتی تھی عبدالعزیز گاؤں پہنچتے ہی اس سے ملاقات کرے۔ لیکن یہ ممکن نہ تھا۔ اسے وہ آخری ملاقات یاد تھی جب، عبدالعزیز نے اسے بتایا تھا کہ پندرہ دن میں وہ کویت کے لئے نکل جائے گا۔ اس دن سکینہ نے اس سے کہا تھا۔ ''تم واپسی پر فوراً مجھ سے ملنے مت آجانا۔ اگر اس وقت گھر میں میرا شوہر یا یوسف موجود ہوگا تو میں مجبور بنی رہوں گی اور وہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا

❦

عبدالعزیز کو یہ بات اس طرح یاد تھی گویا روزانہ سکینہ کے لب اس کے کانوں کے قریب آکر سرگوشی میں اسے یاددلایا کرتے تھے۔ مگر وہ اس کی بات سے ناراض نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا اتنے طویل عرصے کے بعد سکینہ کے سامنے حاضر ہونے پر وہ خود بھی

اپنے جذبات کو دبا نہیں پائے گا۔ سکینہ کو اپنے سینے سے لگانے کی خواہش اسے مجبور کر دے گی۔ اسی لئے گانو پہنچنے کے بعد وہ کسی طرح سے خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی کے ذریعے اسے پیغام بھیجے۔ پھر اس نے سوچا اگر مرسل نے مجاور حسین اور یوسف کے سامنے کہہ دیا تو جانے کیا تاثر بنے گا۔ اس لئے، اس نے جسارت نہیں کی۔ البتہ اس نے ارادہ کیا تھا کہ جو تحفے وہ اس کے اور یوسف کے لئے لایا ہے وہ مہرون کے ہاتھوں بھجوادے گا اور یہ ایک واضح اشارہ ہوگا اس کی واپسی کا۔۔۔ پھر ملاقات کا دن اور وقت طے کرنا سکینہ کی ذمہ داری ہوگی۔ اس میں اسے خاصا تجربہ حاصل تھا۔

﴿۳﴾

سکینہ صبح جلد اٹھ گئی تھی۔ اس کا دل بار بار کہہ رہا تھا کہ عبدالعزیز بازار کی طرف نکلے گا۔ اس نے جلد اٹھ کر غسل کیا۔ چائے بنائی اور کھڑکی میں بیٹھ کر پیتی رہی۔ بہت دیر تک وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے سوچا: اب عبدالعزیز کے خدوخال میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئی ہوں گی۔ مجھے دیکھ کر اس کا تاثر کیا ہوگا۔ وہ کس طرح مسکرائے گا۔ کس طرح اسے سلام کرے گا۔ کن لفظوں میں اس کی خیریت پوچھے گا۔ وہ اس سے کون کون سے سوالات کرے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔ پھر اسے جانے کیا خیال آیا اور اس نے دوبارہ اپنے بال سنوارے۔ الماری میں سے پاؤڈر کا ڈبہ نکالا اور گالوں پر تھوڑا سا پاؤڈر ملا۔ پھر آنکھوں میں کاجل لگایا۔ الماری کے شیشے میں خود کو دیکھا۔ اپنے لبوں کو دانتوں سے دبا کر سرخ کیا۔ بہت دیر تک خود کو آئینے میں دیکھتی رہی۔ اپنی آنکھوں، ہونٹوں اور پیشانی کو دیکھا کیا۔ یہاں تک کے اس کا عکس آئینے میں منجمد ہوگیا۔

جب وہ دوبارہ کھڑکی کی طرف مڑی تو آئینے سے اس کی آنکھوں نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور اس کے لبوں نے کہا۔ ”ہمیں اس سراب میں کیوں چھوڑے

جا رہی ہو۔'' یہ آواز بہت دبی ہوئی تھی اس کے باوجود سکینہ کے کانوں نے اسے پکڑ لیا۔ وہ مڑی۔ آئینے میں دیکھ کر مسکرائی۔ اس مسکراہٹ نے آئینے میں مقیّد اس کے عکس کو آزاد کیا۔

وہ کھڑکی سے لگ کر بیٹھی تھی کہ اس کی ساس کمرے میں داخل ہوئی۔ اسے وہاں بیٹھے دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ''کیا ہوا رے، طبیعت تو ٹھیک ہے۔''

''ہاں۔ ہاں۔ یوسف کی یاد آ رہی ہے۔'' اس نے صاف جھوٹ بولا تھا۔

''ارے علم حاصل کرنے گیا ہے۔۔۔ وہ بول نہیں رہا تھا اس علم کو پانے کے لئے چین بھی جانا پڑے تو جانا چاہیے۔'' اس کی ساس نے دلاسا دینے کی نیت سے کہا۔

''ماں، بات برابر ہے، پر یاد تو یاد ہے نا؟''

''ماں کا دل کیا ہوتا ہے اب سمجھ رہی ہے نا؟'' ساس نے کہا۔ یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ میرے رویے میں جو پہلے تلخی تھی اس کا سبب ماں کا دل تھا۔

''حق بات کی آپ نے۔'' سکینہ نے رجھانے کے لئے کہا۔ ساس کو اچھا لگا۔ وہ مسکرائی۔ باہر جانے کے لئے آگے بڑھی، دروازے کے پاس پہنچی تو اس کے دل میں سکینہ کے لئے پیار اُمڈا۔ اس نے اونچی آواز میں کہا۔ ''بیٹی چائے گرم ہے۔ پی لے تھوڑی سی، مجھے آنے میں دیر ہوگی۔''

یہ سن کر سکینہ کا دل باغ باغ ہوگیا۔ اس نے جواب دیا۔ ''آپ بے فکر جائیے۔ میں پی لوں گی۔''

اب وہ مطمئن تھی۔ اس نے ایک کرسی کھینچ لی اور اس پر بیٹھ گئی۔ آج اس کا جی چاہتا

تھا کہ کاش گجرے والی آجاتی۔اس کے بال اس سے تازہ موگرے کے گجرے کا تقاضا کررہے تھے۔لیکن کم بخت آج گجرے والی جانے کہاں مرگئی تھی۔

سکینہ کبھی سڑک کی طرف دیکھتی کبھی کھڑکی کے باہر لگائے ہوئے پودوں کو۔۔۔ گلاب کی کئی ٹہنیوں پر پھول کھلے ہوئے تھے۔اس کا جی مچلا۔

پھر اس نے سوچا کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ وہ گھر کا احاطہ کاٹ کر پھول توڑنے جائے اور اس دوران وہ وہاں سے گزر جائے۔اس خیال سے اس نے بالوں میں پھولوں کو لگانے کا خیال ترک کردیا۔ پھر اس کی نظر سدابہار کے پھولوں پر گئی۔ہوا کے جھونکوں میں وہ لہرا رہے تھے۔اسے ایسا لگا شرابی رنگ پھول اس کے دل کی خوشی جانتے ہیں، اسی لئے جھوم رہے ہیں۔وہ بار بار انھیں دیکھتی رہی۔

پچھلی بارش میں مجاور حسین نے امرود کے پیڑ کے سائے میں اناس کی چند کلیاں لگائی تھی، وہ پھلوں میں بدل گئی تھیں۔اس نے ارادہ کیا کہ دو اناس وہ عبدالعزیز کے لئے بھیجے گی۔اپنے ہاتھوں کا بنایا ہوا اچار...... پاپڑ...... گزشتہ موسم کے کاجو اُس کے لئے بھیجے گی۔ اس طرح چھوٹی چھوٹی چیزیں اس کا دھیان اپنی جانب کھینچتی رہیں...... وقت اس کے لئے ہمالیہ بن گیا تھا۔دل کی دھڑکن اس کے لئے بازگشت تھی۔یادیں اس کے ذہن میں الجھا ہوا ریشمی دھاگوں کا گچھا تھا۔

❦

بالآخر جب اس کی نظریں عبدالعزیز پر پڑیں تو پہلے اس نے تسلیم ہی نہیں کیا کہ یہ وہی ہے۔اسے لگا کوئی شہری ہوگا۔ پھر اس کے دیدے اس پر مرتکز ہوئے۔اس کی زبان نے اسے پکارا...... ''عبدالعزیز......''

وہ مڑا تو اس کا چہرہ ان دیدوں میں سما گیا۔ ذہن نے تصدیق کرلی۔ ہوا یوں تھا کہ اس کی آواز نے زبان کو دماغ کی فریموں کے ایقان سے قبل متحرک کردیا تھا۔اس کے

چہرے پر مسرت سے ایک تازگی پھیلی۔ جس میں شدتِ انتظار کا اعلان بھی تھا۔

عبدالعزیز نے مڑنے کے بعد کوئی ردعمل نہیں کیا تھا۔ وہ چپ تھا۔ سکینہ کو یوں لگا اس کی آواز شاید اس کے کانوں تک نہیں پہنچی ہے۔ اس نے دوبارہ اسے آواز لگائی اور ہاتھ کے اشارے سے اپنی جانب بلایا۔

عبدالعزیز کی خوشی نے اس کے دوران خون کو بری طرح سے متاثر کر دیا تھا۔ وہ یہ طے نہیں کر سکا کے اسے کیا کرنا چاہے۔ اس کے پیر، زمین کی گہرائی میں گھٹنوں تک دھنس گئے تھے۔ گویا زمین دلدل تھی۔

سکینہ نے پھر اسے پکارا...... ''عبدالعزیز...... می...... می...... سکینہ۔'' اس کے دل نے اسے لایقینی کی خلیج سے باہر نکالا۔ اس کے قدموں میں حرکت ہوئی اور لبوں پر مسکراہت پھیلی۔ اس کی آنکھوں میں آس پاس کے پیڑوں کے رنگ منعکس ہوئے۔ اس کے نتھنوں نے دیواروں پر اگے جنگلی پھولوں کی خوشبو کو محسوس کیا۔ اس کے بدن میں ایک ترنگ جاگی۔ دوران خون کی تیزی میں ٹھہراؤ پیدا ہوا ایک نغمہ اس کے دل میں جگنو بن کر اسے آگے بڑھانے لگا۔ دن اس کے لئے گویا شب تاریک میں بدل گیا تھا۔

''میں صبح سے یہاں کھڑے رہ کر تمہارا رستہ دیکھ رہی تھی۔۔۔'' جب سکینہ کا یہ جملہ اس نے سنا تو وہ تاریک شب اس کے لئے باغِ بہشت میں بدل گئی۔ محبت کی شدت سے اس کے بدن کے تار تھرتھرانے لگے۔

سکینہ نے بتایا یوسف مدرسے میں ہے۔ اور اس کا شوہر جماعت میں چار مہینوں کے لئے گئے ہوئے ہیں، تو اس نے چاہا درمیان کی دیوار کو پھلانگ کر وہ اس کے کمرے میں چلا جائے اور سکینہ کو اپنے تھرتھرائے ہوئے بدن کی خود کلامی سے آگاہ کرے۔

گزشتہ برسوں میں سکینہ کے تعلق سے جو خود کلامی اس کے دل میں ہوئی تھی۔ اس کے سبب ایک بہت بڑا خلاء اس کی روح میں پیدا ہو گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا سکینہ کے لبوں کے کو کم رس سے تنہائی اور خالی پن کا وہ رقبہ دوبارہ پُر ہو جائے۔

چند ایک جملے اس نے ادا کیے اور سکینہ کو بتایا کہ وہ گھر سے چپلون کے لئے نکلا ہوا ہے۔ اس نے سکینہ کو اس کی نصیحت یاد دلائی کہ واپسی پر جب تک وہ اسے خود ملنے کے لئے نہیں بلائے گی تب تک وہ اس کے گھر نہیں آئے گا۔

سکینہ کو آخری ملاقات یاد آئی۔ جب اس نے یہ وعدہ اس سے لیا تھا۔ اس ملاقات کی ہر بات یاد آئی۔

عبدالعزیز نے کہا۔ ''جو پیار میں وعدہ نبھائے اس کے لئے سارے وعدے توڑے جا سکتے ہیں۔''

سکینہ مسکرائی پھر اس نے کہا۔۔۔ ''بڑے سمجھ دار ہو گئے ہو، جواب کویتا کے رنگ میں دینے لگ گئے ہو۔''

''میری کویتا۔۔۔۔ پہلے بتاؤ۔۔ کب ملوں۔۔۔؟'' عبدالعزیز نے زرا قریب ہو کر پوچھا۔

سکینہ نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ حیاء کی ایک فطری لہر اس کی آنکھوں کے ارد گرد ابھری اور فوراً ڈوب گئی۔ اس نے نچلے ہونٹوں کو دانتوں تلے دباتے ہوئے اس کے سراپے پر ایک نظر دوڑائی، پھر کہا...... 'کل''

دراصل سکینہ کہنا چاہتی تھی ''آج اور ابھی'' لیکن اتنے برسوں کی جو پیاس اس کے اندر تھی وہ یکا یک کم ہو گئی تھی۔ محبت کا یہ عجیب کمال ہے کہ جس کی غیر موجودگی بدن کو بے آب و گیاہ ریگستان بنا دیتی ہے، اس کا بس دیدار، خواہشوں کی تڑپ کو مٹا دیتا

ہے۔ اِس کی موجودگی ساری ویرانی کو پل بھر میں سبزہ زار میں بدل دیتی ہے۔ ساری دنیا ایک خواب میں بدل جاتی ہے۔ ایک ایسا خواب جس میں حقیقتیں اپنی جگہ موجود ہو کر بھی نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔ وہ مڑکر جانے لگا تو سکینہ کی نظریں اس کے ساتھ ساتھ سفر کرنے لگیں۔ محبت کا اب تک کا سفر اس کے ذہن میں ایک فلم کی طرح چلنے لگا۔ اس فلم میں ایک کیف تھا۔ ایک میٹھی مدھم موسیقی تھی۔ ایک تاریک مہیب سایہ تھا...... پُر کیف میٹھی مدھم موسیقی ایک تاریک مہیب سایہ میں جاری تھی۔ سکینہ وہاں بہت دیر تک کھڑی رہی۔ وہ ماضی میں تیرتی رہی۔ ماضی ایک ندی تھی۔ ندی میں بہاؤ ہے۔ وہ آگے نکل گئی۔ اب وہ مستقبل میں تھی۔ عبدالعزیز کی بانہوں میں تھی۔ اس سے محو گفتگو تھی۔ محفوظ باتوں کی گٹھری اس نے کھول دی۔ اپنے جذبات پر لگائی گئی مہر اس نے نکال دی۔ کوکم کی مہک سے بھرے کمرے میں اس کے خد وخال...... انکھوں کی اضافی چمک بن کر اپنے افسانے بیان کرنے لگے۔

گلاب کی ٹہنی پر کھلا ہوا پھول اسے رشک بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ سدا بہار کے پھولوں کا رنگ پہلے سے زیادہ شرابی ہوگیا۔ امرود کے پیڑوں پر گلہریاں دوڑتے دوڑتے ایک جگہ ٹھہر گییں۔ ہر چیز وہ نہ تھی جو پہلے تھی۔

۴

عبدالعزیز کی آنکھیں تاروں کے غبار میں بند ہوئیں تو ایک سرخ گنبد میں کھلیں۔ گنبد میں ایک کمرہ تھا۔ کمرے میں ایک پرانے طرز کا پلنگ تھا۔ جس پر ایک خوبصورت گوجڑی بچھی ہوئی تھی۔ دو تکیے تھے جن پر دھاگوں سے گل بوٹے کاڑھے ہوئے تھے۔ پلنگ پر وہ لیٹے ہوئے تھا۔ اس کی نگاہوں کو کسی کا انتظار تھا۔ گنبد کی دیوار سے اسے عجیب سی آواز سنائی دی۔ اس نے کان دیوار سے لگائے۔ دھیان میں اس نے محسوس کیا کہ گنبد کے اطراف بے شمار چوہے ہیں جو دیوار کو کرید رہے ہیں۔ اب وہ

دیوار کے باہر گنبد سے دور ایک پرانی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر بالکل حیرانی نہیں ہوئی کہ چوہوں کا رنگ گلابی ہے۔ کرسی ہوائی جہاز کی رفتار سے گنبد سے دور ہونے لگی۔ اس سے پہلے کہ گنبد نگاہوں سے اوجھل ہوتا اس نے محسوس کیا وہ کرسی پر نہیں ہے بلکہ گنبد کے اندر اسی پلنگ پر دراز ہے اور سکینہ اس کے پہلو میں بیٹھ کر ایک پرانا کوئی گیت گنگنا رہی ہے۔

اس سے پہلے کہ وہ گیت کے بول سن پاتا۔ مہرون کی آواز نے اسے جگا دیا۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ رات اس کے اطراف سرسرا رہی تھی۔ وہ کرسی پر سے اٹھا۔ دروازے کی طرف بڑھا۔ جانے کیا خیال اس کے دل میں آیا۔ وہ مڑا۔ اس کی نظریں چوہے پر پڑیں۔ چوہے نے دو پیروں پر کھڑے ہو کہ اس کی طرف دیکھا۔ ایک لمحہ خاموشی کا تھا، پھر جھٹ سے چوہا اچھلا۔ اور دوڑ کر سرخ دیوار کے ایک بل میں گھس گیا۔

۵

مہرون نے درمیانی کمرے میں اس کے لئے بستر لگا دیا تھا۔ وہ نیند سے بوجھل پلکوں کو لئے وہاں تک پہنچا اور بستر پر لیٹ گیا۔ رات کئی بار اس کی آنکھیں کھلیں۔ وہ سوچتا صبح ہو چکی ہوگی۔ ہر بار اسے مایوسی ہوئی۔ رات طویل سرنگ میں بدل گئی تھی جس کے دوسرے سرے پر صبح کی کرنیں تھیں مگر سفر تھا کہ ختم نہ ہوتا تھا۔ نیند کا غلبہ برقرار تھا اور انتظارِ صبح بھی اسے بے قرار کئے ہوئے تھا۔

٦

صبح عارفہ آ کر اس کے سینے پر بیٹھی اور اسے جگانے لگی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ نو بج چکے ہیں۔ اس نے عارفہ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنی بغل میں دبا لیا۔ عارفہ نے خوب شور مچایا۔ بچاؤ بچاؤ مر گئی مر گئی۔ اللہ، ماں،

چاچی،......مرگئی مرگئی...... وہ خوب ہنستا رہا۔گھر کے سارے لوگ ہنسنے لگے۔سلیم دوڑ کر پڑی سے اس کمرے میں آیا۔اس کے ایک ہاتھ میں اسکول کا بستہ تھا۔اس نے بستہ ایک طرف پھینکا اور خود بھی شرارت میں شامل ہوگیا۔وہ عبدالعزیز کی گردن پر چڑھ گیا اوراونچی آواز میں کہنے لگا، ''بھائی مت چھوڑو......دبادو

عبدالعزیز نے مڑکر اسے بھی ایک ہاتھ سے پکڑ کر بستر پر لیٹا دیا۔اب سلیم نے الگ شور مچانا شروع کیا...... ''ارے میں تو آپ کے ساتھ تھا۔مجھے مت دباؤ مجھے مت دباؤ...... ہاہا ہی ہی ہاہا ہی ہی ......'' عارفہ پر عبدالعزیز نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ اس نے فوراً خود کو آزاد کیا اور ایک طرف جا کر کھڑی ہوگئی۔لمبی لمبی سانسیں بھر کر، منہ صاف کیا۔اس کی ڈرامائی چیخ وپکار سے اس کے منہ سے بہت سارا جھاگ بہہ گیا تھا اور آنکھوں میں قہقہہ دار ہنسی سے آنسو آ گئے تھے۔پھر اس نے تالیاں بجا کر کہا۔۔ ''بھائی اس کو ہرگز مت چھوڑنا......دباؤ......دبادو اس کی گردن ...... یہ بہت مستی کرتا ہے۔'''' ز کھین تو لامی منگ بگھتاں'' سلیم نے کسی طرح گردن اٹھا کر عارفہ کی طرف دیکھ کر کہا۔۔(چڑیل تجھے میں بعد میں دیکھتا ہوں)

عارفہ نے منہ بنا کر اسے چڑایا۔اور انگوٹھا بتایا۔

''بیٹا ان کا پرچہ چل رہا ہے بعد میں کھیلنا۔''

عبدالعزیز کھڑا ہوگیا۔سلیم وہیں بستر پر لیٹا رہا۔وہ چاہتا تھا مستی ہوتی رہے۔ عبدالعزیز نے جھک کر اسے اٹھایا اور کہا۔۔ ''چل بیٹا۔۔۔اسکول جا کر آ، پھر کھیلیں گے۔''

عارفہ پڑی سے اپنا بستہ لے آئی۔سلیم نے کونے میں پڑے اپنے بستے کو اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔پر مڑ کر کہا...... ''بھائی شام کو کھیلیں گے ہاں......کہیں جانا مت۔''

''ہاں ہاں۔تو پرچہ پورا لکھ کر آنا۔۔سمجھا۔''

ہی ہی کرتا ہوا وہ گھر سے باہر نکلا۔اس کے پیچھے عارفہ اس کے قدموں پر قدم رکھتے،اسکول کے لئے چل پڑی۔

❦

عبدالعزیز پڑی میں گیا۔مہرون چولہے کے پاس گھاونے بنا رہی تھی۔ایک چول پر پانی ابل رہا تھا۔مہرون نے اس کے لئے بسنا آگے کیا۔وہ بیٹھ گیا۔مہرون نے اس سے چپلون کے بارے میں پوچھا۔اس نے بتایا کہ اس کی دوست شریفہ سے اس کی ملاقات ہوئی۔وہ بمبئ میں ایک اخبار میں کام کرتی ہے۔اتفاق سے چھٹی پر آئی تھی اور واپس جانے سے پہلے گانو آنے والی ہے۔

''کب آنے والی ہے؟''مہرون کے چہرے پر اس سوال کے ساتھ ایک مادرانہ محبت کی جھلک بھی عیاں تھی۔

''شاید اتوار کو۔۔''عبدالعزیز نے کہا۔

''اچھا ہے...... تیرے ابّا اور چچا بھی اتوار کو گھر میں رہیں گے۔

''کیوں؟''

''ارے بے وقوف۔۔۔آج رات،کل اور پرسوں عروس ہے معلوم نہیں۔اس لئے اتوار کو چھٹی کریں گے۔''

''اوہ......اوہ......بھول گیا تھا۔''

''چپلون جا کر آیا ہے اس لئے بھول گیا کیا؟''مہرون نے تیکھا جملہ کہا۔جس میں ایمائیت کا عنصر تھا۔عبدالعزیز سمجھ گیا۔

''نہیں ماں......کویت جا کر آیا ہوں نا......اس لئے......''

مہرون مسکرائی......پھر اس نے بتایا کہ سکینہ کے لئے جو پارسل چھوڑ گیا تھا وہ اس

نے پہنچا دیا ہے۔ سکینہ نے شکریہ کہا۔ عبدالعزیز کے چہرے پر خوشی تھی۔ مہرون نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سکینہ تجھے پسند کرتی ہے، تیری تعریف کرتی رہتی ہے۔ جب تو یہاں نہیں تھا ہمیشہ تیری خیر خیریت پوچھا کرتی تھی۔ ہمیشہ اسے یاد رکھنا۔''

عبدالعزیز نے اپنے چہرے کے رنگ کو دبانے کی کوشش کی پھر کہا...... ''ہاں ماں...... وہ بہت اچھی انسان ہے۔ میں جیتے جی اسے بھول نہیں سکتا۔''

''اس کے بیٹے نے اس سال گانو میں تراوی پڑھائی ہے۔''

''ارے واہ......' عبدالعزیز نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

''لوگ کہتے ہیں اسے ہر بات یاد رہتی ہے۔'' مہرون نے گھاونے کو توے پر پلٹتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' عبدالعزیز نے اپنی الجھن کو چھپانے کی کوشش کی مگر ناکامیاب رہا۔

''ارے لوگ کہتے ہیں ...... وہ جو بھی پڑھتا ہے نا...... وہ اس کو یاد رہتا ہے واپس پڑھنا نہیں پڑتا۔۔'' مہرون نے ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات کہی۔

''اچھا......'' عبدالعزیز نے سانس چھوڑتے ہوئے قدرے اطمینان سے ادا کہا۔

''لیکن اب وہ جانے کب واپس آئے گا شاید تیری ملاقات نہ ہو پائے۔''

''مطلب وہ واپس مدرسے چلا گیا ہے؟ عبدالعزیز نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا۔

''ہاں، اب مجاور حسین چاہتے ہیں وہ گانو کا پہلا عالم بنے اور......'

''اور کیا؟''

''اور گانو میں مدرسہ کھولے۔۔''

''مدرسہ تو ہے نا؟''

وہ تو صرف بچوں کو عربی سکھانے کے لئے ہے۔''

''دوسرا مدرسہ کس چیز کا؟''

''دوسرا نہیں...... سے کو حافظ بنانے والے بڑے مدرسے میں بدلیں گے۔''

پڑی کے دروازے پر کھڑے وقار حسین نے کہا۔ جو غالباً اپنی چابیاں بھول گئے تھے اور لینے واپس آئے تھے۔ پر جب ماں بیٹے کو بات کرتے دیکھا تو کچھ دیر خاموش دروازے پر کھڑے رہ کر انھیں سنتے رہے۔

''ارے ابا آپ۔۔'' عبدالعزیز نے مڑ کر دیکھا اور کہا۔

''ہاں۔۔۔۔مہرون وہ میری چابیاں ذرا دیکھ کہاں ہیں۔''

''ذرا رکنا، یہ ایک گھاونا اتار لوں۔''

وقار حسین آکر چولہے کے پاس دوسرے بسنے پر بیٹھ گئے۔ عبدالعزیز نے ان سے کچھ باتیں کیں۔ مہرون چابیاں لے کر آئی۔ وہ وہیں بیٹھے عبدالعزیز سے باتیں کرتے رہے۔ مہرون نے فوراً ایک کپ سلیمانی چائے چولہے پر رکھ دی ور خود بھی ان کی باتیں سنتی رہی۔ اس گفتگو کو سن کر اس کا چہرہ کنول کی طرح کھل گیا۔ وہ عبدالعزیز کو محبت بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔ اسے اپنے بیٹے پر اس لمحے سے زیادہ ناز شاید پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں چھلک ہی جاتیں اگر وقار حسین اسے نہ بتاتے ''چائے کو جوش آ گیا ہے۔''

''ارے میرے اللہ......'اس کی زبان سے ادا ہوا۔ اس نے ساڑی کے پلّو سے پتیلی اتاری اس کی ایک انگلی میں ہلکا سا چٹکا بھی لگا مگر فرطِ جذبات میں اسے اس بات کا احساس نہیں ہوا۔ وقار حسین نے چائے پینے کے بعد اٹھتے ہوئے عبدالعزیز سے کہا۔ ''رات میں تیرے چچا بھی ہوں گے، پھر تفصیل سے پلاننگ کریں گے۔''

''ٹھیک ہے......' عبدالعزیز نے کہا۔

وقار حسین نے نکلنے سے پہلے ایک بار مہرون سے نظریں ملائیں۔ عبدالعزیز کی ولادت کے بعد جب وہ پہلی بار اس کے سامنے گئے تھے تب جو چمک اس کی آنکھوں

میں انھیں نظر آئی تھی، آج اتنے برسوں بعد دوبارہ دیکھ کر ان کا جی خوش ہو گیا تھا۔۔ انھیں ایسا لگا عبدالعزیز کے بعد جو دو اسقاطِ حمل ہوئے تھے اس سے جو افسردگی مہرون کے وجود میں رہ رہ کر کروٹ لیتی تھی، آج وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی ہے۔ مہرون اور وقار حسین زندگی کے اس موڑ پر آچکے تھے جہاں ازدواجی رشتہ اظہار کے سارے میڈیم سے بالاتر ہو جاتا ہے بس ایک نظر، ہزار باتوں کے اظہار کے لئے کافی ہوتی ہے۔ احساس طمانیت کے ساتھ وہ گھر سے باہر نکلے۔ گویا انھیں دکان کی نہیں کسی گم شدہ خزانے کی چابیاں مل گئی ہوں۔

آنگن میں شمیم برتن دھو چکی تھی۔ وہ پڑی میں داخل ہوئی۔ عبدالعزیز تمباکو کی مسیری لگا رہا تھا۔ مہرون نے شمیم سے کہا کہ عبدالعزیز کے لئے باہر کی موری میں نہانے کا انتظام کرے۔ شمیم دوبارہ باہر گئی اور اس نے ایک بالٹی میں ڈرم سے پانی نکالا۔ پھر چولہے پر سے گرم پانی کا ٹوپ لے جا کر اس میں انڈیلا۔ اس سے پہلے کہ عبدالعزیز موری میں غسل کے لئے جاتا شمیم نے ٹاول اور صابن بھی موری میں رکھ دیا۔

عبدالعزیز نے شڑ مڑت پانی سر پر انڈیلا۔ بدن پر صابن ملا پھر ہاتھوں کو کاتھے سے گھسنے لگا۔ [یہ اس کی عادت تھی۔ پہلے جب وہ کھیل کود کر سرُخ مٹی میں لت پت ہوا کرتا تھا تو بہت دیر تک ہاتھوں اور پیروں کو ناریل کے کاتھے سے گھس گھس کر سرخ مٹی کی پرت نکالتا تھا۔] اسے ایسا لگا اب اس کی کیا ضرورت ہے۔ وہ سرخ مٹی میں کھیل کود کر تو آیا نہیں ہے۔ اس نے کاتھا جہاں سے لیا تھا وہاں رکھ دیا۔ (دراصل اب کاتھا سلیم اور عارفہ کو نہلانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔) اور اپنے ہاتھوں سے سینے اور بغل پر جھاگ کو ملنے لگا۔ صابن کی مہک کے بجائے اس کے نتھنوں میں کوکم کی

مہک محسوس ہونے لگی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور ماغ پر زور دے کر تازہ کوکم کی مہک کی یاد کو دوبارہ ذہن میں زندہ کیا۔ اس مہک میں ٹھنڈک تھی۔ اور اس ٹھنڈک میں سکینہ کی یادوں کا دھواں تھا۔ اس دھوئیں میں وہ بہت دیر تک آوارہ پرندے کی طرح غلطاں رہا۔

جب صابن کا جھاگ تحلیل ہو کر اس کا بدن سوکھنے لگا تو اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں۔ دوبارہ پانی سر پر انڈیلا۔ ایک ہلکی جھرجھری اس نے لی۔ دراصل شٹر مٹر ت پانی کی گرماہٹ ہوا میں اڑ گئی تھی۔ پانی بس کہنے کو گرم تھا۔

﴿ ۷ ﴾

ناشتہ کرنے کے بعد وہ شمیم کے والد سے ملنے کے لئے نکلا۔

ان کے دروازے پر پہنچا اس وقت وہ مرغیوں کے ڈربے کو صاف کر رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہاتھ منہ دھویا۔ پھر اسے گلے لگالیا۔

ان کی بہو رقیہ ناریل کے پیڑوں کو پانی دے رہی تھی۔ اس سے کرسیاں لانے کے لئے کہا۔

عبدالعزیز نے ان سے کہا کہ وہ اپنا کام ختم کرلیں پھر آرام سے بات کریں گے۔

''ارے کام تو جندگی بھر چلتا رہے گا۔'' انھوں نے کہا اور کرسی رقیہ کے ہاتھ سے لی اور عبدالعزیز کو بیٹھنے کے لئے کہا۔

''آپ بیٹھیے...... میں ...... وہ دوسری کرسی آ رہی ہے۔'' اتنا کہہ کر اس نے رقیہ کے ہاتھ سے دوسری کرسی لے لی۔

❁

دونوں ہاپوس آم کے ایک پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔

ان کی بہو رقیہ ایک ٹرے میں چائے اور گلوز کوز بسکٹ لے آئی۔

امتیاز کاسکر نے اس سے کہا۔ ''کھجوراں بھی لے آؤ۔۔''

''چچا میں ناشتہ کر کے آیا ہوں آپ۔۔''

''ارے چپ رہو۔......ذرا میری بہو کے ہاتھ کے کھجوراں کھا کے دیکھو۔''

رقیّہ کو یہ تعریف کچھ زیادہ ہی پسند آئی۔ وہ فوراً گھر میں گئی اور ایک طشتری بھر کے کھجوراں لے آئی۔ پہلے رقیہ کو لگا تھا کہ وو کھجوراں شاید پسند نہیں کرے گا اس لیے اس نے بسکٹ پیش کئے تھے۔ عبدالعزیز نے چار پانچ کھجوراں کھا کر تعریف کی۔ امتیاز کاسکر نے عبدالعزیز کا تعارف کرنا شروع کیا تو اس نے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے، شمیم آپا نے بتا دیا تھا۔ لیکن چونکہ پہلے کبھی دیکھا نہ تھا اس لئے......''

''اچھا......اچھا......اور کیا بتایا ہے شمیم آپا نے......'' عبدالعزیز نے شرارت اور تجسس آمیز لہجے میں پوچھا۔

رقیّہ نے اس کی طرف تحیّر آمیز نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔ ''آپ بہت پڑھے لکھے ہیں۔''

پہلے اس دیہی معصومیت پر عبدالعزیز کو بہت ہنسی آئی پھر پل بھر میں یہ ہنسی ایک سنجیدہ خیال میں بدل گئی۔ ''اسی معصومیت کو بعض بیمار لوگ یرغمال کر کے ان لوگوں کو جذباتی مذہبی سیاست کا مہرہ بنا لیتے ہیں۔'' وہ جانتا تھا کہ مذہبی سیاست کم تعلیم یافتہ افراد اور ثقافتی تاریخی شعور سے محروم قوموں میں یرقان بن کر پھیل جاتی ہے۔ ابتداء کی چند دہائیوں میں بھولے بھالے لوگ اس یرقانی حالت کو تطہیر نفس سمجھنے کی بھول کر بیٹھتے ہیں۔ جب مرض لا علاج ہو جاتا ہے تب آنکھ کھلتی ہے مگر کھلتے ہی ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتی ہے۔ مذہبی، سیاسی لہریں ہمیشہ معاشی اور سماجی زوال کو ساتھ لے آتی ہیں۔ امتیاز اس کے چہرے پر پھیلنے والی بے رنگی کو دیکھ رہے تھے۔ ان سے رہا نہ گیا۔ وہ سمجھے شاید رقیہ کی بات اس پر گراں تو نہیں گزری۔ انہوں نے فوراً چائے کا کپ زمین پر رکھا اور

پوچھا۔ ''بیٹا رقیہ تو تمہاری تعریف کر رہی تھی۔ بُرا لگا۔''

''ارے بالکل نہیں۔۔۔'' اس نے خیالات کے بھنور سے نکلتے ہوئے کہا۔ چائے کی ایک چسکی لی اور جملہ مکمل کیا۔۔۔ ''میں تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

''کیا سوچ رہے تھے؟''

''یہی کہ تعلیم کی ضرورت پورے کوکن کو کتنی ہے۔''

''اب ہوگئی تعلیم۔۔۔'' بڑی لاتعلقی سے امتیاز نے کہا۔''

''کیوں نانا ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔''

امتیاز کاسکر نے نظریں گھمائی۔ ایک کونے میں ان کے تاشے ڈھول اور شہنائی پڑے ہوئے تھے۔ گزشتہ ڈیڑھ سال سے ان کا استعمال نہیں ہوا تھا۔ لوگوں نے شادیوں میں تاشے اور شہنائی بجانے کو حرام قرار دیا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ لوگ جو نمازوں کی پابندی کرنے لگے تھے اور جماعتی تقریریں سننے لگے تھے۔ ان کے رویوں میں بھی ایک طرح کی تبدیلی آنے لگی تھی۔ انھیں امتیاز کا ریاض کرنا بھی معیوب لگنے لگا تھا۔ چند ایک جو زیادہ مذہبی ہو گئے تھے انہوں نے اسے بتایا کہ ''موسیقی کے آلات کو گھر میں رکھنے سے برکت نہیں آتی۔ اس کے بجانے والے ابلیس کے بھائی ہیں۔'' امتیاز کا غصہ ان کی آنکھوں میں آکر ٹھہر جاتا۔ جب کہنے والا آگے کہتا۔ ''ایک مومن کی ذمہ داری ہے کہ وہ آخرت کی بھلائی کے لئے حق بات کہہ دے۔''

امتیاز جب بھی ان آلات کی جانب دیکھتا اس کا جی رونے لگتا۔ اسے ایسا لگتا یہ سارے آلات سوگوار ہیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا وہ مردہ لاش ہے جس کے اطراف شہنائی، تاشے، بانسری اور چھوٹے طبلے سوگ منا رہے ہیں۔ جو لوگ پہلے اس کے یہاں مشق کرنے آتے تھے اب ان کے پائجامے بھی ٹخنوں سے اوپر چڑھ گئے ہیں۔ ان کے کرتے کی جیبوں میں مسواک کے لئے گنجائش نکل آئی ہے۔ جس میں پہلے

تاشہ بجانے کے لئے استعمال ہونے والی بانس کی پتلی چھڑی ہوا کرتی تھی۔

امتیاز ان چند لوگوں میں تھے جن کا کسی نہ کسی طرح فنون لطیفہ سے ایک چھوٹا سا سہی رشتہ تو تھا۔ موسیقی کا علم تجربے اور مشق سے انھوں نے حاصل کیا تھا۔ سروں اور راگ کا بھی انھیں شعور تھا۔ حساس طبیعت اس آدمی کو سماجی تبدیلیوں کا احساس دوسروں سے پہلے ہونا فطری بات ہے۔

حسرت بھری نظریں کونے میں پڑے آلات پر چند لمحوں کے لئے ٹھہریں اور پھر عبدالعزیز کی طرف مڑی، عبدالعزیز نے دوبارہ پوچھا؛ ''کیا بات ہے نانا؟''

''عزیز بھائی ان کا دل ٹوٹ گیا ہے۔'' رقیّہ نے کہا۔

امتیاز نے نظریں اٹھا کر رقیّہ کی جانب دیکھا۔ عبدالعزیز فوراً ایک ان سوچی صورت حال میں خود کو پا کر حیران رہا۔ اس نے رقیّہ سے پوچھا۔ ''کیوں!''

''لوگ انھیں تانے دیا کرتے ہیں۔'' اس نے کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''طعنے۔۔۔!۔۔۔کیوں۔۔۔کس بات پر طعنے۔''

''ارے نالائق کہتے ہیں تاشے بجانے والا شیطان ہوتا ہے۔'' بڑی جھلاہٹ کے ساتھ امتیاز نے کہا۔

''کون''۔۔۔ یوں تو پہلے ہی رفیق نے اسے ساری رام کہانی سنا رکھی تھی۔ پھر بھی اس نے جان بوجھ کر پوچھا۔ امتیاز کو ایسا لگا کوئی تو ہے جو اس کی بات کو سننا چاہتا ہے۔ جسے موسیقی سے بیر نہیں ہے۔ اس نے دل کے صفحات عبدالعزیز کے سامنے پھیلا دئے۔ عبدالعزیز خاموشی سے سنتا رہا۔ رقیّہ پڑی میں چلی گئی تھی۔ سورج چھت کے عین اوپر آ گیا تھا۔ آم کے پیڑ کے پتوں سے دھوپ چھن کر ان پر پڑ رہی تھی۔ اذان کی آواز بلند ہوئی۔ عبدالعزیز نے گھڑی دیکھی، اسے وقت کے گزرنے کا احساس نہ تھا۔ گھڑی کو ان سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ وقت بہت آگے بہہ گیا تھا۔ عبدالعزیز نے اٹھتے

ہوئے کچھ خوشگوار باتیں کرنے کی کوشش کی تا کہ امتیاز کی باتوں سے جو تلخی ہر طرف پھیل گئی تھی وہ کم ہو جائے۔

﴿۸﴾

سکینہ صبح ہی اپنے والد کے گھر کے لئے نکل گئی تھی۔ راستے میں اس نے ایک دکان سے بسکٹ، چائے پتی اور شکر بھی خرید لی۔ گھر پہنچ کر کھراٹے سے جھاڑو لگائی۔ دروازے اور کھڑکیاں کھول دیں تا کہ تازہ ہوا مکان میں داخل ہو۔ پندرہ بیس روز سے مکان مستقل بند پڑا ہوا تھا۔ آج وہ بہت بے فکر تھی کیونکہ مجاور حسین کے ساتھ اس کے والد بھی جماعت میں گئے تھے۔

فصل کٹ چکی تھی اور زیادہ کام بھی نہیں تھا اس لئے اس کے والد نے پہلے ہی فخر الدین کو دو مہینے کی تنخواہ پیشگی دے کر چھٹی دے رکھی تھی۔

سکینہ نے رسوئی گھر صاف کیا۔ باہر کے کنویں سے دو کلسی تازہ پانی لایا۔ ایک ٹوپ میں دو کپ دھوئے۔ جن پر ہلکی گرد جم گئی تھی۔ پھر درمیانی کمرے میں آئی اور جھولے پر لیٹ گئی۔

﴿۹﴾

امتیاز کاسکر سے ملاقات کرنے کے بعد عبدالعزیز گھر واپس گیا۔ کھانا کھانے کے بعد تھوڑی دیر لیٹا رہا۔ پھر کپڑے بدل کر وہ گھر سے نکلا۔ مہرون نے اسے یاد دلایا کہ شام میں عرس ہے جلد گھر لوٹنا۔

﴿۱۰﴾
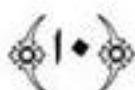
سکینہ کے والد کا مکان جوں جوں قریب آتا جا رہا تھا عبدالعزیز کی رفتار کم ہوتی جارہی ہے۔ سکینہ کو بانہوں میں دیکھنے کا تصور ہی اس کے لئے اس قدر نشہ آور تھا کہ وہ

خیالات کی رنگارنگی میں دیر تک کھویا رہنا چاہتا تھا۔ آج اسے اس بات کا احساس شدید تھا کہ کس خوشی سے وہ سب سے زیادہ محروم رہا ہے۔ سکینہ کے بدن کا احساس، مٹھاس ،تپش اور لمس اس کے وجدان میں موجزن طوفان بن گیا تھا۔ آج اسے احساس تھا کس طرح اس نے جان بوجھ کر اتنے برسوں تک اس ذائقے کی خواہش کو دل میں دبائے رکھا تھا۔ اس کے ذہن میں یاد کے وہ ٹکڑے بھی آج اس کے لبوں پر مسکراہٹ کا سبب تھے جب سکینہ کی محبت کی لہروں کو اپنے بدن کی قید سے آزاد کرنے کے لئے وہ اپنی ہتھیلی کی ریکھاؤں میں اس کا چہرہ تلاش کرتا تھا۔ ایک ہاتھ کمر پر رکھ کر پلکوں کو بند کئے وہ جانے کتنی دیر تک اس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحوں کو دماغ کی اسکرین پر مدھم روشنیوں میں اجاگر کرتا۔ یہاں تک کہ اس کی سانسیں تیز ہو جاتیں اور سکینہ اس کی ہتھیلی پر اوس کی بوندوں میں بھیگی، مسکراتی...... جلوہ گر ہو جاتی۔

پھر ایک احساس اسے مضمحل کر دیتا کہ اب وہ دوبارہ کسی گھنے بن میں گم ہو جائے گی۔

عبدالعزیز خود ایک جنگل میں بدل گیا تھا جس میں بہت ساری یادوں کے درمیان واقعات گم ہونے لگے تھے۔

اس کے قدم سکینہ کی منزل کی طرف بڑھنے لگے۔ اس نے بہت سے واقعات کو صفحۂ دل پر دوبارہ دیکھنا چاہا...... اسے خبر تک نہ تھی کہ بہت ساری چھوٹی چھوٹی باتیں ،جو بے حد معنی خیز اور محبت سے معمور تھیں کئی مہینوں فراموشی کے صحرا میں دب گئی تھیں۔ آج اسے یاد آیا؛ جب موسلا دھار بارش میں سکینہ نے آم کے پیڑ کے نیچے اس سے کہا تھا۔ ''میں تیرے بچے کی ماں بننے والی ہوں'' تب اپنی حیرانی اور ناسمجھی میں اس نے کہا تھا۔ ''آپ کو ایسا کہنا چاہیے، کہ آپ مجھ سے پیار کرتی ہیں۔''

اس طرح سابقہ گفتگو کو یاد کر کے اس کا دل سکینہ کے اتصال کے لئے بے قرار ہو گیا

تھا۔ جب وہ اس کی حویلی کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوا تب سب سے پہلے اس کی نظر فخرالدین کے لئے بنائے گئے مکان کی اور گئی۔ اسے مقفل دیکھ کر اسے قدرے اطمینان ہوا۔ پھر اس نے دیکھا کہ حویلی کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اس نے گیٹ بند کیا اور حویلی کی طرف بڑھ گیا۔

11

دروازے کی دہلیز پر وہ پہنچا تو سامنے ہی سکینہ جھولے پر لیٹی ہوئی نظر آئی۔ وہ آگے بڑھا۔ سکینہ کی آنکھ لگ گئی تھی۔ عبدالعزیز بہت دیر تک وہیں کھڑے رہ کر اس کے چہرے کے خطوط دیکھتا رہا۔ اس کے تخیل میں جو نقش محفوظ تھا وہ اس موجودہ چہرے کو پرت در پرت اپنے عکس پر Adjust کر رہا تھا۔ اس کے باوجود Process مکمل نہیں ہوا۔

اب اس کے خطوط پہلے سے زیادہ گہرے ہو گئے تھے۔ گردن کے گرد چربی کی ایک تہہ نے اپنے لئے جگہ بنا لی تھی۔ کان کے پاس چند بالوں کا رنگ اڑ گیا تھا۔ وقت کی دیمک سکینہ کو چاٹنے لگی تھی۔ عبدالعزیز کے لبوں پر مسکراہٹ پھیلی۔ اور ایک جملہ اس کی ذہن میں خلق ہوا۔ ''بدن ایک عمارت ہے اور وقت کے ساتھ ہر عمارت کو منہدم ہونا ہے۔'' اس خیال کا کوئی منفی اثر اس پر نہیں ہوا کیوں کہ اسے معلوم تھا اس کے خاکدان میں جو دل ہے وہ اس کے لئے ہمیشہ دھڑکتا رہا ہے۔

ابھی وہ خیالات میں ڈوب کر ابھرا ہی تھا کہ ایک بلّی آئی اور دم اوپر اٹھائے دروازے سے اپنی گردن رگڑنے لگی۔ عبدالعزیز نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بھگانا چاہا۔ اس نے اونچی آواز میں دو تین بار میاؤں میاؤں کیا۔ سکینہ کی آنکھ کھلی تو وہ چونک گئی۔ جھٹ سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بہت گہری نیند سے اس کا ربط ٹوٹا تھا۔ سامنے عبدالعزیز کو کھڑا دیکھ وہ سٹپٹا سی گئی۔۔۔ چند لمحوں تک اس کی سمجھ میں نہ آیا کیا کہے، کیا کرے۔

سکینہ نے چائے بنانے کے لئے پانی رکھا۔عبدالعزیز نے کیچن کے پچھواڑے ا ٓموں کے باغ میں کھلنے والا دروازہ کھولا۔

ہاپوس، پایری،اور رائیول آم کے بہت سارے پیڑ ایک ہی باغ میں ایک دوسرے کی بانہوں میں باہیں ڈالے کھڑے تھے۔ان کا ایک چکر کاٹ کر وہ دوبارہ اس کے پاس آیا۔اس کے روبرو ایک بسنے پر بیٹھ گیا۔

سکینہ نے اس سے قیام کویت کے بارے میں پوچھا۔اس نے مختصراً جوابات دئے۔پانی ابلنے لگا تو سکینہ نے اس میں شکر ڈالتے ہوئے اس سے سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔''میری یاد آتی تھی؟''

عبدالعزیز نے بائیں کان کے اوپر بالوں کو کھجاتے ہوئے کہا۔''کبھی نہیں؟''

سکینہ کا چہرہ فوراً اتر گیا۔اس کا دل مسوس کر رہ گیا۔ایک زرد لہر اس کے لبوں کے کناروں پر بنی۔۔۔عبدالعزیز اسے بہ غور دیکھ رہا تھا۔اسے بھی احساس تھا۔وہ جان رہا تھا کہ وہ نظریں چرا رہی ہے۔اس نے پانی میں چائے کی پتی ملائی۔اور کپ کو نتھارنے لگی۔

''اسے برا لگا......؟''عبدالعزیز نے آہستہ سے پوچھا۔

''نہیں...... برا کیوں لگے گا۔'' سکینہ نے جواب دیا اور چولہے کی آنچ کم کی۔

''جھوٹ مت بولو۔'' عبدالعزیز نے جھوٹ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

سکینہ نے مڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔جہاں شرارت آمیز مسکراہٹ صاف نظر آرہی تھی۔

''یہ گرم چائے دیکھ رہے ہو...... یہ تمہارے چہرے پر اچھال دوں گی۔ مذاق اڑاتے ہو۔'' سکینہ نے کہا۔اس کے لہجے میں خود اعتمادی تھی۔عبدالعزیز نے اس کے

لہجے کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت میں در آئی پختگی کو محسوس کرتے ہوئے جواب دیا۔

''جس دن چاہو، میں تمہارے سامنے بیٹھ جاؤں گا۔۔۔ گرم پانی اچھالنا مت۔ بلکہ سر پر انڈیل دینا تاکہ میرا جسم گل جائے۔تب تمھیں اندازہ ہوگا۔تم کو میرا دل کس قدر یاد کیا کرتا تھا۔''

اس طرح آرزو سے پر جملہ اس نے عبدالعزیز کی زبان سے پہلے نہیں سنا تھا۔وہ چپ رہی۔اسے پتہ تھا کہ اسے کیا نہیں کہنا چاہئے۔وہ یوں چپ رہی گویا اس کی قوت گویائی یکا یک ختم ہوگئی ہو۔

❦

جھولے پر بیٹھ کر انہوں نے چائے پی۔عبدالعزیز نے یوسف کے تعلق سے بہت ساری باتیں کیں۔ بہت سارے سوالات پوچھتا رہا۔ بہت ساری باتیں سن کر وہ خوش ہوا۔اور بہت ساری باتیں ایسی تھیں جن کے تعلق سے وہ فکر مند تھا۔اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ایک نظر یوسف کو دیکھے۔اس کے ناک نقشے کو دیکھے اس کی آواز سنے۔

اس تجسس کے باوجود تشکیک روح کا ایک رنگ ہے۔جب یہ رنگ یقین اور اعتماد کے رنگوں پر غالب آجاتا تو اسے لگتا کہیں سکینہ نے سچ مچ اس کو پوپٹ تو نہیں بنایا؟ کہیں یہ اس کی خام خیالی تو نہ تھی کہ وہ اسی کا بیٹا تھا؟ کہیں یہ اس محبت کے اندھے پن کے سبب اسے نظر آنے والا سراب تو نہ تھا؟

پھر وہ اس نتیجے پر پہنچا...... کہ اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے۔اس کا سروکار صرف اور صرف سکینہ سے ہے۔

پہلے بھی ہزار بار یہ وسوسہ اس کے سینے میں کروٹیں لیتا رہا تھا اور ہر بار وہ خود سے کہتا۔''میرے لئے تو سکینہ ہی سب کچھ ہے۔''...... باوجود اس کہ پھر یکا یک وہ ایک باپ کی طرح یوسف کو یاد کرنے لگتا۔ یوسف کو دیکھنے،اس سے ملنے کی تڑپ اس کے

دل میں پیدا ہوتی۔ اس سے باتیں کرنے کی تمنا بیدار ہوتی۔ وہ باتیں اس کے خاکدان میں ہمیشہ محفوظ رہیں۔

آگے بھی وہ کبھی ان جذبات کا اظہار نہ کر سکا۔ چند برسوں بعد۔ مدرسے کے قیام کے بعد جب یوسف نے شدت پسند مذہبی رہنما کے طور پر احکامات جاری کرنے شروع کئے اور عبدالعزیز نے ان پر اپنا موقف کھلے عام لوگوں کے سامنے رکھا تب بھی اس کے دل میں یہ جذبات اندر ہی اندر ایک ہیجان، افسردگی اور حزنیے کو جنم دیتے رہے۔

عبدالعزیز کی شخصیت میں ایک دراڑ پیدا ہوگئی تھی۔ ایک طرف اس کے اندر ایک جوشیلا آزادی پسند انسان تھا جو مذہبی جنونی شدت پسندی کے سماجی تہذیبی اور معاشی نقصانات سے لوگوں کو واقف کرانا چاہتا تھا۔۔ دوسری طرف محبت میں ڈوبا، عشق کی آنچ سے پگھلنے والا آدمی تھا۔ جسے یوسف کے چہرے پر سکینہ کی مسکراہٹ نظر آتی تھی۔ چند ایک بار تو یوسف کے کان دیکھنے پر لامحالہ اس کے ہاتھ اس کے اپنے کانوں کی پوروں تک از خود چلے گئے تھے۔ وہ جب بھی اس کے ہاتھوں کی انگلیاں دیکھتا، اس کی نظریں اس کے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں پر ٹھہر جاتیں۔

پر جب وہ اس کے خیالات سنتا تو اسے ان لفظوں جملوں اور حوالوں میں مجاور حسین کی بو...... زیادہ مہلک طور پر محسوس ہوتی......

یوسف کے خیالات اس کے لئے شخصیت کا المیہ بن گئے تھے۔

چائے پینے کے بعد وہ آم کے باغ میں ٹہلتے رہے۔ سکینہ نے اسے بتایا کہ قریب ڈیڑھ سال پہلے اس کی بچہ دانی میں ایک گانٹھ ہوگئی تھی۔ دواؤں سے وہ کسی طرح ٹھیک نہیں ہوئی۔ چارو نا چار چپلون کے ایک پرائیوٹ نرسنگ ہوم میں آپریشن کیا گیا۔ بچہ

دانی نکال دی گئی۔

عبدالعزیز اس کی ان باتوں کو دھیان سے سنتا رہا۔ اسے افسوس تھا۔ لیکن اطمینان اس بات سے ہوا کہ عین وقت پر مرض کی تشخیص ہوگئی ورنہ جانے وہ کیا صورت اختیار کر لیتا۔

پھر وہ دونوں بہت دیر تک باغ میں ٹہلتے رہے۔ گویا وہ باغ بہشت ہو اور یہ دونوں آدم وحوا...... وہ باتیں کرتے رہے۔

ان باتوں میں زندگی سے متعلق ان کے احساسات اور دلوں میں موجود محبت کا اظہار تھا۔

❦

شام کے آخری پہر انہوں نے محبت کی۔ آخری بوسے پر عبدالعزیز نے اس سے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ آج پہلی بار......'

سکینہ نے جھپٹ کر کسی شیرنی کی سی پھرتی کے ساتھ اس کا کان کاٹ لیا۔ ''آ آ آ......'' عبدالعزیز کی حلق سے نکلا۔

﴿۱۲﴾

سورج افق پر پہنچ گیا تھا اور عبدالعزیز دوبارہ گانو میں۔۔۔ ہر طرف روشنی تھی۔ دور دراز سے لوگ عرس کے لیے آئے ہوئے تھے۔ چٹ پٹے مسالے دار کھانوں، کھلونوں اور کپڑوں کے دکانچے لگے ہوتے تھے۔ مسجد کے سامنے کے میدان پر عرس برسوں سے ہوتا آیا تھا۔ تین روز تک عقیدت مندوں کا تانتا لگا رہتا۔ ہر مذہب، فرقے اور طبقے کے لوگوں کو ایک ساتھ یہاں دیکھا جا سکتا تھا۔ درگاہ کے صحن میں عنبر، لوبان، عطر چھڑکا اور جلایا جاتا۔ ایک طرف ایک گھمیلے میں جنگلی گھاس جلا کر دھواں کیا جاتا۔ جس سے دور تک مہک پھیل جاتی اور ماننا تھا کہ موذی کیڑے مکوڑے بھاگ

جاتے ہیں۔

درگاہ کے صحن میں لوگ ایک دوسرے پر عطر اور گلاب پاشی کرتے جس سے مہک دوبالا ہوتی۔گلاب، چمپا، چمیلی اور موگرہ کے پھولوں سے بنی چادریں چڑھائی جاتیں۔

یہ دن بچّوں کے لئے سوغات لے آتے۔ سر شام ہی وہ شور شرابے کا حصّہ بن جاتے۔رنگ برنگی غبارے، پلاسٹک اور اسٹیل کی سیٹیاں، کاغذ کے جھنڈے، بھنورے، نقلی تلواریں، پلاسٹک کے شیر ببّر، نقلی دوربین، کیمرے، ریڈیو، اور چاکلیٹ ہاتھوں میں لئے اتراتے پھرتے۔صاحب حیثیت لوگ نذرانے ادا کرتے، نامراد دعاؤں میں مصروف ومغروق نظر آتے۔شرابی کبابی شرافت کی مورت بن جاتے تو خداترس، صوفیوں کالباس اوڑھ کر صندل وچادر کی تیاری میں جٹ تاتے۔عاشق مزاج آنکھیں ٹھنڈی کرتے، دل پھینک لڑکیاں ناگن کا روپ دھار لیتیں، سلیقہ مند عورتیں گھر آنگن کی صاف صفائی کر کے میٹھے پکوان بناتیں اور مہمانوں کا انتظار کیا کرتیں۔

عبدالعزیز ان خوب صورت مناظر کا امین تھا۔ یہی باتیں گانو کے عرس کے تصّور کے ساتھ اس کے ذہین میں روشن ہوتیں تھیں۔

اس موقعے پر اس کے اسکول کے غیر مسلم ساتھی بھی اس کے گھر آیا کرتے تھے۔ جنھیں مہرون ساندھنے، میٹھا کھانا اور کھیر کھلایا کرتی تھی۔کھانے پینے کے بعد وہ دیر رات تک ان کے ساتھ مدہوش ہوکر بھٹکتا رہتا۔

ادھر مغرب کی اذان ہوئی اور اُدھر وہ سلیم اور عارفہ کو عرس کے لئے لے کر گھر سے نکلا۔ وہ انھیں ہر دکان ہر دکا نچے پر لے گیا۔ جہاں انھیں جو چیز پسند آئی وہ خرید لی۔۔ سلیم اور عارفہ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ وہیں اسے کچھ پرانے دوست ملے۔ وہ ان سے باتیں بھی کرتا رہا۔

جب وہ درگاہ کے سامنے پہنچا تو اس کی نظر رفیق ونو پر پڑی۔ رفیق نے قریب آ کر ہاتھ ملایا۔ وہ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ عبدالعزیز نے سبب پوچھا تو اس نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ بازار سے جلدی جلدی میں آیا ہوں۔ دیر ہوگئی تھی۔''

''ترے کو معلوم ہے عروس ہے، تو بازار میں رُکنے کی کیا ضرورت تھی۔ ۔ ۔'' عبدالعزیز نے کہا۔

''تو پہلے ان کو گھما پھیرا لے۔ پھر آرام سے میں تجھے رام کہانی سناؤں گا''۔ ۔ ۔ رفیق نے عارفہ کے بالوں میں انگلیاں ڈالتے ہوئے کہا۔

''مطلب کہیں جا رہا ہے تو؟''

''گھر جا کر تھوڑی دیر بعد آؤں گا۔''

ٹھیک ہے۔ عشاء بعد ملتے ہیں۔

چل ٹھیک ہے۔

۱۳
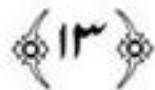
عبدالعزیز نے عارفہ اور سلیم کو ان کی پسندیدہ چیزیں کھلائیں۔ کچھ دیر یہاں وہاں گھمایا۔ پھر گھر لوٹ آئے۔

گھر لوٹ کر اپنی ماں اور چچی کو اپنے اپنے کھلونے بتاتے رہے۔ مہرون نے کھانے کی تیاری کی۔ [وقار حسین اور حمید حسین صندل وغیرہ کی تیاری میں جٹے لوگوں کی مدد کے لئے پہلے ہی کھانا کھا کر چلے گئے تھے] عبدالعزیز نے بھوک نہ ہونے کے باوجود ماں کا دل رکھنے کے لئے تھوڑا سا کھانا کھایا۔ اس پر میٹھے چاول کی ایک رکابی مہرون نے اس کے سامنے رکھ دی۔ بچپن میں وہ میٹھے کھانے کی ضد کیا کرتا تھا۔ شاید اس بات کو دھیان میں رکھتے ہوئے مہرون نے آج بنایا تھا۔ اس نے رکابی صاف کرتے ہوئے تعریف کی۔ مہرون کو اچھا لگا۔

ایک ٹارچ ہاتھ میں لے کر وہ گھر سے نکل گیا۔گلی سے نکل کر وہ سڑک پر آیا۔ لیمپ پوسٹ کی زرد مٹیالی روشنی کا ہالہ بنانے والے چھوٹے بلب برہنہ ٹنگے ہوئے تھے۔ جن کی روشنی میں سفر کرنا پہلے کی نسبت آسان ہو گیا تھا۔ مسجد کے احاطے تک پہنچنے میں اسے بہ مشکل دس منٹ لگے ہوں۔

اس دوران اطراف کے تیس پنتیس مکانوں پر اس نے ایک اُچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ وہ حیران تھا کہ ان میں سے بیشتر مکانوں میں روشنی گل تھی۔

پہلے عرس کے دنوں میں ہر گھر روشنیوں، دیوں اور شمعوں سے منور رہتا تھا۔لوگ دروازے کھلے رکھتے تھے۔ آوازیں ہوا میں بہتی رہتی تھیں۔ جس سے اکیلے سفر کرنے والے کی ہمت بندھی رہتی تھی۔ تاریک اور بے نور راتیں بھی چہل پہل سے خوب صورت لگتی تھیں۔

حالانکہ اب تو بجلی بھی آ گئی تھی۔ عام دنوں میں دروازے کے باہر چالیس واٹ کا بلب سانس لیا کرتا تھا۔آج وہ بھی خاموش تھا۔

﴿۱۴﴾
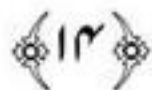
درگاہ کے پاس ہی اسے رفیق ونو مل گیا۔ دونوں گانو کے قبرستان کی طرف نکل گئے۔ رفیق نے اسے میٹھا پان پیش کیا اور خود ایک سو بیس تمباکو والا پان کھایا۔قبرستان کی دیوار کے پاس ٹیوب لائٹ کی مدھم روشنی میں بیٹھ کر وہ جانے پہچانے لوگوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ رفیق نے اپنے دو تین چھوٹے چھوٹے معشقوں کے بارے میں اسے بتایا۔ مراٹھی میں ایک نظم سنائی جو اس کی ایک معشوقہ نے اسے خط میں لکھ بھیجی تھی۔

پھر عبدالعزیز نے پوچھا۔ ''تو کچھ بتانے والا تھا؟''

''کیا بتاؤں یار...... اپلیس ہونٹ انی اپلیس دانت'' (اپنے ہی ہونٹ اپنے ہی دانت)

رفیق ونو نے افسوس کے ساتھ کہا۔

''ایسی کیا بات ہے؟''

پان کی آخری پیک تھوکتے ہوئے رفیق ونو نے اسے بتایا کہ کچھ لوگ عرس کے سخت مخالف ہیں۔ ان میں سے بعض بازار میں عرس کو حرام بتا رہے تھے۔ وہیں ایسے افراد بھی آگے جو درگاہ اور بزرگوں کے سلسلے سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ بحث ہوئی اور بات یہاں تک بڑی کے فریقین نے ایک دوسرے کا گریبان پکڑلیا۔ ذاتیات پر اتر گئے۔ بیچ بچاؤ نہ ہوتا تو بُری نوبت آتی۔

یہ سن کر عبدالعزیز بری طرح کنفیوژ تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ کس بناء پر برسوں سے جاری عرس کو حرام قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس نے انتہائی طفلانہ سوالات اس ضمن میں کئے۔ جن کے جوابات رفیق ونو نے اطمینان بخش انداز میں دیے۔ اسے معلوم نہ تھا اس کا مذہب کس طرح فرقوں میں بٹا ہوا ہے اور لوگ فرقے کی محبت میں ایک دوسرے کو قتل تک کر سکتے ہیں۔ اسے بہت رنج ہوا۔

رفیق ونو نے اس کا موڈ بدلنے کے لئے اس سے چپلون کے بارے میں پوچھا۔ پھر وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ عرس کے میلے میں دوبارہ آئے۔ وہاں گرم گرم رگڑا کھایا۔ اسی دوران رشید اور صابر بھی وہاں پہنچ گئے۔ تینوں دیر رات تک ایک طرف کھڑے رہ کر خوب باتیں کرتے رہے۔ آتے جاتے لوگوں سے ملتے رہے۔

اس رات کسی کو معلوم نہ تھا کہ اگلے عرس پر وہابی اور بریلوی حضرات میں شدید کشیدگی ہونے والی تھی اور ٹھیک چار سال بعد جماعتی افراد کے غلبے سے درگاہ کے اندر بنے مزار کو مسمار کیا جانے والا تھا۔ جس کے خلاف عبدالعزیز ایک تحریک چلانے کے لئے مجبور ہونے والا تھا۔ پمفلٹ تقسیم کرنے والا تھا۔ پولس کو اس واقعے کی تحقیقات کے لئے راضی کرنے والا تھا۔ اس پوری تحریک سے بس اتنا فائدہ ہوا کہ جن

لوگوں نے مزار کو توڑا تھا۔ انہوں نے پوری درگاہ کو منہدم کرنے کی جسارت نہیں کی۔

عبدالعزیز درگاہ کے انہدام کو روکنے میں کامیاب ضرور ہوا لیکن بڑے خسارے کو روک نہیں سکا۔ جماعت کے پرچار نے عرس کو غیر اسلامی فعل اور بدعت قرار دیا۔ نتیجتاً عرس کا میلہ بند ہو گیا۔ درگاہ ویران ہو گئی۔ چند برساتوں کے بعد اس کی چھت کا بڑا حصّہ ٹوٹ گیا۔ گانو والوں سے تعلقات استوار رکھنے کے لئے کسی نے اسے دوبارہ تعمیر کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

نئی نسل کو یہ احساس کبھی نہ ہو سکے گا کہ عرس کے خاتمے کے ساتھ ساتھ تہذیبی ہم آہنگی کا کتنا بڑا اسٹیج جل کر خاک ہو گیا۔ عبدالعزیز نے ''ثقافت کی موت'' کے عنوان سے مراٹھی روزنامے کے لئے ایک مضمون لکھا۔ جس میں اس نے درگاہ کی بدحالی اور عرس کے خاتمے سے پیدا ہونے والی صورت حال کو تفصیل سے بیان کیا۔ اس مضمون کو وہابی افراد نے ایک سازش قرار دیا۔ ایک صاحب نے بعد میں اس کا ترجمہ اردو میں کر کے یوسف کو پیش کیا۔ جس نے درگاہوں کو بدعت کی ماں قرار دیا تھا۔

باب نہم:

کہیں کہیں پہ کوئی روشنی کا دھبا تھا

شریفہ جب عبدالعزیز کو رخصت کرنے ایس ٹی اسٹینڈ پر گئی تھی، تب اس نے کہا تھا کہ اتوار کی صبح وہ اس کے گاؤں اس کے گھر والوں سے ملاقات کے لئے آئے گی۔

عبدالعزیز نے بازار جا کر ایس۔ ٹی۔ ڈی بوتھ سے اسے فون لگایا۔ شریفہ سے بات کرنے کے بعد اس نے ایک بیکری سے بسکٹ خریدے اور فوراً گھر لوٹ آیا۔

ماں کو اس نے بتایا کہ شریفہ دوپہر تک آنے والی ہے۔ مہرون نے اکثر اس کا ذکر سنا تھا مگر ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ شریفہ کو دیکھنے کا اسے اشتیاق تھا۔

عبدالعزیز نے جب مہرون سے کہا کہ دوپہر کے کھانے کا خاص اہتمام کیا جائے تو اس نے بڑی متعجب نگاہوں سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ عبدالعزیز کو ماں کے بھول پن پر ہنسی آئی۔ اس کی ہنسی کو مہرون نے ایک مفہوم دیا۔ ایک ایسا مفہوم جس کا خاکہ

عبدالعزیز کے ذہن میں کبھی تیار نہیں ہوا تھا۔ مہرون نے شمیم کو بازار بھیجا اور خود مسالحہ پیسنے بیٹھ گئی۔

اس دوارن عبدالعزیز نے سلیم کے بستے سے اس کی اردو کی درسی کتاب نکالی اور ایک کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے بہت سارے اوراق پلٹے۔ جوں جوں وہ صفحے اُلٹتا گیا۔ اسے ایسا لگنے لگا اس زبان کو پڑھنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے جو مشق اسے عربی سیکھنے کے لئے کرنا پڑی تھی، اس کا دس فی صدی حصّہ بھی درکار نہ تھا۔ اس زبان کے الفاظ اس کے لئے غیر مانوس نہ تھے۔ آوازوں کی ساخت اس کے لئے دشوار نہ تھی۔ ایک طرح کی خوشی اس کے چہرے پر چھائی۔

اس نے ارادہ کرلیا کہ وہ آج ہی بازار سے میٹرک تک کی تمام نصابی کتابیں خرید کر لائے گا اور مطالعہ کرے گا۔ جہاں دشواری پیش آئے گی وہاں اسکول کے کسی اردو معلم سے مدد لے گا۔

شریفہ سے بات چیت کے دوران اسے یہ احساس ہوگیا تھا کہ زبان، ادب اور زبان کے مذہبی اور سیاسی کرن کے موضوعات پر گفتگو کرنے کے لئے زبان کی تاریخ پر نظر بے حد ضروری ہے۔ اردو زبان کے بارے میں گذشتہ کئی برسوں سے اس کے دل میں ایک بات بیٹھ گئی تھی کہ اردو میں عام طور پر مذہبی امور پر ہی زور دیا جاتا ہے اور اس کی ساخت پر مذہب کا اثر زیادہ ہے۔ اسے لگتا تھا کہ اردو ایک استحصالی زبان ہے جو اپنے آپ کو مقامی دھاروں کے ساتھ ہم آہنگی نہیں کرسکتی۔ اس لئے مقامی کلچر کی اس میں کوئی گنجائش نہیں رہتی ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اردو کی اصلیت کیا ہے۔ اور آج اس کی حالت کیا ہے۔ ان سب پر سیر حاصل معلومات کے لئے بہتر تھا کہ وہ خود اردو اخبارات اور کتابوں کو پڑھنے کی لیاقت حاصل کرے۔

عبدالعزیز کی اس ذہنی حالت پر زیادہ حیرت کا اظہار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ وہ

دن تھے جب اردو کے سماجی اور تعلیمی استعمال پر مذہبی سایہ پھیلنے لگا تھا۔ اردو کا کثیرالمشربی، آزاد، جمہوری، غیر مذہبی، روادارانہ اور انسانی کردار مشتبہ ہونے لگا تھا۔

﴿۲﴾

ابھی وہ اس کتاب کے اوراق پلٹ ہی رہا تھا کہ امام صاحب نے دروازے پر دستک دی۔ اس نے ماں کو آواز دے کر بتایا اور ان کے لئے ایک کرسی پیش کی۔ امام صاحب نے مصافحہ کیا اور اس کی خیریت دریافت کی۔ مہرون نے چائے بنا کر سلیم کے ہاتھوں بھجوائی۔ جو ابھی ابھی لمبی نیند سے بیدار ہوا تھا۔

چائے ٹیبل پر رکھ کر سلیم فوراً اندر بھاگ گیا۔

دوبارہ وہ واپس آیا اس کے سر پر گھیرے دار سیاہ رنگ ٹوپی تھی۔ اس نے دوبارہ ٹیبل پر سے کپ اٹھایا اور آگے بڑھ کر امام صاحب کے ہاتھوں میں دیا۔ امام صاحب نے مسکراتے ہوئے کپ اس کے ہاتھوں سے لیا اور کہا ''نیند سے جاگتے ہی ٹوپی پہن لینا چاہے۔''

''جی جی امام صاحب۔۔۔'' اتنا کہہ کر وہ پڑی میں چلا گیا۔

عبدالعزیز چپ چاپ بیٹھا رہا۔ امام نے اس کے زانوں پر درسی کتاب دیکھی تو سوال کیا ''تم اردو پڑھ لیتے ہو۔''

''نہیں! میری تعلیم مراٹھی میڈیم سے ہوئی ہے۔''

''تو کیا تصویریں دیکھ رہے تھے۔'' امام صاحب نے مسکرا کر پوچھا۔

''نہیں سوچ رہا ہوں اردو سیکھ لوں۔''

''بہت اچھی بات ہے بھئی! ہائے! اپنی زبان پھر اپنی زبان ہے۔''

''میری مادری زبان کوکنی ہے۔''

''بھئی کوکنی تو اب میں بھی بول لیتا ہوں پر مراٹھی تو خالص ہندوؤں کی بھاشا ہے نا''

امام صاحب نے کہا جنھیں کوکن میں بسے ہوئے قریب پندرہ سال ہو گئے تھے۔
''کوکنی اور مراٹھی بے حد قریب ہیں بلکہ مراٹھی سے ہی کوکنی کا وجود ہے۔''
عبدالعزیز نے اپنا موقف پیش کیا

''درست فرمایا بیٹا۔ ۔ ۔ پر کوکنی تو صرف بولی ہے نا! اس کا کوئی تحریری وجود تو نہیں۔'' امام صاحب نے کپ فرش پر رکھتے ہوئے کہا۔ عبدالعزیز کو لگا امام صاحب 'بولی' کہہ کر اس پر رعب جمانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

''ساری زبانیں تحریری وجود سے پہلے بولی ہی ہوا کرتی ہیں۔ تحریر کے لئے کسی بھی رسم الخط کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔'' اس بار اس کے لہجے میں تھوڑی تلخی تھی۔ امام صاحب کو احساس نہیں تھا کہ زبان کے مسئلے پر گفتگو سنجیدہ ہو جائے گی۔ انھوں نے موضوع بدلنے کے لئے کہا۔ ''ارے بھئی چھوڑئے اس بحث کو، یوں بھی لا یعنی باتوں سے مومن کو پرہیز کرنا چاہیے۔''

عبدالعزیز خاموش رہا۔

''چار پانچ روز ہوئے تم کو آ کر...... تم مسجد میں نہیں آئے۔ اس لئے سوچا خیریت دریافت کر لوں۔''

''بہت بہت شکریہ امام صاحب! میں تو واقعی آپ سے ملنا بھول گیا......''

''ارے بھئی ...... مجھے بھول جاؤ پر اللہ کے گھر آنا مت بھولو۔''

عبدالعزیز خاموش رہا۔

''وہاں کویت میں تو دین کے کام کو قریب سے دیکھا ہوگا...... عمرہ کیا......؟''

''نہیں۔ ۔''

''ارے بھئی مقدس زمین کے اتنے قریب جا کر بھی......'

''کویت سے سعودی بہت دور ہے۔''

''اس قدر تو دور نہیں......''

''ہاں......وہ تو ہے۔''

''اب جاؤ گے تو سیدھے حج ہی کر لینا۔'' امام صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ان کے اٹھتے ہی عبدالعزیز بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھے تو عبدالعزیز انھیں رخصت کرنے دروازے تک گیا۔ چپّل پہننے کے بعد امام صاحب نے دوبارہ عبدالعزیز سے مصافحہ کیا اور کہا۔ ''بھئی دنیا کی زندگی کیا ہے۔ جتنا ہو سکے نماز کی پابندی کرو۔''

عبدالعزیز نے امام صاحب کی آنکھوں میں جھانکا۔ ایک مسکراہٹ اس کے چہرے پر ابھری۔ امام صاحب سڑک کی طرف بڑھنے لگے۔ اس کے گرد ہانکا لگنے کی یہ پہلی علامت تھی۔

چند منٹوں تک کرسی پر بیٹھ کر وہ اسی بات پر غور کرتا رہا۔ مہرون نے پڑی سے آواز لگائی۔ ''بیٹا۔۔! مہمان، کولا نے بازار تک نہیں جائے گا۔'' ''ہاں ہاں......'' خیالات کے بھنور سے خود کو باہر نکالتے ہوئے اس نے کہا۔ اسے ایسا لگا وہ بہت تھک گیا ہے۔ چند لمحوں کے لئے اس نے اپنی پلکیں بند کر لیں۔ پھر وہ اٹھ کر موری میں گیا۔ ٹھنڈے پانی سے ہاتھ منہ دھویا۔ کپڑے بدلے اور بازار کی طرف نکل گیا۔

۳

بازار میں وہ لب سڑک کھڑا رہا۔ دو تین پرائیوٹ گاڑیاں چپلون سے ہو کر آئیں مگر ان میں شریفہ نہیں تھی۔ سڑک کچی تھی اس لئے گاڑی کے آتے ہی سرخ مٹی کا بادل اٹھتا اور دیر تک فضا میں گلال بکھیر دیتا۔ عبدالعزیز نے سوچا بہتر یہی ہے کہ دس پندرہ قدم پیچھے ہو کر برگد کے پیڑ کے سائے میں کھڑے ہو کر انتظار کرے۔

یہ پیڑ بہت پرانا تھا۔ اسکول کے دنوں میں وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کی چھاؤں میں بیٹھ کر شرارتوں کے منصوبے بنایا کرتا تھا۔ اسکول سے غیر حاضر رہنے کے بہانے بنایا کرتا تھا۔

اس نے دیکھا بازار میں چلتے پھرتے لوگوں کے ملبوسات، چہرے مہرے اور بول چال میں بڑی یکسانیت نظر آ رہی ہے۔ جس طرف وہ دیکھ رہا تھا۔ وہاں مسلمانوں کی دکانیں تھیں۔

آج برگد کے نیچے کھڑے رہ کر اس نے ماضی کے جھروکے سے اس کے بچپن کے دنوں کے بازار کو دیکھنا چاہا۔ لوگوں کی زندگی میں بے شمار رنگ تھے۔ سر پر گاندھی ٹوپیاں تھیں، گلابی پگڑیاں تھیں، داڑھیاں تھیں، بڑی مونچھیں تھیں، لمبے کرتے تھے، بنیان پہنے غریب لوگ تھے، دلت تھے، دھوتی پہنے کسان تھے، میلے گندے حمّال تھے، بھانت بھانت کے لوگ تھے، ہندو مسلمان عورتوں میں کوئی تخصیص نہ تھی۔ ساڑیاں، بلاؤز، چولیاں ہی عورتوں کا لباس تھا۔ مسلمان عورتیں منگل سوتر، پائل اور نتھ کا استعمال کیا کرتی تھیں۔ مسلمان اور ہندو مردوں کے لباس میں خاص فرق نہیں تھا۔ بول چال میں فرق نہیں تھا۔ گالیاں، لطیفے اور قصّے ایک جیسے تھے۔

لیکن آج اسے بڑی ندامت تھی۔ اب اس کے گانو اور آس پاس کے گانوں کا بڑا طبقہ سفید کرتا پائجامہ پہنے، ٹوپی اوڑھے، داڑھی میں نظر آ رہا تھا۔ مسلمان عورتیں کالے برقعوں میں چل پھر رہی تھیں۔ اب ہندو اور مسلمان لباس سے پہچانے جا سکتے تھے۔ پہلے ایسی تفریق کرنا محال تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ لوگ پہلے دین دار نہیں تھے۔ خدا کا ڈر اور ایمان پہلے بھی دلوں میں تھا۔

''اس وقت ایمان نے اظہار کے غیر باطنی عناصر اختیار نہیں کیے تھے۔'' عبدالعزیز کے دل میں یہ خیال آیا اور اسی کے ساتھ وہ سوچ کی موجِ رواں پر بہتا چلا گیا، گویا وہ

انسان نہیں ایک تنکا ہو۔

وہ خود سے پوچھنے لگا اس کے غیر مسلم دوست ملیں گے تو کس قسم کے سوالات اس سے کریں گے۔ ان تبدیلیوں کے بارے میں وہ انھیں کیا جوابات دے گا۔ پھر اس نے سوچا اگر وہ خود برہمن یا دلت یا ادی واسی ہوتا تو اس طرح مقامی کلچر سے کٹ کر بالکل ہی غیر مانوس حلیے میں دوسروں کو دیکھتا تو ان کے بارے میں اس کا کیا تاثر ہوتا۔ اس کا ردّعمل کیا ہوتا۔

بہت دیر تک وہ سوچتا رہا۔ اس کے پاس سوالات تھے۔ جن کے جوابوں سے وہ محروم تھا۔ آگے چل کر بہت ساری تبدیلیاں، بہت ساری تقریریں، بہت سارے فتوے اس کے سامنے آنے والے تھے۔ جو صرف اسے سوالات کے مزید ہولناک بھنور میں پھینکنے والے تھے۔ ان کے جوابات نہ اس کے پاس تھے نہ کسی اور کے پاس۔

ان تبدیلیوں کے بارے میں وہ جب بھی سوچتا وہ خود کو بہت اکیلا اور تنہا محسوس کرتا۔ رفیق ونو کے علاوہ اس کا کوئی ہم خیال نہ تھا۔ ان موضوعات پر وہ سکینہ سے تبادلۂ خیال نہیں کرتا تھا۔

ایک ایسا دن بھی آگے چل کر آیا جب اسے احساس ہوا کہ مسلمان تو وہ بھی ہے مگر اتنا زیادہ مسلمان نہیں کہ دوسرے اسے قبول کریں۔

''کہاں کھوئے ہو عزیز۔۔۔'' چٹکی بجا کر شریفہ نے کہا۔ سوچ کی موجِ رواں سے وہ ابھرا۔ لیکن سطحِ آب پر وہ بہت بے وزن تھا۔

''ارے......I was waiting......'' اس کی زبان سے ادا ہوا۔

''وہ تو مجھے معلوم ہے، پر۔۔ ایس ٹی سے اتر کر راستہ پار کر کے میں یہاں تک آئی پر تمہارا دھیان......''

''بس یوں ہی۔۔۔ کم بخت کیا کیا خیالات آتے رہتے ہیں۔''

''تم بہت زیادہ سوچنے لگے ہو۔Thatsverybad''

''Icanthelpitout''

''Youshould,dear''

وہ بازار سے نکل کر پہاڑی راستے سے گاؤں کی طرف جانے لگے۔عبدالعزیز نے تفصیل سے بتایا کہ وہ کن باتوں پر ایکا یک سوچنے لگ گیا تھا۔شریفہ غور سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ جب وہ اپنی بات کہہ چکا تو شریفہ نے کہا''Itisasocialprocess اسے کوئی روک نہیں پائے گا۔ یہ Revivalofrelics ہے، جسے بنیاد پرست جڑوں کی طرف واپسی کہتے ہیں۔ یہ ایک phase ہے۔اپنے ساتھ بہت ساری تباہی لا کر گزر جائے گا۔

" We can not stop it."

"Whycan'twe?"

"Becouseitsamadness."

پھر دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔ گھنے پیڑوں کے درمیان سے وہ گزر رہے تھے۔عبدالعزیز کو ایسا لگا اس کے پیچھے پیچھے سارے درخت چلے آرہے ہیں۔سارے پیڑ اس سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ وہ ٹھہر گیا۔اسے ایسا لگا سارا جنگل ٹھہر گیا ہے۔ وہ مڑا......اس نے ایک نظر درختوں کو دیکھا۔ ہر پیڑ اپنی جگہ کھڑا تھا۔ وہ پھر سے چلنے لگا......اسے ایسا لگا اس کے مڑتے ہی پیڑوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانا شروع کر دیا ہے۔

ایک روز یہی منظر اس نے اپنے خواب میں دیکھا۔مگر اس خواب میں پیڑوں نے سفید کفن اوڑھ لیا تھا۔ان کی شاخیں لمبے ہاتھوں میں بدل گئی تھیں۔جن میں سعودی عرب کی سبز رنگ تسبیحیں تھیں۔ جو اندھیرے میں چمکتی ہیں۔ پھر ایکا یک وہ جیتے

جاگتے انسانوں میں بدل گئے۔ ان آنکھوں میں زرد آگ کے شعلے تھے اور بعض کے ہاتھوں میں ''الجہاد فی الاسلام وقصاص الاخراء'' نامی ایک کتاب تھی۔ سارے جنگل پر ان کا راج تھا۔ چھوٹے چھوٹے پیڑ پودے جوان کے سائے میں تھے۔ وہ بے بس تھے۔ بعض ڈر سے بعض مجبوری سے، بعض احساس کمتری میں ان کی کامرانی کے لئے ترانے گا رہے تھے۔

یہ خواب ادھورا ہی رہا۔ اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اسے بہت ملال ہوا کہ اس نے اس خواب کا انجام کیوں نہیں دیکھا۔ دوسری صبح وہ ڈاکٹر کے پاس اپنا بلڈ پریشر چیک کرانے گیا۔ ڈاکٹر نے یہاں وہاں کے سوالات کئے تو عبدالعزیز نے اسے یہ خواب بتایا۔ ڈاکٹر نے ایک موٹی سی کتاب نکالی۔ اس میں دیر تک کچھ حصوں کو پڑھتا رہا۔ پھر کہا۔ ''یہ خواب نہیں تمہارے دل کا ڈر ہے۔''

''ڈر خواب میں کیوں بدلتا ہے؟'' اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''Because we keep thinking about'' ڈاکٹر نے کہا۔ اس کی طرف سنجیدگی سے دیکھا اور پھر کہا ''Please تم زیادہ مت سوچا کرو۔''

''I will try my best sir'' اس نے ڈاکٹر سے کہہ تو دیا لیکن اس کے باوجود اس طرح کے خواب اسے اکثر و بیشتر پریشان کرتے رہے۔

❁

وہ گھر میں داخل ہوا۔ مہرون نے شریفہ سے ہاتھ ملایا۔ اسے سینے سے لگایا۔ پھر دونوں پڑی میں چلی گئیں۔ عبدالعزیز وٹے دار کے آنگن میں سلیم کی سائیکل کی اتری ہوئی چین چڑھانے میں جٹ گیا۔

❁

کھانا کھانے کے بعد بہت دیر تک وہ بات چیت کرتے رہے۔ شریفہ کو یہ پڑی

یاد تھی۔ اس نے شمیم کو بتایا کہ اس کی شادی کے وقت وہ یہاں آئی تھی۔ اس رات کی بہت ساری باتیں اسے یاد آئیں۔ خاص کر عبدالعزیز کا اپنے ٹیچروں کا مذاق اڑانا۔ اسے عبدالعزیز کا قہقے لگا کر ہنسنا یاد آیا جسے پھر اس نے کالج کی ملاقاتوں میں کبھی نہیں دیکھا۔

﴿۴﴾

چار بجے شمیم نے چائے بنائی۔ تین پلیٹوں میں بسکٹ ایک میں میٹھی کے لڈّ و اور ایک میں حلوہ پیش کیا گیا۔ شریفہ نے بہ مشکل ایک لڈّ و کھایا۔

چائے پینے کے بعد وہ گھر سے نکلے۔

عبدالعزیز اسے سکینہ کے گھر لے گیا۔ اس نے پہلے ہی سکینہ کو بتا رکھا تھا کہ اتوار کی شام کو وہ شریفہ کو اس سے ملانے کے لئے لانے والا ہے۔ چوں کہ شریفہ کا ذکر وہ اکثر کیا کرتا تھا اس لئے سکینہ بھی چاہتی تھی کہ اس سے ملاقات کرے۔

﴿۵﴾

سکینہ نے شریفہ کی بہت خاطر داری کی۔ دونوں میں کہیں کسی تلخی کا نام ونشان نہ تھا۔ سکینہ نے شریفہ سے کالج کے دنوں کے بارے میں بہت ساری باتیں پوچھیں۔ یقیناً ان میں سے بیشتر کا تعلق عبدالعزیز سے تھا۔ چالیس منٹ کی اس بات چیت نے سکینہ کے دل میں شریفہ کے لئے ایک خاص مقام بنا دیا۔ شاید یہی سبب تھا کہ چند روز بعد اس نے عبدالعزیز سے کہا۔ ''شریفہ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟''

''میں نے اسے بتا دیا ہے کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔'' عبدالعزیز نے دوٹوک جواب دیا۔ جسے سن کر سکینہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک لڑی شروع ہو گئی تھی۔ اس شام وہ بہت دیر تک عبدالعزیز کی بانہوں میں باہیں ڈالے روتی رہی۔ اور ایسا پہلی بار تھا کہ سکینہ کو رونے کا سبب بھی پتہ نہ تھا۔ عبدالعزیز جانتا تھا ''رونے سے نفس کی تطہیر ہوتی

ہے۔''اس لئے اس نے روکا بھی نہیں۔

اس شام کے بعد سکینہ نے اسے کبھی شادی کا مشورہ نہیں دیا۔

﴿٦﴾

شریفہ کو رخصت کرنے کے لئے سکینہ بھی گاؤں کے آخری چھور تک آئی تھی۔ گلے مل کر آئندہ ملاقات کا وعدہ بھی کیا۔

سورج درختوں کی آڑ میں کھڑے ہو کر اپنی گلابی شعاعیں ان کے چہروں پر پھیلانے لگا۔ تب عبدالعزیز نے کہا۔''اب دیر نہیں کرنا چاہیے ورنہ پھر ایس ٹی وغیرہ پکڑنے میں دشواری ہوگی۔''

سکینہ ان دونوں کو ڈھلوان سے نیچے درختوں کے درمیان گزرتے ہوئے دیکھتی رہی۔

وہ جوں ہی ایس ٹی اسٹینڈ پر پہنچے، بس چلنے ہی والی تھی۔ شریفہ فوراً سوار ہوگئی۔ بس آگے بڑھنے لگی تو پیچھے سرخ غبار پھیلا۔ شریفہ نے کھڑکی سے ہاتھ ہلا کر اسے بائے کہا۔ لال مٹی کے دھوئیں میں منظر دھندلا گیا۔

❁

اپنے ساتھیوں کو ایس ٹی میں بٹھانے کے بعد یوسف سیدھے مدرسے گیا۔ ان کے سامان کو بیت الخلاء پر بنے چبوترے پر ڈال کر اس پر ایک پرانی چادر ڈال دی۔ پھر کچھ دیر درس و تدریس کا معائنہ کرنے کے بعد وہ گھر کے لئے نکلا۔

اس کا گھر مدرسے سے پندرہ منٹ سے زیادہ دوری پر نہ تھا۔ لیکن اس شب اس کے قدم زمین پر اٹھنے کی بجائے رینگ رہے تھے۔ اس کی رفتار ہزاروں گناہ کم ہوگئی تھی۔ اس نے جیب سے رومال نکالا۔ چہرے پر آیا پسینہ پونچھا۔ یہ پسینہ گرمی سے نہیں بلکہ اس کے خاکداں میں جاری زلزال کے سبب تھا۔

پچھلے ایک مہینے سے وہ غم گیں تھا۔ اداسی کی ایک موج اس کے سینے میں رہ رہ کر اپنا سر پٹک رہی تھی۔ اسے نرگسیت اور اقتدار کے حصول کے باوجود ساری دنیا بے معنی لگنے لگی تھی۔ اس کے دل میں بھنور سے بننے لگے تھے۔ جو دل کے دورے کا سبب بھی بن سکتے تھے۔ اس کے دماغ میں تشنج کے تاروں کا کرنٹ لگنے لگا تھا۔ جس کے سبب کئی بار اسے ایسا لگا۔۔۔ کہیں وہ نسیان کے مرض میں مبتلا تو نہیں ہو رہا ہے۔ ہوتا یہ تھا کہ جن باتوں کو وہ یاد کرنا چاہتا ان کی بجائے غیر ضروری باتیں اس کے دماغ میں ایک ساتھ اسکرین پر آ جاتیں اور وہ کنفیوژ ہو جاتا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ ہالے بن گئے تھے۔ شاید اس نے کوئی ایسا منظر دیکھا تھا جو اس کی روح پر بوجھ بن گیا اور بوجھ کے اس جھولے سے بوسیدہ برادہ اس کے بدن میں پھیل گیا تھا۔ اس برادے سے ہزاروں لاکھوں کیڑے مکوڑے نکلے اور اسے برادے میں بدلنے لگ گئے تھے۔

پہلے وہ بیگانگی کا شکار ہوا جس سے ایک خلش اس کے اندر پیدا ہوئی۔ یہ خلش بڑھتی گئی اور افسردگی تنہائی میں بدل گئی۔ کاش اس نے عبدالعزیز کو سکینہ کے ساتھ اس کے نانا کی حویلی میں داخل ہوتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا۔

﴿۲﴾

اس نے اندرونی کیفیت کو چہرے پر اجاگر ہونے سے روکنے کی بہت کوشش کی۔ خاص کر اپنے طلبہ کے درمیان ...... لیکن جوں ہی وہ ایکانت میں چلا جاتا اس کا بدن اسے کاٹنے لگتا۔ اسے ایسا لگتا فضا میں زہر گھل گیا ہے۔ اس کے اردگرد بکھری کتابیں ،الماریوں میں قید صحیفے اسے دیکھ کر اس کا تمسخر اڑاتے۔ اسے واقعی ان کے قہقہے سنائی دینے لگے تھے۔ اسے یوں لگتا ساری جلد بند کتابوں میں سے سیاہ رنگ الفاظ آزاد ہو کر اس کے اطراف رقص کر رہے ہیں۔ گویا کسی غیر مہذب قبیلے نے برسوں سے جاری جنگ جیت لی ہو۔ وہ خود کو مفتوح قبیلے کا مجروح و مقید سپاہی سمجھنے لگا تھا۔ ہر شئے

اس کی تحقیر میں اضافہ کیئے دیتی تھی۔

''انسان کے لئے سب سے اذیت ناک لمحہ وہ ہوتا ہے جب اسے یہ احساس ہو......وہ، جو وہ ہے......وہ......وہ نہیں ہے۔''

یہ احساس آدمی کو اس کی ذات سے کاٹ دیتا ہے۔ یوسف بھی اس حالت میں مبتلا تھا۔

﴿۳﴾

وہ گھر کی طرف بڑھنے لگا تو عبدالعزیز کا چہرہ اس کی آنکھوں میں دوبارہ لوٹ آیا۔

اس کے ساتھیوں نے اسے انرون آندولن کے ایک جلسے سے بے وقوف بنا کر پہلے سے طے شدہ مقام پر لایا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی تینوں نے اس کے منہ پر ایک چادر ڈال کر رسی سے اسے باندھ دیا تھا۔ پھر اُٹھا کر جنگل میں گھس گئے تھے۔

یوسف حیران تھا۔ عبدالعزیز نے بالکل مزاحمت نہیں کی تھی۔ بلکہ یوسف کو دیکھ کر وہ مسکرایا تھا۔

﴿۴﴾

گھنے جنگل میں پہنچنے کے بعد اسے زمین پر لٹایا گیا۔ چادر نکال کر صرف چہرے پر ایک چھوٹی سی گونی ڈال دی گئی۔ اس وقت بھی اس نے کوئی فریاد نہیں کی۔ چیخ وپکار نہیں کی...... کسی طرح کا کوئی احتجاج نہیں کیا۔ وہ خاموش رہا۔

جب یوسف کے اشارے پر اس پر پہلا وار کیا گیا البتہ اس وقت اس کی حلق سے ایک دل دوز چیخ نکلی............ '''اللہ''''

دونوں ساتھیوں نے ہڑ بڑا کر یوسف کی جانب دیکھا۔ یوسف نے خنجر اپنے ہاتھ میں لیا۔

درختوں نے کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔ پرندوں نے اپنے بچوں پر اپنے پر

پھیلائے تا کہ وہ کسی بات کے گواہ نہ بنیں۔ دو ہرن جو کچھ دوری پر گھاس چر رہے تھے وہ ہوا کے دوش پر جنگل کے دوسرے سرے پر پہنچ گئے۔ نانیٹیو [سانپ کی ایک قسم ہے جو عام طور پر سات یا پانچ ایک ساتھ نکلتے ہیں] وہیں قریب سے گزر رہے تھے۔ ڈر گئے۔ سراسیمگی میں جہاں جھاڑیاں نظر آئی۔ اس طرف لپکے۔ ان کا ایک ساتھی اس افراتفری میں کہیں چھوٹ گیا۔ جسے بعد میں انھوں نے بہت تلاش کیا پر وہ نہیں ملا۔

یوسف نے خنجر ہاتھ میں لیا۔ وہ انتظار کرتا رہا کہ عبدالعزیز معافی طلب کرے گا۔ اس حملے کا سبب پوچھے گا۔ قسمیں کھائے گا۔ اسکے ہاتھ پیر جوڑے گا۔ اس سے زندگی کی بھیک مانگے گا۔

پر ایسا نہ ہوا۔

عبدالعزیز خاموش رہا۔ خون اس کے پیٹ سے بہہ رہا تھا۔ اس نے ایک بار اپنی گردن ہلائی۔ شاید سانس لینے میں اسے دشواری ہو رہی تھی۔ یوسف کو ایسا لگا اب وہ کچھ کہے گا۔

پر ایسا نہ ہوا۔

یوسف کی نفرت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا مرنے والا احساس گناہ میں مبتلا ہو۔ اپنے گناہوں کا اعتراف کرے۔ معافی مانگے۔ گڑگڑائے روئے۔ چلائے۔

پر ایسا نہ ہوا۔

یوسف نے غصّے سے عبدالعزیز کے سر پر لات ماری اور کہا۔ ''کافروں کی وکالت کرتا ہے...... پردے کی مخالفت کرتا ہے۔ ناچ گانے کو کلچر کہہ کر اس کی حمایت کرتا ہے۔ دنیاوی تعلیم پر لوگوں کو اُکساتا ہے۔'' اس کے جملوں اور منشا میں کوئی ربط نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا یہ جملے وہ اپنے ساتھیوں کو سنانے کے لئے ادا کر رہا تھا۔ اس کے دل پر کسی زیادہ گہرے صدمے کا اثر تھا۔ جس کے وزن سے ان الفاظ کی تاثیر مفقود ہوگئی

تھی۔ شاید اس کے دماغ میں کچھ اور چل رہا تھا۔ کوئی دوسرا منظر تھا۔ کوئی دوسری حکایت تھی۔

یوسف کے جوتے کی نوک عبدالعزیز کی بائیں آنکھ پر لگی تھی۔ درد اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ درد کی شدت کو کم کرنے کے لئے اس نے کروٹ لینے کی کوشش کی لیکن اس کے جسم نے اس کے فرمان کو قبول نہیں کیا۔ پیٹ سے خون بہہ کر سوکھے پتوں پر جم گیا تھا۔ کمر کی ہڈی پر اس نے مڑنے کے لئے زور دیا تو خون دوبارہ تیزی سے بہنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سیاہ سمندر لہرانے لگا۔ چند لمحوں پہلے وہ سر کے گرد باندھی ہوئی گونی میں ہلکا اُجالا محسوس کر رہا تھا وہ بھی غائب ہو گیا۔ اُجالا شاید وہیں تھا۔ مگر اُجالے کو محسوس کرنے کی صلاحیت معدوم ہو گئی تھی۔

اس نے یوسف کے کسی جملے کو نہیں سنا۔

باہری دنیا اس کے لئے اندھیرے میں بدل گئی تھی اور ایک مختصر سے وقفے کے لئے اس کا دماغ روشن ہو گیا تھا۔ اس نے سکینہ کا چہرا دیکھا۔ موسلا دھار بارش میں متواتر بھیگا ہوا چہرا۔ ۔ ۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر ہمیشہ ہمیش کے لئے غائب ہونے سے پہلے اس کے لبوں پر ایک الہامی مسکراہٹ ابھری۔ اس کے گلاب ہونٹ وا ہوئے۔ ’’میں ترے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔‘‘

اتنا کہہ کر وہ چہرہ تاریکی کی جھیل میں ڈوب گیا۔ عبدالعزیز کے چہرے پر آخری مسکراہٹ ابھری۔ اس کے ہونٹوں نے جنبش کی۔ ’’محبت کی ہر نشانی خطرناک ہوتی ہے۔‘‘ یہ جملہ اس کے ذہن کی الماری سے نکل کر اس کی زبان کی نوک تک پہنچا، پر وہ اسے ادا نہ کر سکا۔

یوسف کو یوں لگا تھا اس کے جملے سن کر عبدالعزیز جواب دے گا۔ اپنی غلطیوں کا اقرار کرے گا۔ آئندہ اس کی مخالفت نہ کرنے کا وعدہ کرے گا۔ یوسف اس کے اقرار

جرم کو سننے کے لئے بے قرار تھا تا کہ اس کے ساتھیوں کو یقین ہو جائے کہ یہ شخص واقعی ان سرگرمیوں کا محرک رہا ہے۔

پر ایسا نہ ہوا۔

ایسا کچھ نہیں ہوا جو یوسف کے ذہن میں تھا۔

عبدالعزیز کی روح اس کے خاکداں سے پرواز کر چکی تھی۔

جھلاہٹ اور نفرت کی آگ میں یوسف کا سر چکرا رہا تھا۔ اسے ماجرے کو طول دینے کی عادت نہ تھی۔ اس نے جھک کر عبدالعزیز کی بائیں پسلی میں خنجر گھونپ دیا۔ ایک بار گھمایا اور نکالا۔ خنجر کے ساتھ ہی خون کا ایک چشمہ پھوٹ پڑا۔ خون کے اس فوارے میں محبت کہانی محفوظ تھی۔ جسے ادھوری زندگی آج الوداع کہہ رہی تھی۔ اس کہانی کا سرورق اگر ہوتا تو شاید یہی ہوتا: ''ایک ممنوعہ محبت کی کہانی۔''

سوکھے پتوں پر خون کے چھینٹے اڑے۔ وہاں جو بلیں تھیں وہ گھبرا کر پیچھے ہو گئیں۔ چونٹیوں کا ایک قافلہ جو قریب سے گزر رہا تھا وہ تازہ خون کی مہک سے ساکت ہو گیا۔ دور تک ساکت بے حرکت چونٹیوں کی ایک قطار نظر آتی تھی۔ چند قدموں کی دوری پر ایک بڑے پتھر کے نیچے بچھوؤں کا ایک لشکر تھا اس نے اپنے ڈنک کھڑے کیے۔

یوسف کے ایک ساتھی نے اپنے جھولے سے پانی کی بوتل نکالی۔ یوسف نے ہاتھ دھوئے۔ دوسرے ساتھی نے عبدالعزیز کے ہاتھ کی نبض کو ٹٹولا۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیلی۔ اس نے گردن اٹھا کر کہا: ''مرتد جہنم پہنچ گیا۔''

تینوں کچھ دیر وہیں کھڑے رہے۔ جنگل پر ایک ابدی خاموشی طاری تھی۔

❦

یوسف گھر کی طرف بڑھنے لگا تو اسے یوں لگا وہی خاموشی جنگل سے نکل کر اس کے پیچھے پیچھے چلی آ رہی ہے۔

وہ گھر میں داخل ہوا۔ سکینہ وٹے دار میں ایک کرسی پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ مجاور حسین چند منٹ پہلے آ کر منگیلدار کی موری میں نہار ہے تھے۔

اب وہ خاموشی یوسف کے چہرے پر چھا گئی تھی۔ اس نے بہت کوشش کی اس کے باوجود چہرے کے اُڑے ہوئے رنگ کو چھپا نہ سکا۔ بالآخر سکینہ نے اس سے پوچھا۔

''تو اتنا پریشان کیوں لگ رہا ہے؟''

''تھک گیا ہوں......'' اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔

''دماغ پر زیادہ زور مت دیا کر......'' سکینہ نے اس سے کہا۔

''کبھی کبھی دل پر زور پڑنے سے بھی آدمی تھک جاتا ہے۔'' یوسف نے ماں کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

سکینہ نے مجاور حسین کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ پھر خاموشی نے تینوں پر اپنے پر پھیلائے۔ چھت پر چاند نہیں تھا۔ باہر بہت اندھیرا تھا۔ آسمان کی بلندی پر سے دیکھیں تو یوں لگے گا، پورے گانو کو ایک ابدی تاریکی نے لپیٹ لیا ہے۔ جو گانو ہے، وہ۔۔۔ گانو ہے ہی نہیں۔

دوسری طرف اس تاریکی میں املی کا پیڑ بہت خوش تھا کہ آج شگفتہ کی روح ''عذابِ زندگی'' سے آزاد ہو گئی تھی۔ وہ جگنو بن کر آسمانوں کی طرف اُڑ رہی تھی۔ املی کے پیڑ کو پتہ نہیں تھا اب کس کی اداس روح اس کی شاخوں پر پناہ گزین ہونے والی ہے۔

انتساب

کشمیر کی اداس روحوں

کے نام

"You have suffered from the illusion that even things..mere chairs, tables, mirrors...conspire to increase my solitude."

—John Fowles

(The French Lieutenant's Woman)

"What possibilities remain for man in a world where the external determinants have become so overpowering that internal impulses no longer carryweight."

—MilanKundera

(TheArtofNovel)

"In every community there is a class of poeple profoundly dangerous to rest. I don't mean the criminals. For them we have punitive sanctions. I mean the leaders. Invariably the most dangerous people seek the power."

—Saul Bellow

(Herzog)

باب اول

محبت کے رنگ

"His soul was loosened of her memories."

—James Joyce

(A Portrait of The Artist As A Young Man)

------ ا -----

گذشتہ دنوں تین بار میرے خوابوں میں ویدک عہد کی دیوی ادیتی آئی اور ہر بار اس نے مجھ سے کہا کہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکتی لیکن اتنا بتا سکتی ہوں۔ تمہارے اندر اگنی دیو کی خوشبو ہے۔ میں نے ان خوابوں پر کئی بار غور کیا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

میری زندگی کا مختصر احوال کچھ یوں ہے۔ میں بمبئی میں پیدا ہوا۔ اس شہر کے علاوہ کہیں رہا نہیں۔ اس شہر سے میرا رشتہ کچھ اس طرح ہے کہ میں کہیں اور رہ بھی نہیں سکتا۔ میرے سارے دوست اسی شہر میں ہیں اور میرے سارے خواب اسی شہر سے عبارت رہے ہیں۔ اس شہر میں کئی رنگ میری زندگی میں آئے۔ جن میں سے بعض اتنے گہرے اور جاذب ہیں کہ کبھی کبھی متعدد صورتیں بنا کر میرے شکستہ کمرے میں چلنے پھرنے لگتے ہیں۔ یہ دیواریں جن کا رنگ جگہ جگہ سے اڑ گیا ہے۔ ایسے لمحوں میں تتلیوں کے پروں کی طرح خوش رنگ لگنے لگتی ہیں۔ ان لمحوں کا رقص میری زندگی میں ارتعاش پیدا کرتا ہے۔ بہت سارے رنگ دیواروں کی رگوں سے پھوٹ پڑتے ہیں اور لکیریں بن کر بہنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی تنہائی میں ماضی کے یہ رنگ جانے کہاں سے دبے پاؤں ہیولے بن کر سرایت کرتے ہیں۔ دھواں سا بن کر میرے نتھنوں سے

میرے اندر کی ویرانی میں اتر جاتے ہیں۔ میں بہت چیختا ہوں۔لیکن میری چیخ میرے حلق میں پھنس جاتی ہے۔ میرے بے رنگ چہرے پر کبھی کبھی مجھے میری پلکیں بھی گراں بار لگتی ہیں۔

مجھے یاد ہے: ایسے وقت میرے کمرے کی چھت تحلیل ہو جاتی ہے۔ کائنات کی بے پناہ وسعت میں سرگرداں آوارہ اجسام زینہ زینہ اس کمرے میں اترنے لگتے ہیں۔ بہت سارے رنگ، بہت ساری روشنی اندھیرے کے بطن کو چیرتی کاٹتی میرے ارد گرد پھیل جاتی ہے۔ میری آنکھیں جو بہت اندر کو دھنس گئی ہیں، اس خیرہ کن اجالے سے ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں۔

------ ۲ -----

مجھے یاد ہے: میں یونیورسٹی میں اس کو چپ چاپ دیکھا کرتا تھا۔ وہ جو ایک قسم ہے پیلے رنگ کی (پیلا رنگ مستقل دھوپ میں رہ رہ کر سفید رنگ کے قریب ہو جاتا ہے، لیکن نہ پوری طرح سفید ہو پاتا ہے نہ پیلا رہ پاتا ہے)، اس کا رنگ تھا۔ تیز دھوپ میں یہ رنگ سنہری رنگ کی بہ نسبت زیادہ خوبصورت نظر آتا ہے۔ اندھیرے میں یہ رنگ دل میں ایک کیف اور کشش پیدا کرتا ہے۔

مجھے یاد ہے: ایم اے کی کلاس میں وہ ہمیشہ پہلی صف میں بیٹھا کرتی تھی۔ میں اس کے پیچھے بیٹھ کر اس کے پیلے رنگ کو دیکھا کرتا تھا۔ کمرۂ جماعت کی بناوٹ کچھ ایسی تھی کہ روشنی تین سمتوں سے اندر داخل ہوتی تھی۔ میں نے بارہا دیکھا کہ روشنی کی کئی شعاعیں اس کے رنگ سے ٹکرا کر منعکس ہونے کے بجائے اس کے رنگ میں گھل جایا کرتی تھیں۔ وہ دھنک رنگوں میں بدل جاتیں۔ وہ دھنک جماعت پر چھا جاتا۔ میں

اپنی میز پر بے حس وحرکت پڑا رہتا۔ میری روح ان دھنک پتوں کو چومنے لگتی......وہ سب کے سب رنگ ہوا کی لہروں کے ساتھ بہہ نکلتے۔ میں بھی ان کے تعاقب میں بہت دور نکل جاتا۔ جس طرح دیہاتوں میں بچے، گلہریوں اور تتلیوں کے پیچھے جنگل اندر جنگل نکل جاتے ہیں۔

------ ۳ -----

''دن اس کی جلد کو مزید چمکدار اور پرکشش بنا رہے تھے......''

مجھے یاد ہے: ایک دن میں نے بالآخر اس سے بات کرنا چاہا...... بہت دیر تک مشق کرتا رہا...... بہت دیر تک خود میں توانائی اکٹھا کرتا رہا جو اس 'سامنے' کے لیے درکار تھی۔ جانے کیوں اس کے پاس پہنچتے ہی یاد کیے گئے سارے جملوں نے بے وفائی کی تھی۔ میں نے بہت دیر تک ان لفظوں اور جملوں کو ذہن کے تہہ خانے میں صدائیں دیں لیکن شاید وہ اس کے رنگ کی تپش سے پگھل گئے تھے۔ میری اس حالت پر اسے حیرت نہیں ہوئی بلکہ اپنے سے انداز میں وہ مجھ پر ہنس دی۔ وہ ہنسی تو سارا ماحول مجھ پر ہنس پڑا...... پھر وہ خاموش ہوئی، وہ خاموش ہوئی تو ایک جہاں خاموش ہو گیا۔ اک جہاں خاموش ہوا تب میرے دل کی دھڑکنیں فصیل جسم سے باہر کود پڑیں۔

اس نے ان دھڑکنوں کو سنا جو مجھے احمق ثابت کر رہی تھیں۔ میں نے سوچا، کاش! میں اس دل کو کسی صندوق میں چھپا کر سمندر میں غرق کر دیتا۔ کچھ لمحے ارادے کی تعمیر اور تشکیل میں گزر گئے......اسی دوران ایک طرف سے رنگوں کا ایک کارواں نکلا، جو یقیناً میری جانب بڑھ رہا تھا۔......میں نے چاہا......کاش! یہ جو رنگ دار شلواریں اس چلچلاتی دھوپ اور تمازت میں میں پھڑ پھڑا رہی ہیں۔ کتنا اچھا ہوگا اگر یکا یک تیز

طوفانی ہوا چلے جس سے ان کی ناڑیاں کھل جائیں اور یہ سب شرم، حیرانی اور اور عجلت میں درختوں اور دیواروں کے پیچھے چھپ جائیں...... پر ایسا کچھ نہ ہوا۔ ...... وہ میرے اطراف پھیل گئیں...... شلواریں پھیل گئیں تو وہ ایک طرف ہوئی اور وہاں سے نکل گئی...... میں بمشکل اسے جاتے ہوئے دیکھ سکا۔

کالج کے امتحانات کے ساتھ ساتھ میں عشق کے امتحان بھی دے رہا تھا۔

لیکن۔۔۔رفتہ رفتہ مجھے اس بات کا احساس ہونے لگا کہ:

میرے اطراف عشق بہ صورت زہر اپنا حلقہ گہرا کرتا جا رہا تھا۔ میں چمنی کے اندرونی حصے کی طرح اندر ہی اندر سیاہ ہوتا جا رہا تھا۔ میرے اختیار میں یہ نہیں تھا کہ اسے باہر نکال سکوں، لیکن مجھے یاد ہے: جب بھی کوئی شلوار مجھے یکا یک چھوڑ کر کسی اور جزیرے کی سیر کے لیے نکل جاتی، تب میرا دل بہت چاہتا کہ وہ رنگ مجھ پر چھا جائے، جس کے سامنے میرے لب کھل نہیں سکے تھے۔ وہ قوسِ قزح بن کر میرے اندر رجائیت کی ترنگ بھر دے۔ وہ میرے اندر ایسے دھیرے دھیرے اترے، جیسے سمندر کی پر سکون موجوں میں سرخ تابندہ سورج کی مسافت اترتی ہے۔ وہ میرے ذہن کے حلقوں میں ایسے پھیل جائے جیسے دن اور رات کے مابین مغموم بے نام بے ہیت وقفہ۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ ۴ ۔۔۔۔۔

میری ایک معتبر دوست فرحین اس کی بھی دوست تھی۔ فرحین سے مل ہمیشہ اپنے پن کا احساس ہوتا تھا۔ شاید فرحین کو اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ جن شلواروں نے مجھے کہرا کی طرح گھیر رکھا ہے وہ میرے لیے تاریکی اور ہلاکت کے اور کچھ نہیں ہو سکتیں۔ یہ بہت ممکن ہے کہ فرحین نے اسے میرے بارے میں بہت ساری باتیں

بتائی ہوں اور بہت ساری غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا ہو۔ غالبًا اسی سبب چند روز بعد وہ مجھ سے ملی۔ جو وہ ملی تو ایک خاص قسم کی روشنی (جو نہ پیلی ہے، نہ سفید) نے مجھے اپنے حصار میں کھینچ لیا۔ اس نے مجھے اپنے حصار میں کھینچا، تو کہرائے بے سمت کی کئی تہیں بیٹھ گئیں اور کئی نیم چست شلواریں میری نگاہ سے محو ہو گئیں۔ وہ کسی دوسرے جزیرے پر چلی گئیں ہوں گی۔

میں اور وہ باتیں کرنے لگے۔

لڑکیوں اور پرندوں میں کتنی قدریں مشترک ہیں؟

------ ۵ -----

مجھے یاد ہے: وہ مجھے مختلف رنگوں کے نقصانات اور مضر اثرات سے واقف کراتی۔ مجھ سے بہت ساری باتوں پر لڑا کرتی۔ روٹھ جاتی۔ کبھی مجھے منا لیتی اور اکثر روٹھی رہتی کہ میں اسے منت سماجت کر کے منالوں۔

ہم ایک دوسرے کے قریب ہونے لگے۔

اس کا رنگ مجھے نظر آنے والے ہر منظر میں شامل ہو گیا۔ میں نے ان دنوں جب بھی کتاب کھول کر پڑھنے کی کوشش کی ایسا ہوا کہ سیاہ الفاظ کاغذ پر سے غائب ہوئے اور اس کی سرخ مائل مسکراہٹ سحر انگیز موسیقی لیے ہوئے کمرے کی نا قابلِ مسافت تنہائی میں ہر جا بکھر گئی۔ یہ وہی تنہائی ہے جو ہندوتوادی فسطائیت نے تاریخی انتقام کے جنون میں مجھ پر نازل کی ہے۔ کیا اس تنہائی میں میری گم شدگی کا رمز پنہاں ہوگا؟

٦

موسم خزاں کی آمد ہوئی۔ ہواؤں نے اپنی تمام گرد اور گرمی کو خیر باد کہہ دیا۔ سرِ شام برگد، آم، گل مہر اور املی کے پیڑوں کے نیچے پت جھڑ کی آواز بہتی رہتی۔ خزاں رسیدہ پتوں سے سڑک کے دونوں کنارے اٹے پڑے تھے۔ سورج کی کرنیں برہنہ شاخوں کے سایے، کچھ یوں بناتی تھیں کہ سب دل کے الجھے ہوئے دھاگے ہوں گویا، دن کی مراجعت اور ہر طرف بکھری ہوئے سرخ رنگ سے کبھی کبھی یوں بھی محسوس ہوتا، جیسے سیلِ وقت جامد تسلسل سے کٹ کر ایک طرف خاموش تماشائی بن بیٹھا ہے۔ ہم دونوں کمرۂ جماعت سے ملحق سیڑھیوں پر بیٹھے تھے، لیکن ہمیشہ جیسی گفتگو اور روز ایسا جھگڑا اس دن نہیں ہو سکا۔ اس کے چہرے پر ایک اجنبی ڈر سایہ کیے ہوئے تھا، گویا پت جھڑ کی آواز کا جو المیاتی نوحہ تھا اس کی بازیافت ہو چکی تھی۔ خزاں نے اس کے دل کی گہرائیوں اور دیدوں کے داخلی منظر جمع خانوں کو کھنگال رکھا تھا۔۔۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔''

''کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔'' میں نے اصرار کیا۔

''بات............؟'' اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

''لیس، بات'' میں نے دوہرایا۔

''ایک بات ضرور ہے'' اس نے ہونٹ دبا کر کہا اور پھر لہجہ بدل کر کہنے لگی......'' میں سوچتی ہوں میرے پاس تمہارے لیے کوئی تحفہ، کوئی نخلستان نہیں ہے۔ اس کے باوجود تم مجھ سے محبت کیوں کرتے ہو......؟'' (اس سوال کا جواب میرے ماضی اور اس کے مستقبل سے آپ خود اخذ کر لیں گے)

۔۔۔۔۔ ۷ ۔۔۔۔۔۔

ہم دونوں چپ ہو گئے۔ ہوائیں جن میں خنکی سرائیت کر گئی تھی ہمارے جسموں کو چھو کر گزر رہی تھیں۔ ہم سے کچھ نہ کہا گیا۔ درختوں کی شاخوں سے سورج کی کرنیں تنوں میں اتر کر غائب ہو گئیں۔ ہمارے ذہن ایک پراسرار شب خون کی زد میں تھے۔ شاید ہم بہت کچھ سوچ رہے تھے......... شاید ہم بہت کچھ کھل کر کہنا سننا چاہ رہے تھے، لیکن ایسی کوئی بات تھی بھی تو نہیں، جسے ہم کہہ نہ چکے ہوں۔

بہت دیر یوں ہی بیٹھے رہے۔

چوکیدار کے اشارے کے بعد..... ہم یونیورسٹی سے باہر نکل آئے۔ وہ بس میں سوار ہوئی اور بس کے دروازے سے ہاتھ ہلاتے ہوئے مجھ سے دور ہو رہی تھی۔ بس بمبئی کی ٹرافک میں گم ہو گئی۔

مجھے یاد ہے، ایک کرب ناک، اذیت ناک لہر اس کے جسم سے گزری تھی جس کا نقش اس کی آنکھوں میں نمی کی صورت آویزاں تھا۔ فضا یکا یک منجمد، یخ بستہ اور بوجھل ہو گئی تھی۔ میں شب دیر تک جوہو بیچ کے کنارے بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ ”کاش! وہ ایک بات، جس نے اس کے اندر ہیجان اور نا آسودگی کی کیفیت کو جمع کر رکھا ہے، نہ ہوتی تو بہتر ہوتا۔“ یہ جملہ بار بار میرے ذہن میں متلاطم سمندر کی سطح پر ابھر رہا تھا۔ ساحل کا سارا منظر ہجوم، بچوں کا شور اور کھیل کود، دکانوں کی ہماہمی اور شلواروں کی مسکراہٹیں، سب کچھ، سارا ماحول، اس ایک جملے سے باطن میں پیدا ہونے والے گرداب میں ڈوب رہا تھا۔ میں صفر ہو رہا تھا۔ میرا لہو نفی درجوں پر سرد ہو رہا تھا۔ میرا دل مجھے چیخنے پر مجبور کر رہا تھا، لیکن میں لب تک کھول نہیں سکا۔ چیخنے کی خواہش کے دکھ نے اتنی شورش پیدا کر دی تھی کہ میرا سر چکرانے لگ گیا تھا، مگر پتہ نہیں پھر بھی میں کب

تک وہاں رنجیدہ، اداس اور ایک غیر مانوس چہرے سے نبرد آزمار ہا، جس کا تعلق اس کی اس زندگی سے ہے۔ وہ زندگی جو ہماری محبت کے خاتمے کے بعد شروع ہونے والی تھی۔

------ ۸ -----

اس رات کی صبح دوپہر بارہ بجے ہوئی۔ میں یونیورسٹی نہیں جا سکا۔ سارا دن گزشتہ روز کی تلخی کو یاد کرتا رہا۔ پھر کچھ یوں مصروف ہوا کہ متواتر ایک ہفتہ یونیورسٹی سے غائب رہا۔ جمعرات کی شام تاخیر سے پہنچ کر یونیورسٹی کیفے میں چائے پی رہا تھا۔ میرا گمان تھا کہ سب چلے گئے ہوں گے۔ آستین کے کف کھلے ہوئے تھے اور چہرے پر داڑھی اُگ آئی تھی۔ چائے کا گلاس ہاتھوں میں تھامے میں منجمد پھیپھڑوں کو گرما رہا تھا، جو کئی دنوں کی برفباری میں سردا گئے تھے۔ یکا یک وہ وارد ہوئی، ٹیبل کے قریب آرکی اور اپنا بیگ زور سے پٹخ دیا...... میں اسے دیکھتا رہا...... کچھ کہہ نہ سکا...... وہ بیٹھ گئی۔

''کیوں......؟ بہت اسمارٹ ہو گئے ہو، کہاں تھے اتنے دنوں سے؟''

''مصروف تھا۔''

''جھوٹ مت بولو۔''

''نہیں، سچ کہہ رہا ہوں۔''

''چپ رہو۔'' وہ چیخی

میرے سینے کے برفستان میں ایک لطیف خیال کپکپی لینے لگا۔ میں نے گلاس کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ مجھے ایسا لگنے لگا تھا کہ بس ابھی گر کر ٹوٹ جائے گا۔ اس نے گلاس سے لپٹی میری انگلیوں پر اپنی انگلیاں رکھیں اور کہنے لگی، کیا تمہیں لگتا ہے کہ احساسات صرف تمہارے پاس ہی ہیں......؟ کیا جذبات تمہارے پاس ہی ہیں؟ کیا میری

خواہشات نہیں ہیں، اپنے اندر سے باہر نکلو، دیکھو اب تک بہت کچھ خوبصورت ہے!''

میں چپ رہا۔

اس کی نظریں مجھ پر مرکوز تھیں، مرے لب ہلے۔

''نہیں فقط اندھیرا ہے...... گہرا اندھیرا...... بے رنگ اندھیرا......!!!''

''ہاں اور کہو، جان لیوا......'' تمہاری یہ قنوطی باتیں میں سن چکی ہوں۔ اب بس کرو...... چلو اٹھو...... باہر چلتے ہیں۔

(میرے حصے میں جو مرگ افروز قنوطیت ہے اس کا ادراک وہ شخص آسانی سے کر سکتا ہے، جس پر فسطائیت کیا سایہ پڑا ہو۔)

------ ۹ -----

ہم دونوں برگد کے نیچے بیٹھے رہے۔ چپ چاپ...... خزاں کا احساس تناور درختوں کی مفلسی، سڑک پر دونوں کناروں پر بکھرے زرد پتوں اور ہواؤں کی سرد مہری سے ہوتا تھا۔ سیاہ برہنہ شاخوں سے شام کے سائے لکیریں بناتے ہوئے پھیلے اور جڑوں کی طرف مراجعت کر صفر میں بدل گئے۔ اس نے میری انگلیاں سختی سے جکڑ رکھی تھیں۔

''بات نہیں کرو گے؟'' اس نے کہا۔

''کیا کہوں؟ کہنے جیسا کیا ہے؟'' میں نے کہا۔

''مایوسی چھوڑو''

''کیسے ممکن ہے؟''

''ہنسا کرو......''

''ہنسی......!''میں نے مایوسی سے کہا۔

''تمہیں مجھ سے پیار ہے نا......''اس نے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔

''بے شک''میرے منہ سے برجستہ ادا ہوا۔

''تو پھر میں جب تک یہاں ہوں، میری خوشی کی خاطر خوش رہو۔''

اس کے لہجے کا اعتماد دیکھ کر مجھ میں ایک تازگی جاگی......اس نے میرے ہاتھ چومے۔اس نے میرے ہاتھ چومے تو ایک مخصوص نیلے رنگ کی لہر اس کے لبوں سے تیزی سے نکل کر میرے سارے وجود کو مرتعش کر گئی۔اس نیلے احساس کو میں نے آخری بار اپنے خاتمے سے چند منٹوں قبل دوبارہ دل سے دیدوں تک پھیلتے ہوئے محسوس کیا تھا اور اس کے چہرے کا آخری نقش دماغ کی اسکرین پر ابھرا تھا۔وہ بھی گہرا نیلا لہردار تھا............پھر ابدی تاریکی۔

------ ۱۰ -----

ان دنوں میرا وزن بہت کم ہو گیا ہے۔میرے ہاتھ بانس کی طرح پتلے اور پیلے ہو گئے ہیں۔میرے جبڑے بہت اندر دھنس گئے ہیں۔میں مسخرہ سا لگنے لگا ہوں۔حد درجہ بد ہیئت۔میری شناخت ظاہر اور باطن دونوں سطحوں پر ماند پڑ گئی ہے۔اس مخدوش شناخت کی بازیافت کو آگے چل کر میرا مقصدِ زندگی بننا تھا............

------ ۱۱ -----

گھاس کے وسیع قطعے، زرد اور تانبے کی تاروں میں بدل گئے ہیں۔تانبے کی ان

تاروں کے درمیان سے گزرنے کے بعد یونیورسٹی کا امتحان گھر آتا ہے۔لیکچرز سے فارغ ہوئے، تو ہم اس طرف نکل پڑے۔ ہم تیسرے آدمی سے متعلق گفتگو کر رہے تھے، جس سے اس کے والدین نے اس کا رشتہ طے کیا ہے۔قطعہ گھاس کے درمیان میرے قدم زمین نے سختی سے پکڑ لیے، میں رک گیا...... وہ ایک قدم آگے بڑھی اور پھر پیچھے مڑ گئی۔''کیا ہوا؟ کیوں ٹھہر گئے؟''۔اس کے سرخ لبوں کی جنبش مجھے متاثر کر رہی تھی جن پر سرخی مائل رنگ کی اضافی مہین تہہ جمی ہوئی تھی اور اسی سبب ایک لا بیان شعاع، لاعکس شعاع منعکس ہو رہی تھی۔اس کی تاب میرے سارے مسامات کو لرزہ گئی......ایک نیم واضح رنگ بے ہیت رشتے کی کونپلیں میرے بطن سے نمو پانے لگیں ......وہ چپ تھی۔ مجھے تبدیل شدہ دیکھ کر سہم گئی تھی۔ چند ہی ساعتوں میں میں نے دیکھا:اس کی آنکھوں میں ایک اجالا سا منور ہونے لگا اور ایک احساسِ نرگسیت اس کی پلکوں پر جم گیا۔

میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ تانبے کے تاروں کی کپکپاہٹ اور سرسراہٹ اس کے جسم میں داخل ہو چکی ہے۔اس کارواں رواں منتشر ہو کر خلائے لامحیط میں نور کی رفتار سے بکھرنے لگا،لیکن یہ بات بھی ہے کہ وہ اپنے اندر کی خود محسوس تبدیلیوں کو چھپانے میں اپنی حد تک کامیاب بھی تھی۔اسی وقت ہمارے درمیان برسہا برس کی خاموشی جاگ رہی تھی۔ ہمارے درمیان کا بے چہرہ اجنبی ڈر شکست سے گذر رہا تھا۔ ہمارے اندر ایک ٹھنڈی لہر بہہ رہی تھی، جو ہمارے پسلیوں تک آتے آتے گرم ہو جاتی، جس کی تپش سے میری ہتھیلی گرماہٹ محسوس کر رہی تھی، میں نے اس کی ہتھیلی تھام لی، جو برفاب ہو چکی تھی.......... میں نے اسے یک لخت اپنے قریب کھینچا،اس کی سانسوں کا ردھم تیز تر ہو چکا تھا۔اس کے ہونٹوں کی سرخی مائل پرت پر میری زبان رینگنے لگی،تو ہمارے دلوں کا زہر ہماری رگوں میں پھیل گیا اور ایک مہک دار جھاگ ہمارے

مساموں کی کھڑکیوں سے بہہ رہا تھا۔کئی سال بعد ایک شب اسے اپنے خواب میں اور اپنے کمرے میں محسوس کرنے کے بعد جب میری آنکھ کھلی ،تو بدن کی اس مہک دار خوشبو کی لہروں کو میں نے اپنے کپڑوں اور بستر پر اسی شدت سے محسوس کیا۔

شاید وہ چیخنا چاہتی تھی ....شاید رونا چاہتی تھی ....یا شاید اپنی مٹھی بھر طاقت سے میرا سینہ پیٹنا چاہتی تھی...........پر وہ کچھ نہ کر سکی...........اس نے انتہائی حیران کن لفظ استعمال کیا۔''بس ۔۔!''

یہ 'بس' زہر میں بجھے تیر کی طرح نامعلوم جہت سے آ کر میرے سینے میں سن سے پیوست ہو گیا۔تانبے کے سارے مسرور تار دوسری طرف اپنے سروں کو جھکائے تیز تیز ہوا کی زد میں زرد رخ سورج کو الوداع کہہ رہے تھے۔

------ ۱۲ -----

پھر ہم دونوں کا معمول بن گیا کہ لیکچر سے غائب رہ کر گھنٹوں محبت میں ایک دوسرے کا تعاون کرتے رہتے ۔ان ہی دنوں مجھے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا ''محبت وہ واحد عمل ہے ،جس میں منطق کی گنجائش نہیں ہے اور وہ محبت جس میں بدن کا لطف شریک نہ ہو،ایک ذہنی اور روحانی مرض ہے۔''

------ ۱۳ -----

ہم اکثر خالی کمروں میں جا بیٹھتے ،متواتر کہتے اور سنتے رہتے ،کبھی کبھار یوں ہی چپ چاپ ، بجھے بجھے ملول سے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا کرتے ......وہ جو میرے بہت

قریب ہوتی، تو اس کا سارا بدن گلاب کی ٹہنیوں جیسا اور اس کا چہرہ گل لالہ کی مثل ہو جاتا۔ وہ اپنی جسمانی اہمیت کی معطر روشنی میں غوطہ زن ہو جاتی ......ایسے وقتوں میں وہ مجھے کھینچ کر بھینچ کر اور دبوچ کر اپنی چھاتی سے لگاتی، گویا ہر نگاہ سے محفوظ کر لینا چاہتی ہوں ۔ میں اس کی بھیگی ہوئی پیشانی، کاجل پھیلی پلکوں، سرخی مائل ہونٹوں اور گرم گردن جس کی اندرونی نسیجوں کے درمیان دھویں کی روئیں بہہ رہی ہیں، کو پیار کرتا۔ ایک طرح کی شعلگی ہماری رگوں اور شریانوں میں بیدار ہونے لگتی اور ایک طرح کی مبہم پراسرار مہک ہمارے گرد دائرے بنانے لگتی اور ایک طرح کی خاموشی ہم سے کلام کرتی رہتی، ہم ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ۔ ہم مقناطس میں بدل جاتے۔ ....اور ایک آفاقی، بے ہیئت سیال مادہ ہمارے اندر سے پرندہ بن کر جہنم کی طرف اڑ جاتا۔ کبھی کبھار اس سفید محبت کے پرندے کی آمد کے بعض نشانات مجھے اپنی روح کے عکس پر نظر آتے۔

------ ۱۴ -----

یوں اس نے مجھے محبت کے ایک ایسے رنگ میں باندھ دیا، جس کا تصور میں نے کبھی نہیں کیا تھا۔ رفتہ رفتہ ماضی کے وہ تمام رنگ جن سے میں نے زندگی میں محبت کے تانے بانے بننے چاہے تھے۔ میرے ذہن سے اوجھل ہو گئے۔ اب ذہن کے منطقہ ہائے عشق پر فقط وہ ایک جادوئی رنگ چھا گیا، جو نہ سفید ہے، نہ پیلا !!!راہ چلتے گلی کوچے، کہیں بھی اگر اجنبی رنگ چہرے نظر آتے، تو سارا منظر پس منظر اور سب چہرے سارا کا سارا طبعی اور غیر طبعی عالم اس ایک رنگ میں اپنے کو سمو دیتا۔۔۔ مخدوش کمرے کی ویرانی میں جب کبھی کسی شب، تاریکی اور بدروحوں کی آسیب زدگی در آتی، تو یہی

رنگ، رقص حیاتِ ابدی بن کر یادستان کو منور کردیتا، جس کے نخلستان میں ملاقاتوں کے کارواں یہاں سے وہاں آنے جانے لگتے۔ دل میں اس رنگ نے ایک نمی، مٹھاس اور گداز کی کیفیت پیدا کی ہے، جس کے باعث تلخی ایام کی افسردگی اور تاریخ کے سب سے زیادہ غیری تاریخی عہد کی سیاسی ہلاکتوں کی غمنا کی کم کم سی ہوگئی۔لیکن دل کی اس ارض نم کی تہہ میں ایک عمیق دلدل کے موجود ہونے کا احساس بھی باقی ہے ، جو اندر ہی اندر کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔''چند دنوں بعد یہ جہان دل ویران ہو جائے گا......... یہ رنگ غائب ہو جائے گا...... وہ رخصت ہو جائے گی۔ یہاں سے دور علی گڑھ یا لکھنؤ میں کسی انجنیئر کی میکانکی زندگی کا پرزہ بن جائے گی۔ابھی میں عمر کی اس منزل میں کہاں تھا، جہاں اس بات کا ادراک ہو کہ محبت میں عرصے کی اہمیت ہرگز نہیں، بلکہ تعلق کی شدت اور گہرائی کی ہے۔''

یہ کرب بعض اوقات جاں گداز المنا کی اور اعصاب زدگی میں مجھے غرق کردیتا اور میں نفس کی دلدل میں گم شدہ یاد کی طرح فراموشی کا حصہ بن جاتا۔

------ ۱۵ -----

میں چند روز یونیورسٹی سے غائب رہا۔ جب پہنچا، تو وہ برس پڑی۔''مجھے تڑپنے کے لیے یہاں چھوڑ جاتے ہو، میں یہاں پاگلوں کی طرح تمہارا انتظار کرتی ہوں۔'' مجھے ہنسی آئی۔وہ پھر شروع ہوگئی۔ ''تم بہت خراب ہو، تم بدل گئے ہو، تم مجھ سے انتقام لے رہے ہو، اب میں تم سے ہرگز ہرگز نہیں ملوں گی۔'' مجھے پھر ہنسی آ گئی۔(اس لیے کہ میں جانتا تھا جب وہ یہ کہتی ہے کہ اسے مجھ سے ہرگز ہرگز نہیں ملنا ہے، درحقیقت ان ہی لمحوں میں وہ مجھ سے شدت سے ملنا چاہ رہی ہوتی ہے۔) میں نے یوں ہی کہا

''تمہارا کہنا درست ہے۔'' وہ مجھے گھور رہی تھی۔

''ویسے بھی گرمیوں کی چھٹی کے بعد تم مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو جاؤ گی۔''

میں مزید کہنا چاہتا تھا لیکن آنکھوں کے اندرون میں جہاں آنسوؤں کے خزانے جمع رہتے ہیں وہاں سے موتی کے چشمے ابل پڑے ...... وہ دوڑ کر اس کمرۂ جماعت میں چلی گئی، جہاں ہم ملتے تھے۔ دروازے کی زوردار آواز میں نے سنی۔ کمرے کی دیوار لرز کر رہ گئی اور دیوار کے جس حصے کا دل کمزور تھا، وہاں سے رنگ و روغن اور گرد بکھری۔ کچھ دیر وہیں ٹھہری، پھر ہوا کی لہروں کے ساتھ کسی اور سمت کوچ کر گئی۔ دیوار اور چھت کے درمیان بہت کم کھلی جگہ تھی جہاں عموماً کبوتر محوِ عشق رہتے۔ شور سن کر وہ بھی اڑ گئے اور گل مہر کے پیڑ پر جا بیٹھے۔

میں نے درووزہ کھٹکھٹایا، کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے متواتر دروازے پر دستکیں دیں۔

'' دروازہ کھولو! ارے بس یوں ہی تو کہہ رہا تھا۔'' اندر سے سسکیاں ہلکے ہلکے ابھر رہی تھیں۔

''دروازہ کھولو، ہماری محبت میں اس مقام کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔''

وہ میز پر میرے سامنے بیٹھی۔ دونوں ہاتھوں کے درمیان گردن چھپائے رو رہی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کے کانوں کو تھام کر اس کا سر اونچا کیا۔ اس کا کاجل اس کی پلکوں اور گالوں پر پھیل گیا تھا۔ اس کی گردن سرخ ہوگئی تھی۔ آنکھوں کے گرد

کچھ ہلکی سبز لکیریں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے اس کے گالوں پر ہاتھ رکھے اور تھوڑی طاقت لگا کر اسے کھڑا کیا............اس کی نگاہیں فرش پر تھیں، سسکیاں آہستہ آہستہ اس کی چھاتی کے قشر میں واپس لوٹ رہی تھیں، مگر سانسوں کا جال تیزی سے لہرانے لگا تھا۔۔ میں نے ہاتھ اس کے دائیں کندھے پر رکھا۔اس نے دل کے خالی رقبے کو پر کرنے کی نیت سے مجھے اپنی خالی بانہوں میں کس کر دبوچ لیا۔ دروازہ بند ہو چکا تھا اور اس کے آنسو میری کالر پر دوبارہ قطرہ قطرہ گرنے لگے تھے۔ محبت مرد کو طفل اور عورت کو دیوی بنا دیتی ہے۔ محبت کا سرور واحد سرور ہے، جو تنہائی کا تریاق بن سکتا ہے۔عورت کے بدن کا عرفان واحد عرفان ہے، جو موت کے حسن کے راز اور خدا کے جواز کی منطق سے وجدان کو روشن کرسکتا ہے۔ محبت کے بغیر انسان ہمیشہ آدمی ہی رہتا ہے اور بدن کی لذت کے بغیر عشق کفرِ ذات ہے۔ بدن کی لذت سے متواتر اور متعدد لڑکیوں سے آشنائی نے غالباً مجھے زندگی آشنا کر دیا تھا۔ زندگی سے آشنائی شناخت کی بقا کے مسئلے کو اجاگر کرتی ہے۔ بالآخر شناخت کی چاہت نے مجھے ایک ایسی بصیرت عطا کی، جس کا مجھ میں فقدان تھا۔اس بصیرت نے مجھے فسطائی طاقتوں کے ارادوں کے خلاف کھاڑا کر دیا اور میرے مردہ شعور کو بینائی بخشی۔ میں نے تاریخ، سیاست، شناخت اور فسطائی قوتوں کے عروج کے اسباب کو سمجھنا شروع کیا۔ میری تاریخی حقیقت اور اس کے دفاع کی اہمیت سے مجھے محبت اور بدن کی لذت نے روشناس کیا ہے۔ مجھے کبھی کبھی ایسا بھی لگنے لگا کہ جو محبت کی صفت نہیں رکھتے، ان کی شخصیت کھنڈر ہوتی ہے۔

باب دوم

وجود اور عدم وجود

"The only thing wrong with that eye is that it sees more than it ought to be."

—Gabriel Garcia Marquez

(Of Love And Other Demons)

۔۔۔۔۔۔ ا ۔۔۔۔۔

گرمی کے دن ہیں۔سورج جب ٹھیک سر پرآ کھڑا ہوتا ہے،جسم بدبودار پسینے سے گیلا ہو جاتا ہے۔ممبئ کی سڑکوں پر زندگی سنوارنے کی کوشش میں بھٹکتے ہوئے لوگ تھکے تھکے نظر آنے لگتے ہیں۔زندگی کی تمام جدوجہد انھیں پسینے کے بدبودار قطروں میں تحلیل ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ سفر کیوں اور کہاں سے شروع ہوا ہے اوراس کا انجام کہاں اورکس مقام پر ہوگا؟اس بات کا علم کسی کونہیں ہے۔

ہم برسوں سے منطق کی زد میں ہیں کہ 'ہم ہیں' ہمارے ہونے کی ممکن توضیحات تک ہمارے پاس نہیں ہیں۔کیا ہم خواہشات کی عدم تکملیت کا المیہ ہیں؟ کیا ہم محض ایک خیال ہیں؟ کیا ہماری زندگی کا کوئی متعین مقصد نہیں ہے۔کیا ہم فقط زندگی کو ضروریات کی تکمیل کا جواز قرار دیں؟ ہم مذہب کے فرسودہ تصوراور نا معلوم مبلغوں کے واضح کردہ عقیدوں پر عمل پیرا ہونے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں؟

بے شمار ننگے اور بے سر و پیر سوالات دھوپ کی تمازت اور جسم کی بدبو کے ساتھ بمبئ کے چوراہوں پر کھڑے لوگوں کے ماتھے پر نظر آتے ہیں۔جن کے جواب کسی کے پاس نہیں ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ ہندستان کی موجودہ نسل تاریخ کے ایسے نیم تاریک عبوری عہد سے دبے پاؤں گزر رہی ہے، جہاں صرف بدن افراد کی شناخت ہے۔فقط بدن۔ یہ وہ مرحلۂ تاریخ ہے جہاں روح ، باطن ،فکراوراحساس نام کی کوئی چیز نہیں ہے ۔ یہ گویا وہ غیر فطری عناصر تھے،جنھیں موجودہ سماجی معاشرتی اورسیاسی نظام کی سفا کی

نے کسی حد تک مٹا دیا ہے۔

گرمی میں چہرے کی دیواروں پر ملا ہوا رنگ و روغن پگھلنے لگتا ہے، تو آدمی اپنے اصلی چہرے کو لیے فرار ہونے کی خواہش میں گرفتار ہوتا ہے۔ یہ اس شہر کا المیہ ہے کہ یہاں صرف جھوٹ زندہ رہتا ہے۔ یہاں سچ ناف کے نیچے کا حصہ ہے، جسے چھپا کر رکھنا فرض ہے۔

مہینہ بیت گیا۔ گرمی درختوں کی شاخوں پر حیاتِ نو لے آئی۔ سوکھے درختوں کی ٹہنیوں پر کونپلیں نظر آنے لگیں۔ جنھیں دیکھ کر بعض اوقات ایسا لگتا ہے کہ کائنات کا وجود موہوم نہیں ہے۔ زندگی کا طلسمی میٹا مورفوسی اور غیر مادی رقص طاقت ور ہے۔ طاقت کی تعریف ممکن ہے اور چیزوں کی ماہیتی بنیادیں بھی ہیں۔

میں پیپل کے تنے سے لگ کر بیٹھا تھا۔ سورج اپنی مسافت سے تھک ہار کر شفق کے سایوں کے رنگوں میں نہا رہا تھا۔ پیپل کے نئے تازہ سرمئی، نارنگی پتے سرسراہٹ میں حصہ لے رہے تھے۔ راحت بخش ہواؤں کے ساتھ موسیقی کے ٹکڑے بہہ رہے تھے۔ مجھے اس کا انتظار تھا۔ پچھلے تین دنوں سے وہ متواتر یونیورسٹی نہیں آئی تھی۔ مجھے اس کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے اس کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ تو کیا وہ سچ مچ میری عادت بن گئی ہے؟ لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ کبھی کبھی میری سوچ کے خطوط و زاویے یکسر بدل جاتے ہیں اور میں انسانی رشتوں کی صداقتوں پر وحشت زدگی کے ساتھ غور و فکر کرنے لگتا ہوں۔ میں بار بار سوچتا ہوں کہ رشتوں کی اساس کیا ہے؟ غائیت منطق اور ضرورت کیا ہے؟ رشتوں کے استحکام اور پائیداری کا 'غیر لازمی' جواز کیا ہونا چاہیے؟ رشتوں کا کوئی غیر سماجی جواز ہے بھی یا نہیں؟ رشتوں کی نوعیت کس نے اور تاریخ کے کن مراحل نے طے کی ہے؟ رشتوں کی عمر اور تاریخی حقیقت فی نفس کیا ہے؟ رشتوں کا مابعد الطبعی تصور مذہب ہی کا وضع کردہ ہے یا سماجی بھوک اور

انحصار کی خواہش نے اسے جنم دیا ہے؟ رشتوں کے معروضی تقاضے کیا ہیں اور ان تقاضوں کی تکمیل یا عدم تکمیل میں رشتوں کے ارتقا کا سفر اور کن 'غیر لازمی' بنیادوں پر ہوگا؟ یا رشتوں کی جتنی بھی اشکال ہیں ان کی سا لمیت، اظہار یا علامتی فرضی اظہاریت میں ہونا چاہیے؟ کیوں رشتوں کے ان مکڑ جالوں کے بغیر انسانی سماج کا ڈھانچہ تیار نہیں کیا جاسکتا؟ کیا کمزور اور مطلب کے رشتوں کو جھٹک دینا چاہیے؟ کیا ہمیشہ حقیقی اور محبت پر منحصر رشتوں کی تلاش میں رہنا چاہیے؟ کیا ہمیشہ ایک عرصے بعد ہر رشتہ بدنما داغ میں بدل جاتا ہے؟ کیا رشتے کی خواہش سراب نہیں ہے؟؟؟

اس قسم کے بے شمار وحشی سوالات ذہن کی رگوں میں آتش فشاں کی صورت پھوٹ پڑتے، دل کی خوشنما شاخوں پر سانپ کی صورت ڈسنے لگتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یکا یک سیاہ بے نور غاروں کی بھول بھلیوں میں جنگلی سور شور مچا رہا ہے۔ یہ کیسا عجیب طلسم ہے؟ یہ داخلی الجھنوں کی کون سی الوہی پکار ہے؟ ہم کیوں کائنات کے رموز کا عرفان چاہتے ہیں؟ ہمارے پاس ایقان کا کوئی خود ساختہ یا خود آزمودہ نظام کیوں نہیں ہے؟ جو ہمیں ساری ناآسودگیوں اور الوہی کربنا کیوں سے نجات دلا سکے؟ لیکن ہماری خود کار خواہشِ نجات کے معنی ہم پر کیا کھلتے ہیں؟ ہم بنیادی طور پر خوشی کے کس مفہوم سے آشنا ہیں؟ اور خوشی کی اصلیت کون طے کرے گا؟ کیا خوش رہنے کی تمام کوششوں کے باوجود ہم تصنع بھری مٹھی بھر زندگی گزارنے میں کامیاب ہوتے ہیں؟ کیا ہم انسان صبح کاذب کو جاگ کر اپنے اپنے چہروں اور دلوں پر اپنے اپنے خود تیار کردہ ماسک لگا لیتے ہیں؟ ہمارا سماج کے ساتھ رشتہ کن بنیادوں پر ہے۔ ہماری انفرادی، خاندانی اور سماجی زندگی میں رابطے کا معیار کون طے کرے گا؟ ہمیں اپنی خواہشات کا کتنا اختیار ہونا چاہیے؟ خواہش کا سبب کیا ہے؟ سوالات کا لامتناہی تسلسل بہتا جاتا ہے۔ کشتی گرداب میں گھومتی جاتی ہے۔ سوال در سوال زندگی کا رنگ مزید گہرا

ہوتا جائے گا۔۔مگر'پانی' کا رنگ پھر بھی 'پانی' ہی رہے گا۔ (کیا آپ اس طرح کے سوالات کے بھنور سے نبرد آزما نہیں ہوئے ہیں؟)

------ ۲ -----

دن سورج کی گلابی رنگت کو سمیٹ کر ڈوب گیا اور فضاؤں کے کانوں میں حشرات کی گنگناہٹ سائیں سائیں کرنے لگی۔ بعض محروم اور نیم روشن کھڑکیوں والے گھروں کی چھتوں پر چاندنی اور اداسی بال کھولے سونے آ گئی۔ پیپل کا درخت اندھیرے کے بدن میں اپنے سرسراتے وجود کو چھپانے لگا۔ رات جو ساری کائنات کا ابدی انجام ہے، جو کائنات کی ماں ہے، پیپل کی نمو یافتہ کونپلوں پر آفاقی صد جہات سے برس رہی تھی۔ یہ رات بھی تو ایک احساس ہے۔ ختم ہو جانے کا، غائب ہو جانے کا، زوال کا ۔۔۔فقط احساس! جس میں ہر آن زندگی کے بے شمار روشن منطقے سیاہ خالی جگہوں میں تبدیل ہو کر اپنی موت کے نوحہ گر بن کر "خود اپنے ہی گرداور اپنے باطن میں مقید ہو جاتے ہیں۔" رات اور دن کی مسابقت میرے دل میں بڑی مہیب حالت پیدا کرتے ہیں، مگر کس سے کہوں؟

میں وجود اور عدم وجود کے درمیان ایک حد فاصل کی جستجو کرتا ہوں اور رشتوں کو ایک کلیدی جواز کے طور پر تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ رشتوں کے جواز کی بازیافت کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بھی ایک ایسے شعوری عہد میں جب تاریخ پہلی بار سیاسی راگوں منتروں سے پاک کی جانے والی ہے۔ میں نہیں جانتا اور نہ ہی اب جاننا چاہتا۔ میں نہ تھا تو کیوں اور میں ہوں تو کیوں؟ یہ سوال لاحاصل ہے۔ کیوں کہ ان سوالوں کا تعلق میرے ہونے سے کم اور میرے نہ ہونے سے زیادہ ہے، جبکہ میں نے ان دنوں دو

حقیقتوں پر ایمان لایا ہے۔ پہلی یہ کہ 'میں ہوں'، دوسری یہ کہ مجھے 'نہیں ہونا ہے'۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ''میں خود میں ہوں، اس لیے نہیں کے کانٹ سوچتا تھا اور میں بھی سوچتا ہوں، بلکہ اس لیے کہ میرے پاس رشتوں کا جال ہے۔ میرے اور دیگر انسانوں کے درمیان احساسات اور محسوسات کا ناقابل تمام سفر، پل صراط ہیں۔ میرے اور دیگر انسانوں کے درمیان خواہشوں کی تکمیل اور عدم تکمیلیت کے ریگستان ہیں، جن کو پاٹنے کی سعی میں ہم عمل زندگانی میں دھنستے جاتے ہیں، میرے اور دیگر انسانوں کے درمیان مابعد الطبعیاتی اپنائیت اور محبت کا رشتہ ممکن ہے۔ میرے اور دیگر انسانوں کے درمیان تعلقات کا ایسا وسیلہ بھی ہے، جس میں بدن کی شمولیت کلیدی، فطری اور لازمی شرط بن جاتی ہے۔

میں خود کسی کے ساتھ وابستہ کر سکتا ہوں اور اس وابستگی کا احساس میرے مٹھی بھر وجود کو توانائی، معنی اور زرخیزی عطا کر سکتا ہے۔ مجھے جب کسی کا انتظار ہوتا ہے، اس وقت وہ لمحہ جو میں حالت انتظار میں گزارتا ہوں میرے اور اس وجود کو ٹھوس بنیاد عطا کرتا ہے۔ میں خود کو عدم وجود کی ہولناکی سے نکال کر روح کو انبساط کی زمین دے پاتا ہوں۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب تحت الثریٰ کی عذاب ناک تنہائی سے نکل کر میں وجود کی ناقابل تفہیم لطافت کو محسوس کرتا ہوں۔

وجود اور عدم وجود کی گفتگو میں زندگی کی مادی عمومیت فنا ہونے لگتی ہے۔ ہر طرح سے نقصان کا خدشہ رہتا ہے، مگر اس عمومیت کے خاتمے کے بغیر عرفان کی گنجائش کے دروازے بھی بند رہتے ہیں۔ عمومیت سے مراد اس مصروفیتِ روز و شب سے بھی ہے، جو اس احساس کو توانائی عطا کرتی ہے۔ کہ ہم جڑوں اور زمین سے مربوط ہیں۔ جڑیں اور زمین احساس ہیں۔ ایک غیر مادی نظام جو فنا نہیں ہو سکتا، مگر بدل سکتا ہے۔

گزشتہ برسوں مجھ میں اپنی جڑوں اور زمین کا احساس بہت گہرا ہو گیا ہے۔

میری ثقافت کی شاخوں سے کوئی مجھے کاٹنے کے درپے تو نہیں ہے؟ کہیں کوئی میری جڑوں کو مسخ شدہ تاریخی مفروضات کہہ کر کاٹ تو نہیں رہا ہے؟ میری زمین سے میری شخصیت کو جو توانائی اور زرخیزی ملتی ہے، میری زبان کی شیرینی اور شادابی میں میری ذات کے جو جواہر پوشیدہ ہیں اور جن سے میری شناخت، میری تاریخ، میرا کل سب کچھ وابستہ ہے، کوئی مجھے سازش بنا کر اس سے دور تو نہیں کر رہا ہے؟ میں اپنی جڑوں اور زمین میں تحلیل ہو جاؤں گا، مگر خود کو کسی دوسری شناخت میں تبدیل نہیں کر پاؤں گا، کیا آپ کر پائیں گے؟ کیا آپ اپنی تاریخ سے کٹ کر جی سکیں گے؟ کیا آپ اپنے یادستان کو فراموشی کے کہرا میں بدل کا ماسک دھار کر اطمینان کا سانس لے سکیں گے؟؟

------ ۳ -----

اسے یاد کرنے کے سبب، اپنے آپ کو خوش رکھنے کی طاقت میرے اندر جا گی ہے۔ یعنی ایک احساس میرے اندر گہرے اتر کر باطن کی سراسیمگی، افسردگی، ویرانی، بیابانی ، رفعت، لطافت، آسودگی، متانت اور اطمینان عطا کر سکتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ وہ کون سی سطح ہے کہ جن پر ہم بے قرار رہتے ہیں؟ وہ کون سی منزل ہے جہاں ایک خارجی مسئلہ پہنچ کر ہمارے اپنے شخصی اور ذاتی رویے کو کریدتا ہے اور ہمیں رنج و ملال کی دلدل میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ہم اپنے وجود کی اساس پر برگشتہ ہو جاتے ہیں۔ وجود ہمیں سخت کوش عذاب ناک سایہ نظر آنے لگتا ہے، جو منفی ہوتے ہوتے ''ہر چند ہے۔۔۔نہیں ہے'' کے گمان کا شکار ہو جاتا ہے، جس کے سبب زندگی آگ کا بے مایہ دریا نظر آنے لگتی ہے۔۔انتشار ہمارا مقدر بن جاتا ہے اور ہم اپنے وجود کی نوعیت پر اس کی شوریدگی پر روتے ہیں کہ ہمارا لہو بے رنگ ہو کر ہماری آنکھوں سے

بہہ پڑتا ہے۔

ہم اس سطح کا تعین کیوں نہیں کر سکتے، جہاں خوش رہنے کے احساس کی ایک لہر ہمارے اندر ایک تبدیلی پیا کرے جو ہمارے ماضی کے رنجیدہ اور بظاہر فراموش کردہ واقعات کو اپنے طلسم سے تحت الشعور کی ویران وادی میں دھکیل دے۔۔ ہمیشہ کے لیے۔ کوئی تو حد ہوگی، جہاں دکھ اور سکھ کی سرحد ایک دوسرے میں مدغم ہوتی ہوئی نظر آئے اور ہم ٹھہر کر گزریں اور گزرتے ہوئے وقت کو معیار بنا کر اپنے حصے کی سرشاری فسوں گری کی پیمائش کر سکیں۔

اس خیال نے ہمیشہ مجھے ایک لطیف ترین ترنگ کے ساتھ ایک شاداب حزنیے میں مبتلا کیا ہے کہ شدید ترین انتشارِ وجود کی حالت میں بھی ایک احساس نے زندگی کی رونق اور تازگی کو میرے جسمانستان میں بویا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ ایک روشن ہالۂ نور رفتہ رفتہ پھیل کر ساری تاریکی کو مات دے دیتا ہے۔ ظلمت اور سیاہی کی روح پر جو حکمرانی ہے وہ کیچوے کی طرح رینگ کر دور نکل جاتی ہے۔ اس کی معیاد کتنی ہے، یہ شاید الگ بحث ہے، لیکن اس امر کے واقع ہونے کی گواہی تو دے سکتی ہے۔ اس اضافی قوت کی تعریف کیسے ہوگی جو ہمیں زندگی کی توانائی مہیا کرتی ہے؟ ہمارے باطن کی فسوں کاری پر ممتا بن کر پھیل جاتی ہے اور ہمارے غیر مانوس المیاتی وجود کو بوجھل پن سے نکال کر ایک ناقابلِ یقین مسرت عطا کرتی ہے۔ محبت اس مسرتِ ذاتی کے حصول کا سب سے بہتر ذریعہ ہے۔ ورنہ انسان زندہ درگور ہو جائے گا۔ کیا آپ زندہ درگور ہیں؟ اگر آپ محبت سے حاصل ہونے والی مسرتِ ذاتی کے بغیر جی رہے ہیں، تو یقیناً آپ زندہ درگور ہیں۔

اس کو یاد کرنا میری عادت نہیں، وہ میری مجبوری نہیں ہے۔ نا میں شعوری طور پر اس کی یاد کو اپنے گرد پھیلاتا ہوں۔ لیکن کم از کم مجھے یہ جاننا ہی پڑے گا کہ آخر کیا بات

ہے، جو مجھے اس کی یاد دلاتی ہے؟ یا یوں کہ آخر کیوں میں اسے یاد کرتا ہوں؟ یاد بطورِ حقیقت کس قدر کی حامل ہے؟ اور اس کی جڑیں طبعی خواہشوں پر ہیں یا ہماری جبلت کا خمیازہ ہیں؟ کیا سارے انسان زندگی کا بڑا حصہ یادستان میں گزارتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو کیا یاد، ایک کائناتی صداقت ہے؟ جو ہر آن آفاق میں سو جاری و ساری ہے، جس سے خدا کو بھی صفر برابر مفر نہیں؟ خیر! خدا پر کمندِ تصور پھینک کر ہمیں کیا حاصل ہوگا ؟ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ مجھے اس کی یاد کیوں آتی ہے، تو جو وجہ میرے ذہن میں اس وقت ابھر رہی ہے وہ یہ ہے کہ (چونکہ) ''میں موجود ہوں اور سوچ بھی رہا ہوں اور عین اس وقت میری ذات کا تعلق عناصرِ حیات سے بھی ہے۔ اسی لیے یہ میری کائناتی جبلت کا ایک عنصر ہے کہ میں تمام عناصر حیات کی جانب اپنے ذہن کو رجوع کروں۔''

یعنی یہ میرے محور کی طرف میری ذات کی مراجعت ہے اور محورِ ذات شخصیت کی تعمیر کے تمام لوازمات سے متشکل ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اکثر و بیشتر جو چہرے میرے تصور میں یا جو نام میرے دل میں ابھرتے ہیں، ان کا کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی رشتہ میری موجودہ زندگی سے بھی ہے۔ میری ذہنی اور تصوراتی زندگی سے ہے۔ میری فکر اور نفس کے سمندر میں ابھرتے مٹتے میرے ہی عکس لاتفسیر سے ہے۔ مثلاً مجھے ان دنوں میری (میری طالب علمی کے دن) خاص کر فلابئیر، دوستوفسکی، ہنری جیمز، منٹو، سارتر، کامیو اور میراجی یاد آتے رہتے ہیں۔ ان ناموں کے پس منظر میں، جو ایک دنیا ہے، میں کم یا زیادہ لیکن اس سے بھی واقف ہوں کہ ان میں سے بیشتر نام اپنے ساتھ ایک المیاتی افسانوی حقیقت رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں درد، شوریدگی، انتشار، کرب اور حوصلہ سب ایک معیار بن چکا ہے، تو ان کی یاد میری ذات کے اسرار اور کائنات کی تنظیم کے سبب ہی ہے۔ اس طرح سوچا جائے، تو یاد ایک تاریخی تسلسل، سفر اور

ارتقائی دستاویز بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قومیں برسوں بعد بھی اپنی تضحیک اور شکست کا انتقام لیتی ہیں۔

ہندستان کی موجودہ سیاسی وسماجی صورت حال اس بات کی گواہ ہے کہ مغل حکمرانوں اور دگر مسلم حملہ آوروں کی تباہ کاریوں کو جواز کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اوراسی تاریخ جواز کی بنیاد پر ہم عصر ہندو معاشرے کا احیا ہو رہا ہے۔ گویا ایک تاریخی انتقام لیا جارہا ہے۔ ہم نے اسرائیل کی تعمیر دیکھی ہے اور ہم ان دنوں سے بھی باخبر ہیں، جب جرمنی نے اس یہود قوم پر زندگی تنگ کر دی تھی .... یہاں تک کہ اس قوم کی معصوم کم عمر بچیوں کے نازک جسمانی حصوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وقت گزر گیا، مگر ہر لمحہ اپنی شدت کے ساتھ تاریخ کی آنکھوں کا حصہ بن گیا ہے۔۔ اور تاریخ ایک انتقامی روداد ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ یہود قوم اپنی تاریخی شکست اور بے عزتی کا انتقام لے؟ ان کی سماجی زندگی کی سیاسی بنیاد ہی تاریخی تشخص کی تکمیل پر ہے۔ یہ زمین کا محوری نظام ہے۔

مجھے اسے یاد کرنے میں ایک خوشی ملتی ہے، جس کی پیمائش ممکن نہیں، لیکن اسے یاد کرتے ہوئے کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ میں اسے کسی طور بھول جاؤں اور مجھے بے پناہ خوشی محسوس ہو، جس کی قدر اور پیمائش ممکن ہو۔

زندگی ایک اذیت ناک داخلی دلدل ہے، جس میں سوائے ہلاکت کے اور کچھ نہیں۔ کیا کبھی یادوں کی دلدل میں گرتے ہوئے آپ نے اس ہلاکت کو محسوس نہیں کیا ؟ کیا کبھی آپ نے یہ محسوس نہیں کیا کہ بعض مخصوص واقعات کی یاد کی دلدل میں آپ کی شخصیت ڈوب رہی ہے ؟ آپ سوائے یادوں کے دفتر کے علاوہ اور کیا جمع کرتے رہتے ہیں؟ یادیں آپ کا واحد غیر مادی سرمایہ ہیں۔ یہ جس قدر ضخیم اور بالیدہ ہوگا وسیع اور عمیق ہوگا، آپ کی داخلی اور قلبی زندگی کو اسی قدر استحکام اور عرفان نصیب ہوگا۔

یادیں علم کی تجربہ گاہ ہیں اور نسلی تشخص کی تعمیر اور تاریخی سفر میں ثقافت کے فروغ اور تحفظ کا واحد ذریعہ۔۔۔ میں اپنے ارتقا کی تاریخ اور ثقافت کے فروغ کی یاد کے ساتھ زندہ وہوں۔ اس وجودی تاریخی سرمایے کو میرے بعد آنے والی نسلوں تک پہنچانے کا ذمہ دار۔۔۔اور مجھے احساس ہوتا ہے: کوئی اس ''یاد'' پر حملہ آور ہے۔ تب میں فیصلہ کن حد تک جہاد کے لیے خود کو آمادہ کرتا ہوں ...... یہی زمین کی تاریخی صداقت ہے۔۔۔اسی سے تہذیبی جبلت جنم لیتی ہے۔

------ ۴ -----

رات دو بجے تک میں کامیو کا ناول Outsider پڑھتا رہا۔ غالباً علی الصباح ہوگی، جب سورج کی تیز کرنیں روزن سے اندر داخل ہو رہی تھیں، جس کے سبب سارا کمرہ طلسمی اجالے سے روشن ہو گیا تھا۔ میں نے پتلی پتلی تین چادروں کو اپنے چہرے کے گرد لپیٹ لیا، ''مجھے سونا ہے۔'' میں ہوش میں رہنے کے چاہ سے دست بردار ہونا چاہتا ہوں، مگر وہ روشنی کا سیلاب مزید تیز ہوا چاہتا تھا اور چادر کے ریشوں کو پگھلا کر اندر داخل ہو کر میرے دیدوں کے بھیتر کے اندھیروں کو چاندی جیسے اجالے میں بدل رہا تھا۔ جب میری آنکھ لگی ہوئی تھی تب کوئی نشانِ خواب نہیں بنا تھا، گویا نیند کے وہ پر کار لمحے وجود کی مراجعت کے ایسے پل تھے جن میں روح بدن سے بیگانہ ہوگئی تھی۔ اب میں دوبارہ ایسے ہی عدم خواب کے حلقۂ نیند میں مراجعت کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے روزن کے شیشے پر پردہ کھینچ لیا، تاکہ سورج کی شعاعیں اس سے ٹکرا کر آگ کے گولے میں لوٹ جائیں۔ میرے کمرے کی یکسوئی اور اپنا پن سادھی نیم تاریکی لوٹ آئے، تاکہ میں اس عذاب پرور چمکیلے اجالے سے نجات حاصل کر سکوں۔ مجھے ناکامی

ہوئی۔ شاید سورج کی کافر شعاعوں میں کسی بد روح کی بد دعا تھی، جو شکلیں بدل بدل کر کمرے میں مدخل ہوتی جاتی تھیں۔ میں نے ایک اور چادر، جو بہت دنوں سے کونے میں پڑی ہوئی تھی اٹھا کر پیٹ میں دبوچ لی۔ لیکن جانے کیوں اجالا میری آنتوں اور رانوں میں سرائیت کر رہا تھا۔ ایک ساعت کے لیے میرے دیدوں میں ایک پیکر ابھرا............نیم تاریکی میں وہ سبز رنگ کا جان پڑا، پھر وہ سبز رنگ کائی میں بدل گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ پیکر مجھے آواز دے رہا ہے۔ آواز دیواروں کے بیچ مرتعش ہوئی اور جانے کس نقطے پر مرتکز ہو کر یکا یک ہوا کی لہروں میں تحلیل ہوگئی۔ شاید میری روح میں وہ آواز محورِ تلاش کر گئی ہو۔ میں ہوں .... میں اسی لیے ہوں، مجھے کس کر دبوچ لو۔ میں نے اپنے ہاتھ رانوں کے درمیان دبوچ لیے۔ وہ کائی رنگ، خاکسری رنگ میں بدل گیا۔ پیکر میرے بستر سے متصل کھڑا ہو گیا۔ میری جانب دیکھ کر مسکرانے لگا، گویا...... پارے کا سمندر آپ کو کھینچ رہا ہو۔ اس آہستگی اور ملاحت کے ساتھ جس سے روح کی تمام مغموم شاخیں ایک مسرور کن احساسِ جمال سے سرشار ہو جائیں۔ میری آنکھوں میں وہی سفید کپاس دار اجالا ہچکولے لے رہا تھا، جس نے میری بائیں پسلی کی دیواروں میں جمی موم کو پگھلانا شروع کر دیا۔ کیا پگھلنے والی موم کے گرم قطرے میری انگلیوں سے ٹپکنا چاہتے تھے؟ میری پرانی پوشیدہ بے رنگ چادر کو وہ پیکرِ خاکستری یوں آہستگی سے کھینچنے لگا، جیسے کوئی گلاب کی پنکھڑیوں سے مہک کی لہریں کشید کرتا ہے۔ میں نے حیرانی اور استعجاب سے آنکھیں کھولیں، اسے دیکھا: ''نہیں مجھے نیند کی جھیل میں غرق ہونا ہے۔'' اس نے میری بات نہیں سنی اور جبراً میرے بستر میں گھس آیا۔ لیٹ گیا۔ میں بے بس اور محکوم تھا۔ اس نے میرے ہونٹوں پر اپنی حنائی انگلیاں رکھیں اور کہا: ''مجھے دبوچ لو............ میں اسی لیے ہوں۔'' میرے اوندھے بدن پر وہ بالکل برہنہ لیٹ گیا۔ اس پیکر کے سینے کی ملائمت مجھے اپنے سینے پر

محسوس ہوئی، تو مجھ پر کھلا کہ وہ کون ہے۔انبساط کا نشہ پہلے روح میں پھیلا پھر ذہن کے مرکز میں ایک نقطے میں روح سمت گئی، پھر چند ساعتوں بعدوہ مرکز گہرے اندھیرے سے بھر گیا جس میں چند لمحات کے لیے احساسِ روح بھی فنا ہو گیا............ روح کے تحلیل ہونے کے سبب دل کی زمین پر پھنسے ہوئے عدم اتفاق اور احتجاج کے فلسفے بھی پگھل پڑے............ اجتماعی شعور کے درخت کی شاخیں موم بن کر شریانوں کی راہ باہر آنے کے لیے مچلنے لگیں ۔ دیواریں خاموشی سے اس موہوم اتصال کی گواہ بن رہی تھیں ۔ بدن کے شور وشر کو چادریں اپنے ریشوں میں جذب کر رہی ہوں گی ۔ دروازے کی کڑی اپنی آنکھوں سے اس رازِ عشقِ نفس کو کھلتے دیکھ رہی تھی ۔مٹی کا مٹکہ اپنے اندر کی نمی باہر چھوڑ رہا تھا۔کیا اس میں بھی میرے نفس کی آنچ موجود ہے ....؟مٹی کے برتن سے الہامی رشتہ ممکن ہے۔ بستر کے اوپر طاقِ نسیاں میں سوئی ہوئی مذہبی کتاب کی آیات شرم اور تحیر آمیزگی کی ملی جلی کیفیات کے ساتھ دیواروں اور کھڑکی دروازوں کے باریک چھیدوں سے بھاگ رہی تھیں ۔موری کے سرنگ شکل سوراخ سے کیچوے اندر آئے ۔ پرانی میز کے اندر کی دیمک کو جگایا اور سب مل کر محوِ تماشا ہو گئے ۔اس کے ہونٹ بادامی رنگ کی آمیزش رکھتے تھے۔ان سے مشک ایسی مہک پھیلی جس سے میری آنتوں میں سفید جھاگ کا سمندر لہریں مارتا رہا۔

یہ جھاگ بھرا سمندر کب سے موجزن ہے؟ کیا آپ کے اندر اس وحشت سے موجیں مارتا سمندر ہے۔کیا سرد سمندر والے انسان کے ساتھ رہا جا سکتا ہے؟ کیا آپ کا جھاگ بھرا سمندر سرد ہے؟ نہیں نا؟

''یہ جھاگ کب نفس سے باہر نکلے گا۔'' میرے منہ سے جملہ ادا ہوا۔دیوروں کے کانوں نے اس جملے کو سن لیا ہو گا۔اس نسوانی پیکر کی گرمی میرے دماغ کی رگوں میں منتقل ہو چکی تھی اور میں اس کی توانائی کے زیرِ اثر روح کے محور پر رقصاں ہو گیا تھا۔تیز

تیز تیز تر .... اس کے چہرے پر بھی ہلکی اوس اُمڈ آئی تھی اور جانے کس درد کی زیریں لہریں اس کی سانسوں میں محلول ہو چکی تھیں ۔ اس کی سیاہ منور آنکھوں میں چمکدار قطرے بنے اور گردن کے پسینے تک بہہ آئے اور میری گردن کے پسینے میں ڈوب گئے ۔ ان آنسوؤں کے قطروں نے مجھے نمی، آسودگی اور تکمیل کے احساس سے آشنا کیا۔

------ ۵ -----

پگھلتی موم کے قطرے میری انگلیوں سے بہہ کر چادر نم کر گئے تھے ۔ میرا سینہ وزنی ہو گیا، میری پلکیں بوجھل ہو گئیں اور یقین کیجیے آنکھوں میں حلقۂ نیند سما گیا، جس کی عدم خوابی میں گھرے بادلوں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا ۔ میں اس نیند کو اس اطمینان سکون کو کس قدر ترستا ہوں، کیا آپ ایسی ہی بے خواب حقیقی نیند کو نہیں ترستے ؟؟

وہ مدھم آنچ کی طرح الگ ہوئی ہوگی اور کٹ بدل کر وہیں سو رہی ہوگی ۔ برہنہ، خاکستری، مطمئین مضمحل ....

------ ۶ -----

دوپہر ایک بجے کے قریب میری آنکھ کے در کھلے ۔ میں فوراً اٹھ کھڑا ہو گیا ۔ دیکھتا ہوں کہ میرا بستر مڑا تڑا پڑا ہے ۔ ایک طرف ایک کونے میں ایک چادر پڑی ہوئی ہے ۔ روشنی در آنے والے روزن پر پردہ گرا پڑا ہے ۔ میں کہاں غرق تھا؟ میرے منہ سے یہ جملہ کیا نکلا؟ علی الصباح کا واقعہ دماغ کے اسکرین پھیل گیا ۔ میں نے چادر اٹھائی،

جس پر موم کے چند قطرے منجمد برف میں بدل گئے تھے۔ چادر میں نے موری میں پھینکی اور نہانے بیٹھ گیا۔ مجھے یاد آیا: آج فریدہ کا یومِ پیدائش ہے۔ مجھے اسے تحفہ دینا ہے۔ وہ خاکستری پیکر تصور بن کر میرے ذہن میں در آئی اور مجھے وہ تحفہ دے گئی...... جو زندگی کے تمام زہر کا تریاق ہے۔ یاد کیجیے۔ کیا آپ کو اس طرح کا تحفۃ السرور کسی نے دیا ہے؟ اگر نہیں، تو آپ کے خوش نصیب ہونے پر شبہ کیا جا سکتا ہے۔

ــــــــــــ ۲ ــــــــــ

''وہ تم سے بہت ناراض ہے۔''

''کیا کہا اس نے؟''

''وہ کہہ رہی تھی، تم سے بالکل بات نہیں کرے گی۔''

مختار میں نے تمھیں پہلے بھی بتایا تھا کہ جب وہ مجھ سے ناراض ہوتی ہے۔ ان لمحوں وہ مجھ سے ملنے کی مشتاق ہوتی ہے۔ کاش تم لڑکیوں کو سمجھتے؟ وہ جن سے محبت کرتی ہیں ان سے ہی روٹھا کرتی ہیں، ناراض ہوتی ہیں، غصہ کرتی ہیں۔ ان کی اصلاح کا بھوت بھی ان پر سوار رہتا ہے۔ خیر میں تم سے کل یونیورسٹی میں بات کرتا ہوں۔ اتنا کہہ کر میں نے فون رکھ دیا۔

میں جانے کن کاموں میں مصروف تھا لیکن دل میں اس کے خیال آتے رہے۔ مثلاً مجھ سے جھگڑنے کے بعد اگر کبھی وہ سہیلیوں کے درمیان بیٹھی ہوتی......اس وقت بھی وہ صرف میرے ہی خیالات میں غرق رہتی اور میرے تاثرات کا مشاہدہ کرتی رہتی اور جب اس کا موڈ ٹھیک ہو جاتا تو خود ہی ہنس ہنس کر بتا بھی دیتی۔ وہ جانتی ہے میں اس کی فطرت سے واقف ہوں۔ وہ اس بات کو محسوس کر چکی ہے کہ میں یہ جاننے

لگا ہوں۔"آئندہ زندگی میں وہ اپنے شوہر سے جزوی محبت ہی کر سکے گی۔"

وہ یہ بات بھی جانتی ہے کہ"متعدد لڑکیوں کے ساتھ روابط رکھنے کے باوجود میں اس کے رنگِ محبت سے نکل نہیں پاؤں گا۔کیا یہ بات درست ہے کہ عہدِ حاضر میں محبت کی قدر"عرصہ"نہیں بلکہ"شدت"ہے؟ الفاظ نہیں بلکہ جذبات ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ محبت کا دارومدار ہر فرد کی ذہنی صلاحیت پر منحصر ہے اور محبت کی کوئی قدر آفاقی نہیں۔ مجھے یہ مفروضہ اتنا ہی بکواس لگتا ہے، جتنا یہ کہ معنی کا تعلق قاری کی علمی صلاحیت پر مبنی ہوتا ہے۔لاکھ سہی مگر متن کی تفہیم سے اہم اس کی تشکیل کی غائیت وضرورت ہے اور اسی میں حقیقی معنی کا التزام پوشیدہ ہوتا ہے۔اسی طرح محبت میں تکمیلِ ذات کی اساس پوشیدہ ہے اور اس کی قدر کا تعین فرد کی تکمیل اور ذات کی تشکیل سے مربوط ہے۔"محبت کی سب سے بڑی اور آفاقی قدر اس کا غیر مشروط ہونا ہے، وہ ساری محبتیں دھوکا اور غیر حقیقی ہیں، جو مشروط ہوں۔ وہ نام نہاد شادیاں، بندھن اور محبتیں اور جو انجام کی فکر کے ساتھ شروع ہوتی ہیں، سب غیر محبت ہے۔"محبت کو اس ملک میں کبھی سمجھا نہیں گیا ہے جس طرح خدا، جمہوریت اور آزادی کو اس ملک میں سمجھا نہیں گیا۔ جب کہ زندگی کی ساری صداقت، آزادی محبت اور خدا میں پوشیدہ ہے۔اوران کی تفہیم اور تلخیص کے لیے مخصوص ثقافتی و ذہنی ترقی درکار ہے۔اس ملک میں وہ افق کبھی نمودار ہی نہیں ہوا۔اسی لیے اس ملک میں محبت کا تصور اخلاقی، سماجی، مذہبی اور اقداری رہا۔ انسانی اور باطنی نہیں۔فطری اور کائناتی نہیں رہا۔

------ ۸ -----

ایک پرانی بات یاد آئی۔لیکچر کامپلیکس کے عقب میں ہم بیٹھے تھے۔جہاں لکڑی کی

میزیں تھیں۔ میزیں جہاں تہاں سے ٹوٹ گئی تھیں۔ میں نے لکڑی کے ٹوٹے ہوئے حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا تھا: ''دیکھو، ہر چیز زوال پذیر ہے۔''

پھر میں نے کہا آج ہماری محبت ہے، کل نہ ہم ہوں گے نہ محبت۔۔ اسے بھی زوال کے سایے سے گزرنا ہے۔ وقت کی دیمک ہر جامد غیر جامد شے کو کھا جاتی ہے، جس طرح بارش کا پانی اس لکڑی کی دیمک زدہ حالت کو برادے میں تبدیل کر کے دوبارہ مٹی کے سپرد کر دے گا۔ بالکل اسی طرح وقت کی بارش ہماری یادوں اور چاہت کو دل کی زمین پہ سے مٹا دے گی۔ ہمارے دماغ خالی ہو جائیں گے۔ مجھے یاد ہے: میری باتوں کو بہ غور سننے کے بعد اس نے ایک بہت چھوٹا جملہ ادا کیا تھا۔ ''داغِ عشق حقیقی دل کے ساتھ جاتا ہے جناب۔'' اس جملے کو سن مجھے یقین ہو گیا کہ اس نے سچ مچ نفسیات سے بی اے کیا ہے۔ پھر اس نے کہا۔ ''تمہاری قنوطیت تمہاری ہلاکت ہے۔ ''تم جانتے ہو میں تمہیں کتنا چاہتی ہوں۔'' (اس کی آواز لرزتی ہوئی محسوس ہوئی۔)'' جہاں سے میرے شوہر کا وزن مجھے ہلکا محسوس ہوگا، تمہارے وجود کا بار اپنے اعصاب پر محسوس کروں گی۔ میں کچھ کہنے جا رہا تھا کہ اس نے ہتھیلی میرے ہونٹون پر رکھ دی۔'' بے وقوف! سمجھتے کیوں نہیں؟ محبت کے لیے شادی ایسی ضروری نہیں۔''

''تم تو پروفیسر شگفتہ علی موڈک کا جملہ دوہرا رہی ہو۔''

''ہاں! بات تو ان کی صحیح ہے۔''

'' بکواس کرتی ہیں وہ۔''

''نہیں وہ صحیح ہے۔ وہ عورت ہے اور جانتی ہے عورت ہونا کیسا ہوتا ہے؟''

'' بکواس بکواس بکواس۔''

ا......ل......ے...... م...... لے......ب...... بو (الے میلے ببو) آواز کھینچ کر وہ کبھی کبھار مجھے یوں بھی مخاطب کرتی تھی۔ گویا میری باتوں کی نفی کرنے پر بضد ہو۔

''نہیں......مگر وہ پروفیسر کی بچی۔''

''چھوڑو چلو ان کو، اتنا مانو میں تمہیں اپنا چکی ہوں۔اس محبت میں، میں بھی داؤ پر ہوں۔''اس نے نظر جھکا لی، پھر آسمان کی جانب اٹھا کر کہا۔''شاید جس کی تلافی ممکن نہ ہو۔''

''میں سمجھتا ہوں۔''

''یہ بھی سمجھو...... ''اس نے رک کر جملہ پھر شروع کیا،''میں چاہ کر بھی تم سے خود کو الگ نہیں کر سکوں گی۔تم اس اختیاری حد کو تجاوز کر گئے ہو۔'' وہ پھر رکی، میرا ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگی۔رات کی تنہائی میں تمہیں اپنے ساتھ محسوس کرتی ہوں۔اس کے بعد اس نے کچھ بہت ہی آہستہ آہستہ کہا تھا جس کا غالباً مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے دل کے صفحے پر میری محبت کے گرم وسیال قطروں کے انجماد کی خواہش میں اکثر خود کو گرفتار محسوس کرتی ہے۔''

''اور میں تمہاری شرابی پلکوں کو پیار کرتا رہتا ہوں، جو تمہاری روح کا دروازہ ہے۔''(میں نے شرارت آمیز لہجے میں کہا)''اور تم سے چمٹا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ ہے نا؟ محبت میں شرارت کا جواب شرارت سے ہی دیا جاتا ہے، ہے نا؟ کیوں؟'' اس کے پاس جو کتاب تھی، اس نے میرے سر پر دے ماری۔اس کتاب کے صفحے بکھر گئے۔شاید کتاب کی بائنڈنگ زندگی کی بائنڈنگ کی طرح کمزور تھی۔غالباً وہ کرشن چندر کا ناول 'شکست' تھا۔وہ صفحے اکٹھا کیے جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی۔تمہیں کچھ اور نہیں سوجھتا؟ نٹ، یو آر اے نٹ، سیکس، سیکس دیوتا۔لکڑی کی میز سے لگ کر کلاس روم تھا۔ سارے صفحات جمع کر کے وہ سیدھی کھڑی ہو گئی۔ہم ایک دوسرے کے روبرو تھے۔ میں نے اس کے سرخ مائل گال پر ہاتھ رکھا۔اس کی آنکھیں تذبذب کے ساتھ میری آنکھوں سے ٹکرا گئی تھیں۔کچھ کہنے کی جسارت نہیں تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

ہم کلاس روم میں گئے۔

''ارے باہر ہی ٹھیک تھے نا؟''

''نہیں۔''

''ارے یہاں اکیلے بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''تم فکر مت کرو، اس وقت پہرے دار کینٹن میں ہوں گے۔''

''اگر آ گئے اور پکڑے گئے تو............؟ ''

''پکڑے گئے تو۔۔۔''

''تمہیں کیا؟ رسوائی تو میری ہو گی۔''

میں نے دروازے کے پیچھے اسے کھڑا کر کے اس کی گردن پر اپنی انگلیاں رکھیں۔

''اسٹوپڈ۔۔۔دروازہ کھلا ہے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ چلو باہر، پلیز۔ ''

''نہیں ''

''پلیز پھر کبھی۔ دیکھو۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''نہیں ......اچھا آؤ......ترکیب ......تم دروازے کے بالکل کونے میں آ جاؤ، میں باہر بھی دیکھتا رہتا ہوں۔''

اس کی سانسوں میں ہلکا ارتعاش تھا اور اس کی پلکوں کے درمیان ہلکی سی تپش۔ وہ دروازے کے پیچھے ہو آئی۔ میں نے آدھا دروازہ کھلا رکھا۔ کمرے میں چھٹپٹا سا اندھیرا چھا گیا۔ مدھم اجالے میں میری انگلیاں اس کے چہرے پر رینگ رہی تھیں۔ اس کی پلکیں کچھ گرم تھیں۔ اس طرح کے محبت آمیز لمحات ہم دونوں کو ایک لافانی احساسِ لذت سے آشنا کیا کرتے۔ ہماری زبانیں فرطِ محبت سے تحلیل ہو جاتیں اور ہمارے

الفاظ ہماری زبانوں پر مرجاتے۔

کسی نے متصل کلاس روم کے دروازے کو زور سے ڈھکیلا۔ (غالباً پہرے دار نے) ہوگا۔ ہم لوگ باہر نکل آئے۔ (ایک طرف واٹر کولر کے پاس کھڑا پہرے دار مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ گوتم بدھ سے اتنی کیوں ملتی ہے۔ شاید میری محبت کا راز اس پر منکشف ہو رہا تھا۔)

کامپلیکس کے احاطے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اس نے بال سنوارے، مجھے کئی بار گھور کر دیکھا۔ پھر کہا: ''جناب، خوش ہوئے؟ اگر وہ پکڑ لیتا، تو گھسیٹتا لے جاتا۔''

''کہاں؟'' میں نے بے نیازانہ انداز میں کہا۔

''جہنم میں، بے وقف قادر ابن دلوائی سر کے پاس اور کہاں؟''

''یہ ممکن نہیں تھا؟''

''کیونکہ آج جو تین پہرے دار ہیں۔ ان کا کینٹن کا بل میرے اکاؤنٹ میں لکھا گیا ہے۔ میں کہہ آیا تھا۔ وہ تینوں میرے دوست ہیں۔''

''تم بہت چالو ہو گئے ہو۔''

''سب تمہاری خاطر۔''

''میری خاطر؟؟''

''ہماری خاطر۔''

''اچھا! خیر۔ اٹھو، چلو، ساڑھے پانچ بج رہے ہیں، بس آرہی ہوگی۔''

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچا۔ جب وہ ضدی بن کر مجھے اس طرح کھینچتی ہے۔ اس وقت وہ بہت معصوم لگتی ہے۔ ایسا لگتا ہے وہ سراپا عشق ہے۔ کس اپنائیت کے ساتھ وہ مجھ پر اتنا اختیار جتاتی ہے۔ کیا آپ پر کوئی اپنا حق جتاتا ہے؟ نہیں، تو سمجھ لیجیے

: آپ محبت سے محروم ہیں۔ یونیورسٹی کینٹن کے سامنے بس اسٹاپ ہے وہاں پہنچے تو دیکھا ڈپارٹمنٹ کے طلبا و طالبات ہیں۔ہم دونوں ان کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے کہ بس آگئی۔ وہ فوراً دوڑ کر بس میں چڑھ گئی۔بس کی پچھلی سیٹ والی کھڑکی سے ہاتھ ہلا ہلا کر بس کے موڑ کاٹ لینے تک علاحدگی کے منظر کو اور تکلیف دہ بناتی رہی۔ میں کینٹن چلا گیا۔نظر دوڑائی تو دیکھا،ایک میز پر ایک طالبہ کے ساتھ وہ پروفیسر بیٹھے ہوئے ہیں، جو افسانہ نگار بھی ہیں۔ میں نے آداب کیا، انھوں نے بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا۔ پروفیسر صاحب نے اس طالبہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا آپ انھیں جانتے ہیں؟''

''ہاں، پروبیلی ایم اے فرسٹ ایر میں ہیں۔''انھوں نے میرا تعارف اس طالبہ سے کیا...... میں نے اسے ہیلو کہا۔اس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔'' میں آپ کو پہلے سے جانتی ہوں۔''

''وہ کیسے؟''

''آپ مہاراشٹر کالج کے بزم اردو کے جنرل سیکریٹری تھے،تب میں جونیئر تھی۔''

''اوہو، بڑی خوشی ہوئی، آپ میرے کالج سے ہیں؟''

چائے آگئی...... پروفیسر صاحب نے چائے پیتے ہوئے انتہائی سنجیدہ انداز میں مجھ سے پوچھا۔''ان دنوں کیا پڑھ رہے ہو؟''

''سر، سارتر کی کتاب Being and nothingness پڑھ رہا ہوں۔''

''کیسی کتاب ہے؟''

''سر، عمدہ ہے۔''

''کیوں؟''

''سر سارتر کا اصرار ہے کہ وجود کے نا قابلِ برداشت بھاری پن کو قابل برداشت لطافت میں بدلنے کے لیے وجود کے اسرار سے واقف ہونا ضروری ہے۔ ۔۔اور مجھے میرے اسرار جاننے کا مرض ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔انھوں نے چائے کی چسکی لی اور ہما کی جانب نظریں جما کر میرا جملہ دوہراتے ہوئے پوچھا۔'' مجھے میرے اسرارا جاننے کا مرض ہے۔تمہاری اس جملے سے کیا مراد ہے؟''

سر میرا خیال ہے کہ'' میں قایم بذات احساس کو لے کر پیدا نہیں ہوا ہوں۔میرا ردِ عمل میری شخصیت کا تعین کرتا ہے اور ردِ عمل کی حقیقت ذات کی حقیقت سے علاقہ رکھتی ہے۔ذات احساسات کے جنگل سے عبارت ہے۔ان کی ہئیت اور ساخت کا تعین روح کرتی ہے، جسے ہم زمین کہہ سکتے ہیں۔ جہاں تک جڑیں پہنچتی ہیں وہاں تک ہم زمین کے رموز سے واقف ہوتے ہیں، مگراس کے آگے بھی بہت کچھ ہے،جن سے ہم واقف نہیں ہیں......وہ ہمارے اسرار ہیں۔''

میں چپ ہوگیا، ہما کی نگاہیں مجھ پر جمی تھیں اور پروفیسر افسانہ نگار کی چائے پر۔

'' آگے بھی کچھ ہے۔'' سے تمہاری کیا مراد ہے؟

(یہ سالے پروفیسرز ،تمہاری مراد کیا ہے؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ پوچھنا کب چھوڑیں گے؟)

میں لمحہ بھر خاموش رہا، پھر ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ میں نے جواب دیا۔'' آگے بھی بہت کچھ ہے۔اس کا اشارہ ہے کہ انسانی عرفان کی جس منزل پر ہم آج ہیں اس سفر کی کئی منازل ابھی طے کرنی ہیں۔ہم پر ہمارے تمام اسرار کھلے نہیں ہیں۔یہ مسلسل جستجو کی علامت ہے۔پروفیسر صاحب کے سنجیدہ چہرے پر مسکراہٹ ابھری،انھوں نے کہا۔'' بیٹے! یہ راستہ تمہیں گہرے سمندروں بلکہ سیاہ سمندروں میں لے جائے گا۔''

''نہیں سر، میرا خیال ہے۔اپنے وجود کے اسرار کا انکشاف مجھے میری اصل کا

شعور حاصل کرنے میں تعاون کرے گا۔ میرے موجودہ شعور کا ادراک میرے وجود سے معمور ہے۔ میں باہر کی دنیا سے زیادہ قابل علم و دریافت ہوں۔''

''خیر مجھے تمہارے معمے اچھے لگتے ہیں، پر سنبھلنا۔۔۔ فلسفہ بڑا اشکنجہ ہے۔''

''سر مجھے زندگی کے لطف سے ماسوا اس کی بصیرت پسند ہے۔''

وہ مسکرائے۔ بل ادا ہوا۔ ہم تینوں کینٹن سے باہر آ گئے۔ کینٹن سے بس اسٹاپ تک تنگ راہ گزر ہے۔ دونوں طرف تار لگے ہوئے ہیں۔ ایک طرف پیلے اور گلابی رنگ کے پھولوں والے پودے لگے ہیں۔ پروفیسر صاحب یونیورسٹی کاٹج میں رہتے ہیں۔ وہ سلام کر کے آگے بڑھ گئے۔ شام اپنی موسیقی لیے وارد ہوئی۔ ہما اور میں بس اسٹاپ پر پہنچ گئے۔

''آپ کی پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟'' ہما نے پوچھا۔

''خاصی تکلیف دہ ہے۔''

''کیوں؟''

''میرا خیال ہے فہم سوائے عذاب کے کچھ نہیں۔''

''مگر ابھی ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ'' اپنے اسرار جاننے کا شوق ہے۔''

''ہما...... بات سچ ہے، مگر بھولو مت کہ وجود کے اسرار کا عرفان زندگی کی آنکھوں پر سے غلاف اتار دیتا ہے اور زندگی کی بیشتر بنیادیں جھوٹ پر مبنی ہیں۔''

''تمہاری باتیں واقعی دلچسپ ہیں۔''

''میں تمہاری تعریف کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔'' (مجھے ہنسی آ گئی) مگر تم ابھی مجھ سے واقف نہیں ہو۔ پھر ہو سکتا ہے، تمہاری رائے بدل جائے۔''

''اچھا...... میں کوشش کروں گی، تم سے کچھ واقفیت حاصل کرنے کی۔''

''یہ ممکن نہیں۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ فرد نہ حالت ہے، نہ ہئیت نہ حقیقت بلکہ ایک تغیر پذیر ما بعد صداقت ہے۔''

''تم سے جیتنا ممکن نہیں لگتا۔'' (ہم ہنس پڑے)

بس یونیورسٹی کیمپس میں داخل ہوئی۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور ہم الگ ہو گئے۔ کاش! مجھے اس وقت یہ علم ہوتا ایک سال بعد ہما کے مقدر میں خود کشی تحریر ہے اور اس کا سبب ایک ''حقیقی غیر مشروط محبت'' کو بننا ہے۔

------ ۹ -----

اس کا انتظار اور اسے یاد کرنے میں دو دن دبے پاؤں گزر گئے۔ میں دل کی لطافت میں ڈوبا رہا۔

دو دن بعد اس نے آنے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ نہیں آئی۔ میں نے فون کیا، تو علم ہوا کہ اسے بخار نے گھیر لیا ہے۔ میں یوں ہی سا منہ بنائے لائبریری میں بیٹھا شفاف شیشے کی کھڑکیوں سے باہر چلچلاتی دھوپ کی لہروں کو دیواروں اور پودوں کی رگوں میں اترتے دیکھ رہا تھا۔ ہوا پگھل کر ہر طرف چھاؤں تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ ایک طرف بیر کے پیڑ کی چھاؤں چھوٹے چھوٹے دھوپ کے خانوں میں منقسم دل کش لگ رہی تھی۔ کسی طرف سے پرندے کی کوئی آواز نہ آتی تھی۔ سب کے سب شاید دور کہیں کسی جھیل کی گود میں جا کر اپنے پروں میں اٹکی دھوپ کو نکال رہے ہوں گے۔

لائبریری میں سوائے ایک عیسائی لڑکی کے اور کوئی نہیں تھا۔ وہ کچھ اس ڈھب سے ملبوس تھی کہ بس ...... باہر موسم کے سبب گرمی یہاں اندر یہ گرمیِ خواہش !! میں اسے نظر بھر دیکھتا، تو میرے اندر کی تاریک گپھا سے ایک اژدہا سامنہ اونچا کیے ہنکارتا ......اور اس طلسمی اژدہے کی روشن آنکھوں اور شعلہ زبان سے آگ کی لپٹیں پھیلتی تھیں ۔گرمی کا شدید احساس میرے اعضا میں تشنج کی شکل اختیار کرلیتا۔ یہ آگ مزید مشتعل ہوتی کہ وہ دروازے سے مسکراتے ہوئے لائبریری میں داخل ہوئی، اپنا اسکارف ڈھیلا کیا اور اُف کہتے ہوئے بیٹھ گئی۔

''اُف کتنی گرمی ہے باہر؟'' اس نے کہا۔

''اندر بھی اتنی ہی ہے۔'' میں نے کہا اور اشارتاً آنکھیں اس عیسائی لڑکی کی طرف موڑلیں۔

''اوہ! جناب میری غیر موجودگی میں گرم ہوئے جا رہے ہیں۔''

''نہیں، بس آنکھیں سینک رہا تھا۔'' میں نے یوں ہی کہا۔

''چلو......اٹھو......اٹھو چلو...... یہاں نہیں بیٹھنا......چلو۔''

''پہلے یہاں سے اٹھو، چلو باہر۔''

''باہر گرمی ہے۔'' میں نے کہا۔

''گرمی، تو یہاں بھی ہے۔'' اس نے منہ بنا کر کہا۔

''اچھا، اچھا۔۔۔او کے چلتے ہیں۔''

ہم دونوں لائبریری سے باہر نکل آئے۔لائبریری کے باہر ایک چھوٹا باغ ہے۔ اس کے گرد سرو اور گل مہر کے پیڑ لگائے گئے ہیں۔ باغ میں مالی پانی دے رہا تھا۔گل مہر کے پیڑ ہلے اور ہوا کے چند جھونکے دروازے کی سمت آئے۔ جی کچھ ہلکا محسوس ہوا، اژدہا پسینے کی بوندوں میں بدل کر بہہ پڑا۔ لائبریری کے باہر کچھ ہوا ہے......لیکن اندر

......اندراب صرف گرمی رہ گئی ہے۔

اس نے گلابی شلوار قمیض پہنا ہے، جو اسے معلوم ہے کہ مجھے بہت پسند ہے۔اس لیے بھی کہ وہ رنگ اس کی جلد کو حسین تر بناتا ہے اور اس لیے بھی کہ اس کی چھاتی پر سیمیں رنگ کے بٹن لگے ہوئے ہیں، جن سے مجھے بہت سہولت ہوتی ہے۔اس کے بال گہرے سیاہ اور لمبے ہیں۔ جو اس کی کمر تک پہنچ کر خم دار ہو جاتے ہیں۔ درمیان سر وہ مانگ نکالتی ہے اور بائیں کلائی پر پتلی گھڑی پہنتی ہے۔ کاجل پلکوں کی دونوں جانب لگاتی ہے اور ہونٹوں پر ہلکی گلابی رنگت۔ اس کے کولہے ابھرے ہوئے اور چھاتیاں بھری بھری سی ہیں جن میں میرے لیے کاہِندایسی کشش ہے۔

لائبریری سے نکل کر ہم دائیں ہاتھ کی طرف مڑے۔ جہاں لیکچر ہاؤس ہے۔ہم اس کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔

''پہلے یہ بتاؤ، تمہیں کس مرض نے گھیر رکھا ہے؟''

''ارے کچھ نہیں۔''اس نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''مگر پتہ تو چلے؟''

''کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''اس نے مزید مسکراتے ہوئے کہا۔ مجھے کچھ برا سا لگا۔

''ہاں مجھے تو...... تمہاری کوئی فکر ہی نہیں۔''ناراض ہو کر میں نے کہا۔

''مجھے پتہ ہے، مجھے پتہ ہے، میری خاطر تم فکر مند ہو۔''اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''پھر بھی تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔''

''......کچھ باتیں ہوتی ہیں، جو لڑکوں سے چھپائی جاتی ہیں۔''اس نے کہا۔ اس کے گال سرخ ہو گئے۔

''اونہہ، بتاؤ نا ایسی کیا بات ہے؟''

''۔۔۔مانو گے؟ الو جو ہو!''

''چلو، الو ہی سہی...... بتاؤنا۔''

یک لخت اس نے نظریں اوپر اٹھائیں اور مجھے دیکھنے لگی۔۔متواتر سفید روشنی پھیلی ہوئی پر کشش آنکھیں۔جن میں حیا کی سرخ لکیریں لہو کی مثل دمک رہی تھیں۔ مجھے اندر باہر سے کھنگال گئیں۔ میں نے اس کے سر پر ہتھیلی ماری اور کہا۔''یوں نہ دیکھو یار! سارا ہوش جانے لگتا ہے۔'' وہ ہنس پڑی۔

''ایکچولی، میرے ڈیز رک گئے تھے۔''

اس نے معصومانہ سفاکی سے کہا اور اپنے ادا کیے ہوئے لفظوں کے دریا میں غوطہ زن ہوگئی۔زوردار قہقہہ لیکچر ہاؤس کی سیڑھیوں پر پھیل گیا۔اس اصرار کے ساتھ کے برسوں تک ان قہقہوں کی بازگشت آپ کو محسوس ہوگی۔(مجھے معلوم نہیں تھا جس شب میری آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر مجھے نامعلوم مقام پر لے جایا جانے والا تھا اس دن ان قہقہوں کو میرا تعاقب کرنا تھا۔)

باب سوم

یادداشت اور فراموشی

"The struggle of man against power is the struggle of memory against forgetting."

—Milan Kundera

(The Book of Laughter and Forgetting)

ـــــــ ا ـــــــ

زیرِ حراست خالد حسین کی موت واقع ہوئی ہے! لاش کل شام تک ممبئی پہنچ جائے گی۔
میں مرحوم کے گھر ملوں گا۔

....

دروازہ کھول کر میں کمرے میں داخل ہوا تو سامنے ایک پرزے پر نظر پڑی، جو مختار میرے لیے چھوڑ گیا تھا۔ مضمون پڑھنے کے بعد ایک ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر ابھری، پھر آنکھیں نم، پھر چند ساعتوں کے بعد ذہن کی اسکرین پر ایک ہنستا ہوا وجود ابھر آیا اور اطراف کا وہ حصہ، جو ابھی تک اندھیرے میں تھا۔ ہلکا روشن ہو گیا۔ وہ مسکراتا ہوا چہرہ تڑا مڑا اور پھر منتشر ہو کر بکھر گیا۔ ذہن کے اسکرین پر لفظوں کا رقص رہا...... پھر نقطے یکجا ہوئے اور چہرہ دوبارہ مکمل ہو گیا۔ غصے سے لال پیلا چہرہ، حکومت، نظام، فسطائیت، سماج واد، جمہوریت اور کمیونزم کے خلاف اپنے خیالات کا نا قابلِ سماعت رفتار سے اظہار کرنے لگا۔

یہ ہیولہ، جس کا وجود اس لمحے سے قبل تک با معنی تھا۔ با مقصد تھا۔ با عمل تھا۔ خالد حسین کا ہے۔ جس نے انگریزی ادب میں گریجویشن کیا تھا اور کالج کے ابتدائی دنوں سے کمیونسٹ پارٹی کے لیے کام کیا کرتا تھا۔ مارکس، لینن، چے گوار اور کاسٹرو کی تصاویر اس کے گھر میں جا بجا آویزاں تھیں۔ اس کی اپنی چھوٹی سی لائبریری تھی۔

۔کمیونسٹ پارٹی کے کئی ارکان کا اس کے گھر آنا جانا تھا۔ چونکہ اس کے والد کمیونسٹ پارٹی کے اہم ترین ذہن ساز لیڈر رہے تھے اور بزرگ کمیونسٹ تصور کیے جاتے تھے۔ اسی سبب وجہ وہ بھی آزدانہ ماحول میں رچا بسا تھا۔ اس قدر سخت مزاج کمیونسٹ خالد حسین گزشتہ پانچ برسوں سے کچھ چڑ چڑا سا ہو گیا تھا۔ اس کی عمر ۴۲ سال ہوگی۔ ان برسوں اس کا اعتماد کمیونزم پر سے اٹھ گیا تھا۔ سارے روسی ادب کو اس نے (خاص طور سے مارکسی تحریک کے زیرِ اثر لکھے گئے) ردی کہتے ہوئے دوستوں کو دے دیا تھا۔ اسے ان ادیبوں سے اس قدر نفرت ہو گئی تھی کہ پھر اس نے اپنی گفتگو میں ان تذکرہ بھی کرنا چھوڑ دیا۔ کمیونسٹ لیڈروں کی تصاویر اس نے نذر آتش کیں۔ صرف چے گوار کی ایک تصویر اس کی لائبریری میں بچی رہی، جس کی طرف دیکھ کر وہ مسکرایا کرتا تھا۔ شاید اسے احساس تھا کہ چے گوار کی موت کے ساتھ کون سے راز نئی دنیا میں دفن ہو گئے ہیں۔ یہاں وہ مذہب کے متعلق طرح طرح کے سوالات پوچھا کرتا تھا۔ عموماً تشکیک زدہ، مگر انتہائی علمی اور دیانت داری کے ساتھ۔۔۔ پھر کمیونزم کے زوال اور بوسنیا میں مسلمانوں کی نسل کشی نے اسے بنیاد پسند مذہبی گروہ کے قریب کر دیا۔ چند برسوں میں وہ انتہا پسند اسلامی تنظیم کے اہم ترین نمائندوں میں شمار کیا جانے لگا۔

کشمیر کی تین بنیاد پرست تنظیموں کے اکابرین سے اس کے روابط بہت گہرے ہو گئے تھے۔ اس بات کا علم مختار کے علاوہ کسی اور کو نہیں تھا۔ سنیچر کی رات جب بھی شہر میں موجود ہوتا۔ اپنی سفید رنگ والی کار لے کر رات دس بجے کے آس پاس میرے مکان پر حاضر ہو جاتا۔

گزشتہ سال سخت ٹھنڈ پڑ رہی تھی۔ لوگ باگ سرِ شام ہی گھروں میں سمٹ رہے تھے۔ تب ایک رات خالد حسین گیارہ بجے کے آس پاس میرے یہاں وارد ہوا۔ وہ اکیلا تھا...... میں نے چائے بنائی۔ چند چسکیاں لی گئیں۔ میں اسے اپنی محبوبہ کے

متعلق کچھ بتانا چاہتا تھا کہ اس نے میرے ہاتھ پر یکا یک اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی۔ میری اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں نے اس کے دیدوں میں محفوظ باتوں کو پڑھنا چاہا۔ کمرہ ویران برفاب کھنڈر میں بدل گیا اور ہمارے بدن یکا یک اڈے ہوئے احساسات کے ناقابلِ بیان ڈر کی وجہ سے منجمد ڈھانچے بن گئے۔ ویرانی اور خاموشی کے سمندر میں پیدا ہوئے ہوا کے شور سے ہمارے کانوں کے پردے بادبانوں کی مثل پھڑ پھڑانے لگے۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی، جو چے گوارا کے چہرے پر ہوا کرتی تھی۔ میں اس میں پوشیدہ مفہوم کو سمجھ نہیں سکا۔

....

..........اس نے پتلون اتار دی......اس کی ران پر پستول بندھا ہوا تھا۔ جس پر نظر پڑتے ہی میری آنکھیں حیرانی سی دائرۂ چشم میں سکڑ گئیں۔ میرے دیدوں میں ایک وحشت سی پھیلی۔ اس وحشت میں دیوداسی کا رقص بھی شامل تھا۔ جس میں میں بہت دور سے آنے والی گھنگروؤں کی شوریدگی کو محسوس کر رہا تھا۔ میرے کانوں میں برف کڑ کڑا کر ٹوٹ رہی تھی۔ میں نے فوراً اٹھ کر کھڑکی بند کر دی جس نے کمرے کو زنداں میں بدل دیا۔ ''میری آنکھیں ابر تصویر منجمد رہیں۔''

....

''خالد وحشی ہو گئے ہو؟''

(اس کے چہرے پر دبیز مسکراہٹ کی لہر......)

''کیا ہو گیا ہے؟......کیا کرنا چاہتے ہو؟ خالد کس طرف جا رہے ہو؟ تمہیں اس ہتھیار کی ضرورت کیوں پڑ گئی......؟ خالد تم ادب کے طالب علم تھے! پھر۔۔؟''

''میں زندگی دیکھ رہا ہوں، مسلمان ہوں، میں زندہ رہنا چاہتا ہوں ...... میں نفی نہیں ہوں...... مجھے زندہ رہنا ہے، میں زندگی دیکھ رہا ہوں ......لفظوں کی آڑی ترچھی

لکیریں ہوا میں کھینچ کر وہ چپ ہو گیا۔

''تم زندہ ہو......اور محفوظ ہو......تم کو کون مار سکتا ہے۔''

''وہ'' (اس نے اس قدر متانت کے ساتھ کہا، گویا کوئی دشمن کی بیوہ کے سر شفقت سے ہاتھ رکھ رہا ہو۔)

''کون وہ؟''

''وہ، وہی لوگ!''

''کون لوگ، خالد بتاؤ، تمہیں اس طرح کا قدم ہرگز نہیں اٹھانا چاہیے۔''

''وہ ہم سب سے طاقتور ہیں!''

''یار بول......آخر کون ہے وہ......؟ بول......بھینڈ چود کون ہے؟''

''گالی سے ہم اتنے بڑے دشمن کو نہیں مار سکتے۔'' اس نے میرے برہم انداز گفتگو پر آہستگی سے کہا۔

''اچھا۔۔۔چل پھر بتا...... (میں نے چائے کا گلاس میز پر رکھا) یار تجھے اس طرح دیکھ کر میرا دماغ تو کھراب ہو گا ہی......میں کیسے قابو میں رہوں گا؟ تو بیٹھ...... مجھے بتا کیا مسئلہ ہے؟''

وہ میز پر بیٹھ گیا، پستول اس نے میز کے ایک کونے میں رکھا اور گردن جھکا کر چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ اتنے کم سمئے میں اتنا شانت ہو گیا مانو......بہت بڑا طوفان دریا کی تہہ میں ڈوب گیا۔ آکاش گنگا میں چاند کسی بھنور میں ڈوب گیا۔ ٹھنڈی ہوائیں کمرے میں رینگ رہی تھیں اور مجھے ایسا لگ رہا تھا، بہت دور جنگلوں سے آنے والی دیوداسیوں کی وحشتِ گھنگھرو رفتہ رفتہ واپس جا رہی ہے اور شہر کی عمارتوں میں پھنسے ہوئے شور کے ٹکڑے، چیخیں اور بمبئی کی جھوپڑپٹیوں کی گلیوں سے سوروں اور کتوں کے

رونے کی آوازیں یک دم سے زیرِ زمین بہنے والی نالیوں میں دب گئی ہیں۔ میں بھی میز پر بیٹھ گیا۔ خالد نے سگریٹ جلایا۔ ہمارے ذہنوں میں لوکل ٹرین کی پٹریاں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں اور ہمارے چہروں پر خامشی تھی۔ ہم لمحوں کی خاموشی کا حسن دیکھ رہے تھے۔ اندھیرا رات کی کوکھ میں سرائیت کر رہا تھا۔ زمین جانے کس کس سیارے اور نظام شمسی کے گرد رقصاں تھی۔

''خالد کسی نے دھمکی دی ہے تمہیں؟''

(اس نے گردن اوپر کی، نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں) ''پاگل ہو؟ ہمارا دشمن ایک فرد نہیں ہے، ایک گروہ نہیں ہے، بلکہ ایک شکست خوردہ ازدحام ہے۔ وہ جو اس ملک میں 1923 سے سے پروان چڑھ رہا ہے۔ جس نے کئی انسانوں کی زندگی بھسم کی ہے۔ وہ ہم سے ہماری زندگی چھین رہا ہے۔ وہ ہماری لاشوں اور بدحالی کو دیکھ کر جوان ہوا ہے۔ اس کی بنیاد ہماری تاریخی شناخت کو مٹانا ہے۔ اس کی رڈار کی زد میں وہ نسلیں بھی ہیں جنھوں نے ابھی سانس بھی لینا شروع نہیں کیا ہے۔''

''خالد (میں میز سے اتر کر خالد کے پاس جا کھڑا اور اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا) خالد ظلم کی معیاد کم ہے...... وہ خود ہی ہار جائیں گے۔ صبر کرو خالد میں بھی تو ان کا victim ہوں، کیا کم کھویا ہے میں نے...... (خالد نے میری گردن میں اپنی انگلیاں گاڑ دیں) خالد ترشول والوں نے میری (خالد نے گردن کے گرد انگلیوں کی گرفت کس لی) بہن......انھوں نے اسے ''ن''......خالد نے مجھے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ میری آنکھوں سے گرم قطرے اس کے سینے میں دفن ہو رہے تھے۔ اس کے سینے کے بال میرے ہونٹوں سے چپک گئے تھے...... میری رال بہہ رہی تھی، اس نے میرے سر کے بال انگلیوں کی گرفت میں پکڑے پھر...... ہلکے ہلکے انھیں سہلانے لگا۔

....

پھر وہ اپنے انداز میں کہنے لگا۔ ''رومت، رومت، رونا کسی مسئلے کا حل نہیں ہے۔ رونا شکست تسلیم کرنا ہے۔ رونے سے کھوئی ہوئی عزت واپس نہیں ملتی۔ رونے سے کچھ نہیں ملتا۔ رونے سے خواب ٹوٹ جاتے ہیں۔ رومت...... ہم بڑی بہت بڑی قوم ہیں ...... ہمیں زندہ رہنا ہے، ہمیں عزت و حمیت کے ساتھ زندہ رہنا ہے...... ہمیں کوئی جھوکا نہیں سکتا...... ہم طاقت کی علامت ہیں ...... ہم تاریخ ہیں ...... رومت، کتنا روئے گا؟ روکر کیا ملے گا؟ ''زندگی''، عزت، بہن...... رومت۔۔ اس سے بزدلی اور گھٹن ملتی ہے۔ (اس کی آواز وزنی ہوگئی تھی اور سسکیاں تیز) رومت پاگل ...... تو، تو جمہوریت میں believe کرتا ہے...... پھر تو کیوں روتا ہے؟ تو، تو سیکولرزم اور آرٹ کا دیوانہ ہے نا؟ تو کیوں روتا ہے؟ دکھ تو مجھے ہے۔ کیونکہ میں صرف مسلم ہوں ...... بنیاد پرست تم کہتے تھے نا؟ مجھے اپنی قوم کی تجدید اور بقا عزیز ہے۔ یہ دکھ تو میرا ہے تو کیوں روتا ہے؟ ذلت، شکست اور تباہی تو میری ہوئی ہے...... عزت میری بہنوں کی تارتار ہوئی ہے ...... تجھے کیا؟ پاگل (وہ پھر ہلکے ہلکے میرے بال کھینچ رہا تھا) پاگل مت رو، رونے سے کچھ ملتا ہے کیا؟'' ایک بہن کی ذلت آمیز ہلاکت پر رو رہے ہو...... میری ہزاروں بہنوں کی عزت ترشول والوں نے خاک میں ملائی ہے، مجھے تو خودکشی کر لینی چاہیے۔'' پن نہیں، میں زندہ رہوں گا، میں قوم ہوں۔ میں بہت بڑی قوم ہوں...... میری جنگ وقت سے عظیم ہے۔ آج ضرور میں کمزور پست، کم علم بکھرا ہوا ہوں، لیکن اس کے باوجود مجھ میں دفاع کی صفت ہے۔ مجھے بھی اپنی شناخت کے ساتھ، عقائد اور نظریات کے ساتھ زندہ رہنے کا حق ہے اور اپنے اس حق کے لیے میں آخری فرد کی صورت لڑتا رہوں گا۔ میں ان سب کے ارادوں کے خلاف نبرد آزما رہوں گا، جو میری شناخت کو کچلنا چاہتے ہیں۔ میں انھیں پست کروں گا۔ میں نقشے پر کھینچی گئی جغرافیائی حدوں کو نہیں مانتا۔ میں کشمیر ہوں۔ میں روس ہوں۔ میں بوسنیا

ہوں۔ میں الجیریا ہوں، میں انڈیا ہوں۔۔ میں دنیا کی آواز ہوں۔ میں امن ہوں۔

(میری سسکیاں ڈوب رہی تھیں) میں امن ہوں...... میں ہوں...... سن رہے ہونا؟ میں ان سے انتقام لوں گا...... سب کی عزت کی خاطر (اس نے میرے بال زور سے کھینچے اور دیوار سے لگا دیا) لے یہ پستول، (اس نے میز سے اٹھا کر میرے ہاتھ پر رکھا۔) یہ کسی بھی وقت تیرے کام آئے گا۔ جنوری سے مارچ تک ہم لوگ ان سے انتقام کا ایک بڑا پلان بنا رہے ہیں...... دھماکہ اتنا بڑا اور با اثر ہوگا کہ ان کے دماغ کی رگوں کے ریشے ٹوٹ پھوٹ جائیں گے، جبر کے حوصلے پست ہو جائیں گے...... درندہ صفت جنگلی سور اپنی تاریخ کی سیاہ گپھاؤں میں دوبارہ گھس جائیں گے۔ (وہ متواتر انگریزی میں کہے جا رہا تھا) اور ان کے سیندور لگے ظلم رنگوں سے سجے ترشول، ان کے سیاسی بیانات اور میری تاریخی شناخت مٹانے کے ان کے سڑکوں پر تھوکے ہوئے خواب، ان کی آنکھوں سے اڑ جائیں گے۔ وہ جان جائیں گے، ''جبر صرف جبر کو جنم دیتا ہے۔''

اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس نے سانس درست کی اور پھر کہا۔ ''رکھ یہ پستول رکھ...... اگر بعد میں کچھ ہوا، تو تیرے کام آئے گا...... ڈر مت...... یہ بات صرف ہمارے درمیان ہے...... اور کل میں سری نگر جا رہا ہوں...... پھر اس راز کو جاننے والا کوئی نہیں ہوگا...... چل اٹھ، تھوڑی چائے بنا۔ ہمیں زندہ رہنا ہے۔ اپنے عزیزوں کی زندگی کو مستقبل کے hollowcaust سے بچانا ہے۔'' میں اٹھا۔ کھڑکی کھول دی۔ ...... سامنے آسمان پر پورا چاند نظر آ رہا تھا...... جو ہلکے نیلے زرد کہرا کی چادر کے اس پار زندگی کا احساس دلا رہا تھا۔ کمرے میں باہر سے ٹھنڈی ہوائیں چلی آئیں۔ میرا نظام تنفس دوبارہ ٹھیک ہونے لگا۔

کیا سچ مچ تاریخی شناخت کو آشکار کرنا اور کارگہہِ شیشہ گری بہت نازک کام

ہوتے ہیں؟ کیا اس کی میخیں نظر اور دل میں پیوست ہوتی ہیں؟ کیا تاریخی شناخت سے کٹ کر فرد بے معنی ہو جاتا ہے؟ کیا اپنی شناخت کو بچانے کے لیے خالد حسین کی دیوانگی کو تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ کیا انسانی جبر کے خلاف لڑنا بھی جبر ہے؟ میں بہت کنفیوژ ہوں...... کچھ آپ ہی بتائیے۔

۲

یہ اس کے ساتھ میری آخری ملاقات تھی۔ غالباً پھر وہ کشمیر چلا گیا تھا۔ مجھے اس کا کوئی پیغام موصول نہیں ہوا۔۔۔ ہاں لیکن میں یہ سمجھ گیا تھا کہ اب اس کی زندگی کے تار کشمیر تحریک سے جڑ گئے تھے۔ اس کا خواب تھا کہ کشمیر حکومتِ ہند کے قبضے سے آزاد ہو جائے۔ ایک خود مکتفی آزاد اسلامی ریاست بن جائے۔ ممکن ہے اس خواب کی تکمیل میں وہ بہت دور تک بہہ گیا ہو۔ اسے اس بات کا علم تھا کہ کشمیر پر حکومت ہند کی گرفت نا قابلِ تسخیر ہے۔ (اس کے باوجود اس کا اعتقاد اس کے اللہ پر زیادہ تھا، جو اس کی مدد جانے کن وسیلوں سے کرنے والا تھا۔)

اسے اس بات کا علم تھا کہ زمین کا یہ حصہ وقار کا مسئلہ بن گیا ہے اور زمین کے اس حصے کو بچانے اور اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے حکومتِ ہند کسی بھی حد تک جا سکتی ہے۔ طاقت استبداد کا سرچشمہ ہے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ کشمیری عوام کے پاس کوئی مرکز گزیدہ راستہ نہیں ہے۔ غریب اور محروم، حتیٰ کہ انسانی حقوق سے بھی محروم عوام کے پاس احتجاج اور سیاسی فیصلوں کی سماعت کے علاوہ اور کیا ہے؟ وہ کہا کرتا تھا کہ اس سیاسی احتجاج کے ردعمل میں انھیں جمہوریت پسند سپاہیوں کی جانب بربریت کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا۔

میرا خیال تھا کہ تاریخ کا ایک باب حب الوطنی اور دوسرا باب آزادی کی ''ناکام اور نامکمل جدو جہد'' کے نام سے سرحدوں کے آر پار سانس لیتا رہے گا۔اسی سرحد پر لاکھوں افراد کی ہلاکت، گم نام قبروں کی آہ وبکا اور تاریک راتوں میں بہائے گئے سرد خون کی بُو سے اٹھنے والا غبار ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ برف باری کے موسم میں یہ غبار کبھی کبھار منجمد ہوکر پیڑوں کی شاخوں پر سویا کرے گا۔

چند کلومیٹر کی جغرافیائی مسافت تاریخی صداقت کو کس حد تک متاثر کرتی ہے؟ سچ کس قدر مبہم ہے؟ سچ کہاں گم ہے؟''

''ہم سب: جتنا جانتے ہیں۔وہ وہی ہے۔جو حکومت چاہتی ہے، ہم جانیں۔ہم سب: جو کچھ بولتے ہیں۔وہ وہی ہے۔جو حکومت چاہتی ہے، ہم بولیں؟'' یہ آزادانہ جمہوری طرزِ زندگی ہے کیا؟ کیا جمہوریت بذاتِ خود جمہوریت کی دشمن ہے؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں پڑتا...... میں کنفیوژ ہوں۔۔کنفیوژ ہی شاید مروں گا...... دیکھ لینا۔کیا یہ خیالات صرف مجھے پریشان کرتے ہیں؟ کیا میری طرح کوئی اور ان سے نبرد آزما نہیں؟

------ ۲ -----

جمہوریت کے نام پر جتنا دھوکہ سیاست دانوں اور وقتی حکومتوں نے عوام الناس کو دیا ہے، وہ ایک نادر مثال ہے: بہترین نظریے کے خمار میں گرفتار کر کے عوام کی قوتِ یادداشت کو شکست دینے کا۔دیکھا جائے تو جمہوریت ایک طرح کی افیم ثابت ہوئی ہے جس کا استعمال لوگوں کی یادداشت، بنیادی انسانی حقوق، سماجی تعلقات، اور تہذیبی امتیازات کو فراموشی کے کوزے میں بند کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔حب الوطنی

کے تاریک اور طلسمی درندہ صفت سمندر میں ڈبونے کے لیے کیا گیا ہے۔ سادہ لوح لوگوں نے اعتبار اور ترقی کے پروپیگنڈے کی ترنگ میں حیات وممات کا احساس تک کھو دیا۔ روز وشب کی سلسلہ وار پیہم سعی میں زندگی اپنا جوہر کھو بیٹھی ہے۔ بارِ گراں زندگی کو مواصلات کی اینٹوں تلے اس قدر پکایا گیا کہ دلوں کی مشک بجھ گئی ہے خواہشوں کے مردہ منجمد دھبے داغِ دل بن گئے ہیں۔ اب تو داغ بھی مردہ کائی رنگ میں رفتہ رفتہ بدل رہے ہیں۔

جمہوریت منشیات کی دکان ثابت ہوئی۔ سیاسی مفاد پرستی نے ذہنی تشنج اور باطنی خلفشار کو جنم دیا۔ جمہوریت ایک کارگر کلوروفارم ہے۔ جس کے استعمال سے ہندستانی عوام کو انسانی اقدار اور اصولِ حیات سے بے خبر کر دیا گیا۔ افراد کی مجموعی یادداشت کو فراموشی کے اتھاہ سمندر میں ڈوبا دیا گیا۔ جبر کے سمندری گھوڑے گاؤں، شہروں اور گلی کوچوں کی شانتی کو روندتے ہوئے گاندھی کی دھوتی پر حملہ آور ہوئے : اب سڑکوں کے اطراف نالیوں میں برہنہ، مغموم اور شکست خوردہ گاندھی کی تصاویر گری ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔۔۔ کسی کو گاندھی کے فسوں کا احساس نہیں ہے۔

ذرائع ابلاغ کے ذریعے یہ غیر انسانی گھوڑے (جن کی کایا بہت جلد بدل جاتی ہے) اب سفید کرتا پاجامہ اوڑھے رہتے ہیں۔ سر پر سفید ٹوپے پہنے ہوتے ہیں گھر گھر سرایت کر چکے ہیں۔ لوگ: جو خود بھی میٹا مورفورس کے عمل سے گزرے ہیں۔ اب کتے بن کر ان سفید گھوڑوں کی حفاظت کا فریضہ ادا کرنے لگے ہیں۔ خود فراموشی کی ایسی مثال جدید دنیا میں اب کہیں اور نہیں مل سکتی۔ حد تو یہ ہے کہ اگر یاد کی ایک لہر اگر کہیں کسی کی آنکھ میں کروٹ لیتی ہے۔ وہ میٹا مورفوزڈ گھوڑے کے بھیانک، خونخوار چہرے۔۔۔ اور خونخوار دانتوں کو پہچان لیتا ہے۔ اس پر بھونکنا شروع کرتا ہے۔ دوسروں کو بیدار کرنا شروع کرتا ہے، انھیں یاد دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ کیا کیا

بھول چکے ہیں۔ فوراً اسی کو پاگل، غددار، غیر ملکی ایجنٹ اور حب الوطنی کا دشمن قرار دے کر بغیر کسی مقدمے کی سماعت اور کارروائی کے قید کی بھٹی میں پھینک دیا جاتا ہے۔ یادداشت کی کونپل کو شجر اندر مقید کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زمین کے سینے میں دفن کر دیا جاتا ہے۔

اگر کبھی اچانک کسی زلزلے یا آتش فشاں کے سبب یاد کی بہت ساری زیریں لہریں افراد کے گروہ میں نمودار ہوں، تو پھر ایسی افراد کو مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ ''دلدل'' میں بھاگیں، دلدل میں بھاگتے ہوئے جماعت کے افراد کے سر گولیوں کے نشانے پر ہوتے ہیں۔ اگر وہ رک گئے، تو شوٹ کر دیے جائیں گے۔ وہ بھاگنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ آگے دلدل گہرا، گہرا اور گہرا ہو جاتا ہے۔ ناقابلِ پیمائش مسافت بھرا دلدل! موت دونوں طرف ہے۔ زندگی کا کوئی سرا نظر نہیں آتا۔ موت اور زیست کے درمیان دوڑنے کا یہ وقفہ یادداشت اور فراموشی کی کشمکش کے وقفے سے تاریخ میں مربوط رہے گا۔ اگر تاریخ صداقت کے سینے میں محفوظ رہ سکی تو۔

خالد حسین کی یادداشت: فرموشی کے دلدل میں ڈوبا دی گئی۔ اس کی لاش (جس پر جا بجا گولیوں کے نشان نظر آتے تھے) کو نہلا کر کفن پہنایا گیا۔ اس کے والد کو یہ سارا منظر دھندلا دکھائی دیا ہوگا۔ کیونکہ انھوں نے اپنی نمبر والی عینک اس روز اتار رکھی تھی۔

------ ۴ -----

میں اسٹوڈنٹس کانفرنس میں شرکت کرنے سرینگر گیا۔ جہاں مجھے دو ہفتے گزارنے تھے۔ موسمِ سرما کی آمد تھی۔ سرِ شام شاہراہوں پر کہرا چھانے لگا تھا۔ پانچ بجے تک تمام منظر پر کہرا پھیل جاتا اور کپاس کے اس سمندر میں بہت ساری تمنائیں تہہ دل میں

گرمی پیدا کرنے لگتیں۔ کانفرنس ایک خفیہ مقام پر تھی۔ اس میں جن موضوعات پر گفتگو ہونے والی تھی، اس کا علم تحریک کے چند سنجیدہ اور ذمے دار لیڈران کو تھا۔ یہ تحریک ہندستانی سماج اور سیاسی نظام کو بدلنے اور جمہوریت کے اس فریبی تصور سے افراد کو آزاد کرانے کی کوشش تھی، جس نے ہر ہندستانی کو پیدائش سے ماقبل ایک مقروض فرد میں بدل کر رکھ دیا تھا۔

رات دو بجے تک میں اعجاز اور مستقیم لشکری کے ساتھ ایک نقشے پر کام کرتا رہا۔ تھکاوٹ سے کمر ٹیڑھی ہوگئی تھی۔ دیواروں کے شفاف شیشوں پر سفید دودھ پھیل کر جم گیا تھا۔ میں کھڑکی کی طرف بڑھا۔ اپنی ہتھیلی جوں ہی شیشے پر رکھی ٹھنڈ کی لہر پورے جسم میں اتر گئی۔ وہاں جمی احتجاج اور غصے کی برف کڑ کڑا کر ٹوٹ گئی اور جسمانستان کے اندرونی حصوں میں ایک ناقابلِ بیان احساس بیدار ہوا۔ اس احساس کی آنچ سینے اور بغل تک آ کر ٹھہر گئی۔ ہتھیلی شیشے سے الگ کی تو دیکھا۔۔۔ کئی لکیریں نقش بن کر وہیں جمی ہوئی ہیں۔ کوئی ایک لکیر سیدھی نہ تھی۔ ان ٹیڑھی لکیروں نے اکثر مجھ میں یہ احساس پیدا کیا تھا کہ ’’میں نامراد پیدا ہوا ہوں کیا؟‘‘ قنوطیت کی مسموم یخ زدہ ہوا دل سے اٹھنے والی تھی کہ مجھے ایسا لگا جیسے باہر گھنے لمبے پیڑوں کے درمیان تاریکی اور سردی میں فریدہ کھڑی ہے۔ میں جانتا ہوں یہ ممکن نہیں تھا۔ کسی کو یہ خبر نہیں تھی کہ میں کہاں ہوں.......... میں جب سے اس سے دور ہوا ہوں۔ وہ متواتر مجھے میرے آس پاس محسوس ہوتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جب میں ارادتاً اسے بھولنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے زیادہ یاد تی ہے۔

لاشعور کے دھندلکوں اور کہرا کے جال بہت گہرائی تک اتر گئے۔ میں دل کی تاریک کھائی میں ایک لمحے کے لیے پہنچ گیا۔۔۔ پھر میں نے شیشے پر جمی نمی کو صاف کیا۔ باہر کا منظر، جو شب کی آہنی چادر میں خاموشی سے سو رہا تھا۔ جاگ گیا۔ بہت

دور پہاڑیوں میں بسے ایک گاؤں کی روشنیوں کے چھوٹے چھوٹے داغ نظر آتے تھے۔لیکن ان سے مجھے کیا۔۔؟

تھوڑی دیر بعد میں نیم کے پیڑ کے نیچے پھیلے ہوئے ایک امرود کے پیڑ کے پاس فریدہ کو تلاش کر رہا ہوں، جسے چند منٹوں قبل میں نے اس کے ارد گرد محسوس کیا تھا۔ وہاں فریدہ کیا اس کا سایہ بھی نہیں تھا۔ وہ ''کچھ نہیں'' تھا۔ مجھے ''کچھ نہیں'' بہت اچھا لگتا ہے! ''مجھے کچھ نہیں ہونا'' بہت اچھا لگتا ہے۔ یہ احساس میری جڑوں کو مضبوط کرتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کچھ نہیں ہونا...... بہت کچھ ہونا ہے۔

ـــــ ۵ ـــــ

میں کمرے میں لوٹ آیا۔ دیکھا کہ کھڑکی پر دوبارہ برف کے ذرات جم گئے ہیں۔ باہر اب کچھ نظر نہیں آتا۔ دل میں ارادہ کیا۔کل دوپہر اسے فون کروں گا۔اتوار ہے۔ وہ گھر پر ہوگی۔ یکایک یونیورسٹی سے مجھے غیر حاضر پا کر وہ بہت پریشان ہوگی اور کس کس سے نہ پوچھتی ہوگی؟ ''کیا اس نے تم کو بتایا تھا یونی ورسٹی نہیں آئے گا؟''

اس کی ایسی حالت بھی عجیب ہوتی ہے۔ جو مجھے احساس دلاتی ہے کہ میرا وجود اس کی تعبیر ہے۔ عشق احساسِ روح ہے۔ جب وہ مجھے میرے بارے میں فکر مند نظر آتی ہے۔ وہ لمحے، جب وہ مجھے ڈھونڈتی ہے۔ وہ لمحے، جب وہ مجھے نصیحتیں کرتی ہے اور وہ لمحے، جب وہ مجھ سے آنکھیں چراتی ہے۔ میرے لیے پر کیف اور یادگار لمحے ہوتے ہیں۔ان سے میرے عشق کو دوام ملتا ہے۔

میں ایک طرف میز پر بیٹھ گیا۔عرفان لشکری کانفرنس کے نکات کو ترتیب دے رہا تھا۔اعجاز بٹ ایک طرف کچھ لکھ رہا تھا۔کیا ہم تینوں میں کوئی قدر مشترک تھی؟

تینوں چپ تھے۔ نیند کی طلسم کاری کا ہم پر کوئی اثر نہیں تھا۔ بمبئی سے نکلتے وقت میں نے گارسیا مارکیز کا ناول ''تنہائی کے سو سال'' بھی ساتھ رکھ لیا تھا۔ سوچا، چلو یادِ حبیب کو مٹانے کے لیے اس طلسمی نگار خانے کی زیارت کی جائے۔ بیگ سے کتاب نکالی، جو ایک مراٹھی اخبار میں لپٹی ہوئی تھی۔ کتاب بائیں ہاتھ میں لی، دائیں ہاتھ میں اخبار کا صفحہ تھا۔ جس پر اس لیڈر کی تصویر تھی، جسے غالباً خالد حسین قتل کرنا چاہتا تھا۔ تصویر کے نیچے سرخی لگی تھی۔ ''انھیں اس ملک میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔''

میں نہیں جانتا ایسا کیوں ہوا کہ مجھے ہنسی آ گئی اور قہقہہ بلند ہو گیا............ کمرے کا سناٹا دیواروں سے ٹکرا کر مراجعت کرنے کے بجائے غالباً باہر برف کی دبیز تہوں میں جا کر کہیں منجمد ہو گیا۔ لشکری نے مڑ کر میری جانب دیکھا۔ اعجاز اٹھ کر میرے قریب آیا ۔لیکن اس قہقہے کی بازگشت واپس نہیں آئی ۔شاید ہماری چیخوں اور قید خانوں میں اموات کی فہرست بھی کبھی واپس نہیں آئی تھی............

''میں نہیں جانتا کہ ایسا کیوں اور کب سے ہوا تھا۔''

لشکری: پیارے کیا ہوا؟

اعجاز: اسے اپنی معشوقہ یاد آئی ہوگی۔

لشکری:۔ بھئی، بتاؤ کیا بات ہے؟

اعجاز:۔ یہ سوچ را۔۔ ہوتا...... وہ ادھر ہوتی تو؟

نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے...... یہ دیکھو! یہ اسی حیوان کی تصویر ہے، جسے جہنم رسید ہونا چاہیے۔ اس مادر............ نے اپنے اخبار میں لکھا ہے کہ ہمیں اس ملک میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہم اچھے اور مہذب شہری نہیں ہیں۔ ہماری آبادی بڑھنے سے ان کی ثقافت کو خطرہ ہے۔ (لشکری کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اعجاز منہ کھولے مجھے دیکھ رہا تھا) یہ گانڈو ہمیں مٹا کر اس زمین کو پاک کرنا چاہتا ہے۔ یہ ہر دن اس طرح

کے بیانات دیتا ہے۔ جمہوریت کی کوکھ میں فسطائیت کا زہر بھرتا ہے لیکن اس پر کسی کو اعتراض نہیں۔ اس کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا جاتا۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ یہ کون سی جمہوریت ہے؟ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ سارا ملک ترشول والوں کے کنٹرول میں چلا گیا ہے۔ وہ جو ظاہری طور پر کانگریسی، کمیونسٹ اور ڈیموکریٹک نظر آتے ہیں، سالے وہ بھی اندر سے زعفرانی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ اس رنگ سے ہمارے قتل اور ہمارے خلاف فسادات کی فہرست تیار ہوتی ہے .... یہ سب اس شیطان کے دوست ہیں اور اقتدار میں آنے کے لیے اسے مہرے کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ یہ سُور ہماری بہنوں کی عصمت دری کے لیے جرمنی سے ایسے اسپرے منگاتے ہوں گے، جس سے ایک ہی شب میں کئی کئی لڑکیوں کی ....

لشکری کا چہرہ سرخ انگارے میں بدل گیا تھا۔ اعجاز میرے پیروں کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ ’’ہمیں ان کے ساتھ جنگ کرنا چاہیے۔‘‘ لشکری نے کہا۔ یہ ممکن نہیں ہے لشکری میں نے کہا۔۔۔۔ جبر کے ہاتھ بہت مضبوط ہو چکے ہیں۔ جمہوریت کا لیبل ان کے سروں پر ہے۔ ان کے پاس حکومت ہے۔ اقتدار ہے۔ فوج ہے۔ پولس ہے۔ میڈیا ہے۔ وہ خود کو معصوم اور ہمیں ظالم، غیر مہذب اور شر پسند ثابت کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ ان کی پوری مشنری ہماری دشمن ہے۔ ہمیں جمہوری دفاتر کے تعاون سے ہلاک کر رہے ہیں۔

اعجاز: تو کیا کریں؟

لشکری ہم کیا کریں؟ تم بتاؤ ہم کیا کریں؟ صرف کانفرنسوں سے کیا ہوگا؟

ہم کیا کریں ....؟

.... ’’ہم مجتمع ہوں، ہم اپنے وجود کا احساس پیدا کریں۔‘‘

لشکری: لیکن اتحاد ناممکن ہے۔ ہماری قوم ان کے جھوٹے پروپیگنڈے اور ذاتی

مفادات کے دائروں میں بٹی ہوئی ہے۔

ہاں !! یہ ہماری تاریخی بدقسمتی ہے۔ انھوں نے انتہائی دانش مندی سے ہمیں عقیدوں کے فرسودہ مقبروں میں زندہ درگور کردیا ہے۔ جمہوریت ایسے شائستہ لفظوں کو استعمال کر ہمیں کمزور، بے سہارا اور غیر منطقی بنا دیا ہے۔ ہمارے وجودی احتجاج کو رجعت پسندی کا نام دے دیا ہے۔ ہماری عبادتوں اور عقائد کو بنیاد پرستی کے عنوان کے تحت غیر جمہوری عمل ثابت کیا اور خود اپنی مردہ غیر انسانی ثقافت اور تہذیب کو احیاٗ عطا کرنے میں لگے رہے۔ گزشتہ نصف صدی سے خود کو اکٹھا کرتے رہے اور آج اس قدر طاقت ور ہو گئے ہیں، کہ ان کے دانت آہنی اور آنکھوں میں زہر کے سائے بھر گئے ہیں۔ ان کی جلد گینڈے ایسی موٹی ہو گئی ہے، جس میں جمہوریت کی لچک اور حقیقت پسندی کہیں بہت اندر دم توڑ چکی ہے۔ جمہوریت کے نام پر کسی معاشرے کا اختتام اتنا ہیبت ناک اور بالترتیب فسطائیت پر ہوگا کب کس نے سوچا ہوگا؟ اور اب وہ ہم سے تاریخی انتقام لینا چاہتے ہیں۔ تاریخ بھی وہ، جسے خود انھوں نے مرتب کیا ہے۔ اپنے عروج اور ثقافتی ارتقا کو جواز عطا کرنے کے لیے انھیں ایک دشمن کی ضرورت تھی۔ وقت نے یہ ضرورت ہماری صورت میں پوری کی ہے۔ ان برسوں ان فسطائی ذہن والوں نے سارے بھارت کو دلدل میں پھینک دیا ہے۔ ہماری معیشت تباہ کی گئی ہے۔ سیکولر کہلانے کا چسکہ لگا کر ہمارے پڑھے لکھے طبقے سے اس کی شناخت تک چھینی جا رہی ہے۔ (سودا دونوں طرف سے برابر ہوتا، تو بات الگ ہوتی) ترشول والے اپنی جڑوں کی طرف مراجعت کرنے لگے اور ہمیں اپنی ثقافتی حقیقت سے دور کرنے کا منصوبہ کرتے رہے اور یہ سب جمہوریت کے ماسک پہن کر کیا گیا ہے۔ ہم اور ہماری طرح کے بے شمار لوگ۔۔ وہ بھی جوان کے گھرانوں میں پیدا ہوئے۔ لیکن مثبت فکر رکھتے تھے۔ اس مہیب فسطائی دلدل میں پھنس رہے ہیں۔ (

مجھے پہلی بار اس قدر تفصیل سے اپنے خیالات پیش کرتے ہوئے دیکھ کسی نے مداخلت نہیں کی۔)

لشکری: ہمیں ہارنا نہیں ہے۔

اعجاز: یقیناً!! اسی لیے تو اب یہ ذمہ داری ہم طلبہ کی ہے۔ ہمیں رفتہ رفتہ اپنے بھائیوں اور دوستوں کے ذہنوں کو جمہوریت کے اس فریبی اور مکرہ چہرے سے آشنا کرانا ہے۔ اس لفظ کی آڑ میں ہماری حمیت کو تار تار کیا گیا ہے۔ اس لفظ کے پس پردہ ہمارے گھروں کو بھگوے شعلوں میں بھسم کیا جا رہا ہے۔

لشکری: میں مستقبل کے ہندستان کا نقشہ بناؤں گا............جس میں سب کے ساتھ انصاف ہوگا۔

اعجاز: یہاں کی آزادی کے بعد ہمیں توانائی ملے گی۔۔۔ لیکن شاید بہت وقت لگے گا......شاید ایک صدی......لیکن تحریک کو آگے بڑھانا ہے۔

اعجاز: لیکن تحریک کو آگے بڑھانا ہماری ذمے داری ہے۔

کچھ دیر اور باتیں ہوتی رہیں۔

اچھا بھئی اب سو بھی جاؤ۔ چار بج رہے ہیں۔ صبح اسٹیج بھی تو سجانا ہے۔ ہم بستر پر لیٹ گئے۔

------ ٦ -----

وجود کی اصل وجود کی عدم وجودی حالت ہے۔ یہ سفر میں نے ''نہیں'' سے شروع کیا اور آج ''ہوں'' تک اس بنا پر پہنچا ہوں،۔ چنانچہ میری اصل وہ ہے۔ جہاں سے میں نے سفر شروع کیا تھا۔ میں جہاں پہنچ گیا ہوں۔ وہ میرا انجام ہے۔ یہ میری ترمیم شدہ

حالت ہے۔ جو میری حقیقت اور عینیت سے مختلف ہے۔ مجھے احساس ہے اب میں دو بارہ اپنی اصل حالت کی طرف مراجعت نہیں کر سکوں گا۔ جہاں سے اس کی تمہید ہوئی تھی۔ اس سفر میں اب مجھے ہمیشہ رہنا ہے۔ موت!! بس اک پل کے لیے مجھے میرے ماضی کی ایک جھلک دکھاتی ہے۔ ''میں ذہن کے پیچیدہ تر پیچوں پر کھڑا ایک بے صدا انسان ہوں۔''

چلو اب میں اس حالت سے باہر نکل آؤں۔ فریدہ کے یہاں نا ہو کر بھی ہونے کے احساس نے میرے اندر خلا سا پیدا کر دیا ہے۔ اس خاموش، تنہا، برفاب شب میں وہ اپنے جسم و جمال کے ساتھ مجھ میں اپنا احساس بیدار کر رہی ہے۔ اس کے بدن کی مہک سے میری روح میں ترنگ بھر جاتی ہے۔ ایسے لمحوں میں، میں اس کے جسم کو اپنی بانہوں میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کی گرمی اور خوشبو سے اپنے لہو میں اٹھنے والی موجوں کو محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے تارِ نفس پر میں خود کو رفتہ رفتہ سلگتا ہوتا ہوا محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ دل کے نخلستان میں گم ذات مسافر کی طرح ساکت کھڑے رہ کر میں خاموش لمحوں کے اتصال کا گواہ بننا چاہتا ہوں۔ ان احساسات سے رگوں اور شریانوں میں سویا ہوا کہرا اچھٹ جائے گا۔

فریدہ میرے لاتفسیر وجود کو معنی عطا کرتی ہے۔ میری زندگی کی تاریک سمتوں اور مسافتوں میں نور بن جاتی ہے۔ اس کی خواہش میرے زندہ ہونے کی علامت ہے۔ اس کے بدن کے خطوط اور اس کے سینے کی حرارت مجھے تکمیل اور کامرانی کی بشارت دیتے ہیں۔

ایک جھینگر سیاہ پتھر کے نیچے سے نکلا۔ امرود کی ایک شاخ سے گلہری لپکی۔۔ وہ ڈر کر زرد بکھرے پتوں میں گھس گیا۔ ایک پل کے لیے میرا ذہن اس طرف متوجہ ہوا۔ خاموشی اس شور سے بکھری۔ کہرا کے ذرات میں ارتعاش ہوا۔ ایک لہر پیدا ہوئی اور

دائرہ بن گئی۔ ان دائروں میں جھینگر اور گلہری کی ایک پل کی جھلک محفوظ ہے۔ تھوڑی دیر قبل میں یاد کے ہالوں میں بہتا جا رہا تھا۔ میں جانتا ہوں۔ آپ اسے کمزوری کہیں گے۔ لیکن اس کا کیا حل نکالا جائے؟ وگرنہ زندہ رہنے کے لیے کوئی بامعنی اور منطقی جواز بھی تو نہیں ہے۔'' میرے لیے زندہ رہنے کا واحد جواز محبت ہے اور دنیا کا سب سے محروم آدمی وہ ہے، جس کے ساتھ محبت نہ کی گئی ہو۔'' کیا آپ سے کوئی محبت کرتا ہے؟ کیا آپ کسی کے ساتھ محبت کرتے ہیں؟ وہ لوگ، جو محبت پر اعتماد نہیں کرتے، شکست خوردہ ذہن کو پیش کرتے ہیں۔ سیاسی اور سماجی زوال کے عروج میں آبادی کا بڑا حصہ شکست خوردہ ذہن ہوتا ہے!! کہیں آپ بھی!!!

------ ۷ -----

انگیٹھی میں کوئلے ابھی بجھے نہیں تھے۔ ہلکی ہلکی آنچ موجود تھی۔ باہر کہرا گہرا ہو گیا تھا ۔کھڑکیوں پر دودھ ایسی سفید پرت جم گئی تھی۔ کمرے کی بجلی گل ہونے سے اندھیرا پھیل گیا۔ اس سیمابی تاریکی میں تین جسم سانس لے رہے تھے۔ تینوں طالب علم اپنے تاریخی اور ثقافتی وجود کی شناخت کو باقی رکھنے کی امنگ دل میں لیے ہوئے، تینوں کے دلوں کی زمین پر شاندار اور بامعنی تاریخ کی یادیں اگی ہوئی تھیں۔ تینوں ایک نازک ڈور پر چل رہے تھے، جس کے نیچے نوکدار میخیں لگی ہوئی ہیں۔ یہ وہ طالب علم ہیں، جنھوں نے عرصہ ہوا جمہوری اقدار کے فروغ کے لیے اسکول اور کالج میں ڈرامے کیے تھے۔ ناانصافی اور جبر کے خلاف نکڑ ناٹک کیے تھے لیکن بہت جلد وقت نے ان کے تصورِ جمہوریت کی معنویت ان پر آشکار کر دی۔ تحت الشعور نے کروٹ لی اور وہ سمجھ گئے جمہوریت ان کے لیے صرف ایک ماسک ہے۔ ایک ڈھال ہے۔ جس کی آڑ میں

سیاسی تشدد، فسطائیت، زعفرانی بنیاد پرستی، مسلم کش فرقہ واریت اور اقدار کے خلاف ایک سازش ہے۔ ان کی شناخت کو مٹانے کی منصوبہ بند سازش ہے۔ یہ اتنا بڑا کھیل ہے، جس کا صدیوں تک صحیح طور پر تجزیہ ممکن نہیں۔ وہ یہ محسوس کر چکے تھے کہ جمہوریت کی صلیب پر ان کی تاریخ کو لٹکا دیا گیا ہے۔ عوام الناس کو اس قبیح فعل کے احساس سے ماورا کرنے کے لیے ان کے گھروں میں موجود ٹیلی ویژن شب و روز پروپیگنڈے میں جٹ گئے ہیں۔ وہ ادیب، فنکار اور دانشور، جو اس قہر کی معنویت کے خلاف لکھنے کی جسارت کرتے تھے ان پر ملک دشمن اور غیر ملکی سازشوں کو مضبوط کرنے کا الزام لگایا جائے گا اور لگایا گیا ہے۔ فسطائیت کے ناسور نے ہزاروں انسانوں کو انتہائی سفاکی سے بے نشان کیا ہے۔ جمہوریت عفریت ہے۔ بے در و دیوار زنداں ہے۔

------ ۸ -----

میں نے کتنی بار کروٹیں بدلیں مجھے معلوم نہیں۔ جانے کیا بات ہے کہ میرے دماغ سے نیند غائب ہو گئی ہے اور مجھے مسلسل یہ احساس اذیت پہنچا رہا ہے کہ میرے ساتھ اس بستر میں خالد حسین کی لاش بھی کروٹیں بدل رہی ہے۔ لیکن خالد حسین تو دفنا دیا گیا تھا۔ پھر مجھے ایسا کیوں لگا؟ لاشعوری طور پر میں نے کئی بار بستر میں ٹٹولا۔ مجھے رہ رہ کر ایسا کیوں لگتا ہے کہ خالد حسین مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ ہاں! میں جانتا ہوں۔ اس کا بہیمانہ قتل کیا گیا تھا۔ اس کے جسم پر جا بجا اذیت کے نشان تھے۔ مجھے یاد ہے: اس کی مردہ آنکھوں میں ایک خواب اٹکا ہوا تھا۔ وہ خواب میری پلکوں میں بھی ہے اور اب دھیرے دھیرے میری طرح بے شمار لوگوں کی آنکھوں میں دکھائی دینے لگا ہے۔ (سوائے ان افراد کے جواب تک جمہوریت کے عفریت کا شکار نہیں ہوئے ہیں) یا

جنھیں سفید کرتے پاجامے والی سیاسی پارٹی نے ''ممی'' بنا رکھا ہے۔جس کے لیڈروں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے بھیڑیوں نے انسان چہرے کا ماسک پہن لیا ہے۔اس پارٹی میں جو سب عظیم اور انسان دوست تھا اس کا قتل ہندوتوا وادی فسطائیت کا جمہوریت پر پہلا حملہ تھا...... وہ بوڑھا، نیک دل، گول عینک والا، دھوتی والا۔۔۔رام رام کہتا ہوا خاک میں مل گیا...... جمہوریت کے اس علم بردار کا اپنا مذہب اور اس کی ایک تہذیبی شناخت تھی ...... وطن ثانوی چیز ہے۔شاید اسی لیے موت کے آخری لمحات میں اس کے ہونٹوں پر''اے وطن'' کی بجائے''رام رام'' تھا...... یہ وہی شخص ہے، جو ساری زندگی کہتا رہا کہ وطن مذہب سے بڑی اور مقدس چیز ہے، لیکن خود کو مذہب کے آسیب سے الگ نہ کر سکا۔پھر وطن کو مذہب بنانے والی فسطائی طاقتیں مجھ سے یہ تقاضا کیوں کرتی ہیں کہ میں اپنی ثقافتی اساس سے دست بردار ہو جاؤں...... خالد حسین کہتا تھا: اس مہاتما کے قتل نے ہندستان کو ایک خاندان کی حکمرانی میں پھینک دیا ہے۔(کہیں اس مقصد کے تحت اس کا قتل تو نہیں ہوا تھا؟) شاید نہیں۔لیکن جمہوریت کے تقاضوں سے لاعلم افراد سے بھرا ہوا ملک خاندانی مطلق العنانی کا شکار ہو گیا۔بنگال کی تقسیم، کشمیر کا مسئلہ، ایمر جنسی، مسجد مندر تنازعہ، ترمیم بل، فسادات، تعلیمی پسماندگی وغیرہ مسائل میں عوام کو اسی خاندان نے پھنسایا تا کہ افراد کی یادداشت بیدار نہ ہو اور وہ یہ سوال نہ اٹھائیں کہ جمہوری طرزِ حکومت میں خاندان کے نام کی بالا دستی کس طرح در آئی؟؟ میری طرح بے شمار نوجوانوں کا وجود اس خاندان کے پیدا کردہ پریشان حال ہندستان میں گم ہو گیا۔مجھے اپنے وجود کی بنیادوں کو تلاش کرنا ہے۔مستحکم کرنا ہے۔ مجھے خود کی بازیافت کرنی ہے۔میرا وجود تاریخ ہے۔میں اپنی یادداشت ہوں...... میں فرد اور میں ہی معاشرہ ہوں۔میں اپنی کائنات ہوں۔مجھے اپنے کھوئے ہوئے دھارے ڈھونڈنے ہیں۔مجھے اپنے بارے میں سوچنا ہوگا...... ''میں ہوں''، اور ابھی

میں خالد حسین کی طرح بے نشان نہیں کیا گیا ہوں۔ خیالات کے دائرے ذہن کی فصیلوں کے درمیان پھیلتے رہے اور جانے کب مجھے نیند کی آغوش میں لے گئے۔

''نیند سے عدم مربوط ہے کیا؟''

------ ۹ -----

صبح دس بجے ہوں گے جب میری آنکھ سے نیند واپس عدم آباد لوٹ گئی۔ کھڑکیوں سے شفاف روشنی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ کہرا کسی اور سمت چلا گیا تھا ۔۔ دور پہاڑوں پر برف چمک رہی تھی۔ کمبل سے نکل کر میں کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ باہر امرود کے پیڑ کے نیچے جھینگر کے پر نظر آئے۔ جنھیں دیکھ کر یاد آیا کہ رات گلہری نے اس کا شکار کیا ہوگا۔ کیا گلہری گوشت خور ہے؟

بیشتر پنڈت اور برہمن گوشت خور نہیں ہوتے لیکن انسانی خون سے کھیلنا انھیں اچھا لگتا ہے۔ کہیں برہمن دماغ میں یہودی قوم سے منسوب وہ کہانی تو نہیں گھس گئی ہے، جس میں اپنے ایک مخصوص تیوہار پر روٹیاں بنانے کے لیے یہودی لوگ عیسائی لڑکوں کا خون استعمال کرتے تھے۔ جس کے لیے انھیں یہودی لڑکوں کو اغوا اور قتل کرنا پڑتا تھا۔ سنا ہے برہمن قوم زیادہ شاطر ہے۔ اس نے عقائد کا ایسا جال بنایا ہے، جو دیگر عقائد سے ٹکراتا ہے۔ اگر کوئی اپنے عقیدے پر عمل پیرا ہو......تو برہمنوں کو اس سے برسرِ پیکار ہونے کا جواز مل جاتا ہے۔

ہندوتوا وادی شدت پسندوں کا کہنا ہے: جانور مت کاٹو، لیکن جانوروں کو کاٹنے والوں کا صفایا کرو......

بتائیے! کیا حالتِ غیر میں، میرا ان باتوں پر سوچنا یکسر بے معنی ہے؟

۱۰

صنوبر کے پیڑ کے نیچے کشمیر کی پرآشوب ہوا بدن میں میخیں گاڑتے ہوئے بہہ رہی تھی۔صنوبر کا تنا پھیلا ہوا تھا۔اس کی جڑیں مضبوط ہو چکی تھیں۔اس کی شاخوں کے درمیان ڈوبتے ہوئے زرد سورج کی شعاعیں منور ہو کر یہاں وہاں منعکس ہو رہی تھیں۔بالائی حصہ گویا آسمان سے محوِ کلام تھا۔یہ گفتگو ابھی پر اسرار ہوگی۔وادی میں ہر طرف سبزہ زار پر لہو رنگ زرد سرخ کرنوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔دور کی پہاڑیاں یوں لگتی ہیں، جیسے، وہیں پر ابھی ابھی کسی دیو مالائی کردار کر قتل ہوا ہے، جس کا چمکدار لہو برف کی چوٹیوں پر بکھرا پڑا ہے۔وہ کردار جانے کس لمحے سے اس حسین منظر کے پس منظر میں ترشول اپنے دانتوں میں پکڑے برہنہ رقص مرگ وحیات کر رہا تھا۔لیکن اس کا قاتل کون ہے؟ ؟ میرا خیال ہے کہ اس اک جواب صنوبر اور آسمان جانتے ہیں اور ان کا کلام ابھی پر اسرار ہے۔

''وقت بھی پراسرار رقص ہے جس کی رفتار میں تاریخ اور اذہان گردش کرتے ہیں۔'' تاریخ صرف اذہان کی ہوتی ہے، جو تخلیقی، مادی اور نظریاتی بنیادیں استوار کرتی ہے۔ تاریخ کا حسن تصادم اور کش مکش ہے۔وقت کی صداقت اس کا تحرک ہے۔زندگی کا جمال اور اس کی لطافت، خالی پن کے لمحوں میں یا عدم احساسیت میں ہے۔نہیں ہونے کا خیال ''وجود'' کو تشکیل کرتا ہے۔اسے زندگی سے برسرِ پیکار ہونے کی تلقین کرتا ہے۔ زندگی کے حسن کی تزئین کرتا ہے۔میں خالی آسمان کو دھیان کی بینائی سے دیکھ رہا تھا۔ بھیتر کی آتما میں ایک عجیب نہ ہو کر ہونے کا احساس ابھر رہا تھا۔وجود کی شیریں لطافت نے ایک پر کیف حزنیے میں مجھے مقید کر لیا۔اس کے سینے کے سروں کی رنگت ...... کس قدر ہلکی گلابی ...... جس میں گندمی رنگ گھل گیا ہو۔اطراف میں نیم واضح چھوٹے

چھوٹے نقطے سے نشان ...... اور پھر وہ جان لیوہ گولائی ، جو سفید اور جلدی رنگ کی آمیزش سے روح کی دیواروں میں ایک الہامی کیفیت بیدار کرتی ہے۔اس کے بدن کا یہ حصہ طلسمی جھیل کی سطحِ آب سا ہے۔جس پر کاغذ کی کشتی کی مانند رفتہ رفتہ ڈوب جانے کو جی بے قرار ہوا ٹھتا ہے۔میری نوکِ زباں پر اس کے سینے کا ذائقہ آویزاں ہے۔

----- ۱۱ -----

لیکچر روم پہلے منزلے پر تھا۔ ہمارے لیکچرز دو بجے دوپہر سے پانچ بجے تک ہوتے تھے۔بمبئ میں کبھی کبھی اچانک بہت گرمی ہوتی ہے۔گرمی سے میں بے حال تھا۔لیکن دل میں اس کے احساس کا لطف تھا۔یہی لطافت وجود کو سارے نامساعد حالات میں بھی توانائی عطا کرتی ہے۔ایک تخیل عطا کرتی ہے۔آخری لیکچر غالباً پروفیسر ہدایت اللہ کا تھا۔لیکچر ختم ہوتے ہی طلبا ذہن کی الجھی ہوئی کیفیت سے باہر آنے کے لیے فوراً کمرۂ جماعت سے نکل پڑے۔یہ اور بات ہے کہ پروفیسر ہدایت اللہ کے لیکچرز بڑے علمی ہوا کرتے تھے۔شاید میری نسل میں علمی باتوں کو سننے کی صلاحیت معدوم ہوگی۔کمرۂ جماعت میں ہم دونوں رہ گئے تھے۔کیا ہماری آنکھوں میں ایک دوسرے کو اکیلا پا کر جاگنے والی غنودگی اور سرور آپ سمجھ نہیں سکتے؟ وہ نشۂ حیات آپ محسوس نہیں کر سکتے؟ میں نے اس کی چوٹی کھینچی......اس کے اعصاب کی شبنم جبیں پر افشاں ہوگئی۔

''اف''......پاگل......ہوگئے ہو؟ ''

''ہاں''

اس نے زبان باہر نکال کر چڑانے والے انداز میں کہا ......''اونہہ......''

میں نے چوٹی دوبارہ کس کے کھینچی۔

''ما......روں گی......ہاں......دیکھ......نا''

''مار تو چکی ہو۔''

وہ ایسے لمحوں میں بے حد شوخ ہو جاتی اور میرے دل میں شوق کے عنوان عریاں ہو جاتے......میں نے کہا: ''فریدہ بٹن کھولو......''

اس جملے نے اسے حیرانی کے گرداب میں پھینک دیا۔ وہ حیران نظروں سے مجھے دیکھتی رہی......اس کی جبیں پر آشفتہ بوندیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

''کیا کہا میاں مٹھو......پھر سے کہو؟''

میں نے اپنا جملہ دوہرایا۔

اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ سن ہوگئی۔ کمر پر اس کی چوٹی کھل کر جیسے سایہ کر گئی۔ خاموشی ہمارے اطراف ساکت کھڑی تھی جس میں اس کے دل کی دھڑکنوں کو سنا جا سکتا تھا۔ وہ بلیک بورڈ سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ میں نے اپنی ہتھیلی اس کے بائیں گال پر رکھی۔ اس کی روح کی آنچ اس کے گالوں پر محسوس ہوئی۔ وہ لرز گئی۔ اس کی سانسوں کا شور تیز ہوتا گیا۔ اس کی نظر کھڑکی کی جانب تھی......میں نے کھڑکی اور دروازہ بند کر دیا......کمرے میں اس کی کھلی چوٹی کا سایہ نیم تاریکی میں بدل گیا۔ میرے قدم اس کی جانب بڑھے۔ اس کا دل تیز رفتار ٹرین کی طرح دوڑ رہا تھا۔ اس کے بدن میں اس کے دل کی آواز کا شور پھیل گیا۔ وہ ساکت و جامد لیکن اندر ہی اندر لرزاں تھی۔ اس کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ اس کی آنکھوں کی سفیدی میں سرخ لکیروں کے آڑے ترچھے خطوط بنے تھے۔ میں اس کے قریب پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ مجھے گھورتی رہی۔

ایسا لگ رہا تھا، جیسے بلیک بورڈ پر لکھے تمام حروف ایک اک کر کے بلیک بورڈ سے ترتیب وار اترے اور اسی قطار میں دروازے اور کھڑکیوں کے کونوں سے باہر جا رہے

تھے تاکہ ہمارے درمیان ان کی موجودگی محسوس نہ ہو۔ ''محبت کے لیے اتنی یکسوئی کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟''

''فریدہ دیر ہو رہی ہے۔''

...... ''مجھ سے نہیں ہوتا۔'' بالآخر بہت آہستہ اس نے کہا۔

''کیا نہیں ہوتا......؟''

''تم کیوں نہیں سمجھتے......مجھ سے نہیں ہوتا۔''

میں نے بے رخی سے کہا۔ ''تو پھر چلو نکلو...... چلتے ہیں۔''

''ناراض......ہو گئے ہو ؟''

''نہیں تو کیا...... یار تم اتنا جھجک کیوں محسوس کرتی ہو؟''

میں مڑنے لگا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا......اس کے ہونٹوں پر ایک نسائی آہنگ اور آنکھوں میں جوشِ محبت تھا۔ ''رکو تو......میں نے 'نہیں'۔۔کہا کیا؟''

میرے چہرے پر اس کے اس مختصر جملے سے مسکراہٹ پھیل گئی۔

اس نے نگاہیں جھکا لیں۔اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ کمرۂ جماعت کی میزوں کے اندر دیمک یہاں سے وہاں میزوں کے برادے میں پاگل ہو کر بھاگ دوڑ رہی تھی۔

''محبت کے لمحوں میں دنیا کی ساری کیفیات آپ سے کس قدر مانوس ہو جاتی ہیں؟ کیا ہمارے مٹی جسم کا دیگر اجسام سے کوئی ربط ہے؟ کیا فرطِ محبت سے پیدا ہونے والی ہماری جسمانی توانائی کے اسرار دیگر اجسام و عناصر پر عیاں ہیں؟''

''کچھ دیر بعد اس نے کہا لو اب......خوش؟''

میری روح میرے دیدوں میں مرکز کئے تھی۔ میں چپ تھا۔

''اف بابا...... کتنے وحشی ہو، خود نہیں......؟''

''او کے او کے'' میں نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

میں جانتا ہوں اگر وہ روٹھ گئی تو اس لمحے کا انبساط فنا ہو جائے گا۔ وہ تمام حروف جو ہماری خاطر کمرۂ جماعت سے ہجرت کر کے باہر گئے۔ وہ کہیں گے۔ ''ہماری ہجرت بیکار گئی۔'' میں دیمک کے رقص کو اِلیسے میں نہیں بدل سکتا۔ اس کی آنکھیں میری آنکھوں میں سمائی ہوئی تھیں...... اس کی گردن پر بخارات جمع ہو گئے تھے۔ اس کی سانسیں مزید تیز ہو گئی تھیں۔ اس کی گھبراہٹ، نسوانیت، لڑکھڑاہٹ اک پل میں محو ہو گئی۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں احساس تکمیلیت نمایاں ہوا۔ ''کیا احساس جنس کے بغیر وجود کی تکمیل ممکن ہے!!''

میری آنکھوں نے ذہن میں جتنی '' فریمز'' اس وقت بنائی ہوں گی سب میں وہ نا قابلِ بیان احساس ثبت ہو گیا...... سیاہ گندمی رنگ کی آمیزش والے گلابی نقطے پھیلے۔ میری زبان کے لمس نے اس کے دل کی بھول بھلیوں میں آتش فشاں جگا دیا ہو گا۔ اس کے دل سے ابھرنے والا شور میرے بدن کی دیواروں کو مسمار کر رہا تھا۔ زبان کے توسط سے جسم کا جسم میں ادخال اس قدر بامعنی ہے نا؟ شاید زبان خواہشوں کو ایک دوسرے میں تحلیل کرتی ہے۔ اس کے نفس کا ردم منتشر ہو کر کمرۂ جماعت میں بکھر گیا تھا۔ میں جن لمحوں اس کی بدن سے اپنے حصے کی محرومیاں مٹا رہا تھا، وہ ان لمحوں میرے بال سہلا رہی تھی۔ '' آپ بتا سکتے ہیں، بعض اوقات محبت میں اس قدر شفقت کیوں شامل ہو جایا کرتی ہے؟'' میں نہیں جانتا...... اس کے اندر۔۔ مجھے اس سے محبت کرتے ہوئے دیکھنے اور.......... خوش رکھنے کا جذبہ اس قدر کیوں ہے؟ جب اس کی انگلیاں میرے بالوں کو سہلا رہی ہوتی، تب مجھے یوں محسوس ہوتا گویا وہ مجھ سے پندرہ بیس سال بڑی عورت ہے، جو محبت کے سارے مرحلوں اور راحت حاصل کرنے کے تمام سلسلوں سے

گزر چکی ہے۔کیا جنسی انحصار کے لیے تجربہ ضروری نہیں ہے؟

''کیا بدن سے لطف اندوز ہونے کے لیے مشق ناگزیر ہے؟

ہم دونوں بارشِ عشق سے شرابور ہو چکے تھے۔اظہارِ نفس فصیلِ جسم سے باہر اُمڈ آیا تھا۔ دونوں کے تلوے گرم سلگتی ہوئی ریت پر تھے۔ ہمارے اجسام روح کے جان لیوا احساسِ ثقل سے کبھی آزاد ہوئے ہیں؟ کیا آپ کو اس لمحے کا فرحت بخش انبساط یاد ہے، جب بدن کی حلاوت سے آنکھوں میں دھند بھر جاتی ہے؟

....

....

....

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ بلیک بورڈ سے سر ٹکائے کھڑی تھی۔ وہ قطرے محبت کی بے زبانی کا دفتر تھے۔ان میں عورت ہونے کا جذبہ چمک رہا تھا۔

میں جس میز پر بیٹھا تھا اس سے چند قدموں پر کار آ رکی۔ کار کی آواز نے مجھے خیالات کی جھیل سے باہر نکالا۔صنوبر کا سایہ تنے کے ارد گرد پھیل گیا تھا۔امرود کے پیڑ پر گلہری رقص کر رہی تھی۔

------ ۱۲ -----

علی گڑھ، جواہر لال نہرو، لکھنؤ اور جامعہ ملیہ سے کچھ نمائندے آئے تھے۔مختصر سی بات چیت کے بعد میں نے لشکری سے کہا کہ انھیں ان کے لیے مختص کمروں تک پہنچائے۔کار جموں یونیورسٹی کا ایک طالبِ علم ڈرائیو کر رہا تھا۔

مجھے فون کرنا تھا۔وہ واپس شہر کی طرف جا رہا تھا۔میں اس کے ساتھ ہو لیا۔

آسمان سے شام اترنے لگی تھی۔سورج کی سرخی سیاہی میں بدل رہی تھی۔دور کی پہاڑیوں میں ہونے والے قتل کا پریشاں لہو برف کی چوٹیوں پر منجمد ہو رہا تھا۔صنوبر کا پیڑ خاموش،تنہا اور یاس زدہ لگ رہا تھا۔جس طرح بہت دور ہزاروں میل دور سمرقند،تاشقند اور اسپین میں تاریخ کے امین محلات ومحراب اور ان سے ملحق عبادت گاہیں کھڑی ہیں۔خاموش،تنہا ویاس زدہ۔......کیا انھیں کسی انقلاب کا انتظار ہے؟ کیا وہ ایک طوفان کے انتظار میں ہیں،جو ان کے کربناک سکوت کو توڑ دے گا؟ کسے معلوم؟ ہاں!مگر یہ صنوبر آزادی چاہتا ہے۔یہ صنوبر اپنی جڑوں سے انسیت رکھتا ہے۔یہ تمام مالکان کے استبداد سے نجات چاہتا ہے۔یہ چاہتا ہے کہ اس کے حصے کا آسمان اس کا اپنا ہو۔اس حصے کی زمین اس کی اپنی ہو؟ کیا اسے معلوم نہیں اس کی شاخوں میں آزادی کے لیے درکار قوت نہیں ہے۔حرکت نہیں ہے۔۔۔اسے معلوم ہے وہ وقت کی ستم ظریفی اور اپنی بے توانائی کا شکار ہے۔اس کے باوجود وہ خواب تو دیکھ سکتا ہے۔وہ اپنی آزادی اور وجود کا احساس دلا چکا ہے۔وہ آزاد ہے۔بس سیاسی طور پر اس کی آزادی تسلیم نہیں کی گئی ہے۔ایک دن وہ خود اپنی آگ میں جل جائے گا اور اپنی شاخوں سے پورے ماحول کو بھسم کر دے گا۔اسے غلامی،محکومی اور ذلت سے زیادہ سرفروشی پسند ہے۔صنوبر کا ضمیر بیدار ہے اور اسے پتہ ہے وقت کی پراسرار تاریخ کی جھیل میں یاد کے کنکر کتنی دور تک دائرے بناتے جائیں گے۔فی الحال وہ تصورِ آزادی کے نقش ونگار آسماں کے دھویں میں بنا رہا ہے۔اس کی شاخیں برہنہ رقص کرنے والے دیومالائی کردار کو اپنے بازوؤں میں جکڑ کر موت کی وادی میں سلا رہی ہیں۔

------ ۱۳ -----

ذہن ایک خیال محشر بپا کیئے تھا۔وقت نے دستک دی۔معلوم ہوا،جہاں سے سفر شروع ہوا

تھا، وقت وہاں سے آگے بہہ چکا ہے۔ وقت بھی کافر ہیولہ ہے، جس کی صورت قدرت کی جانے کتنی یکتائی داؤ پر لگی ہوئی ہے؟

جاوید نے کار ٹیلی فون کے بوتھ کے پاس پارک کی۔ سامنے چند خاکی وردی والے مشین گن لیے کھڑے تھے۔ میں نے احتیاط کے طور پر ایک مقامی اخبار کا کارڈ بنوا رکھا ہے۔ اس اخبار کا ایڈیٹر میرا دوست ہے۔ ہر طرف کہرا پھیل رہا تھا۔ بیشتر مکانات کی کھڑکیاں بند تھیں۔ گلیوں میں ویرانی انگیٹھی سینک رہی تھی۔ فون بوتھ میں ایک بوڑھا شخص تھا۔ اس کے عقب میں وہی ابلیس چہرہ جو جمہویت کے فسطائی باطن کی خاطر صنوبر کی شاخیں کاٹ رہا ہے۔

میں نے رنگ کیا۔۔۔

''ہلو۔۔۔فریدہ کو دینا۔''

فون اس کی بڑی بہن نے اٹھایا تھا۔ میں اس کی آواز سے مانوس تھا۔ چند سیکنڈ کی اس خاموشی میں اس ابلیسی چہرے نے ریڈیو جیسی ایک مشین کو کئی بار کانوں سے لگایا۔۔ مجھے تو فریدہ سے بات کرنا تھی۔ چنانچہ کوئی تشویش نہیں تھی۔

''ہلو، جناب کہاں سے بول رہے ہیں؟''

''کیسی ہو تم؟''

''میں ٹھیک ہوں، لیکن تم کہاں ہو؟ کئی دنوں سے غائب ہو؟''

''ہاں، بس اسی لیے تو فون کر رہا ہوں۔'' اس نے ناک بھوں چڑھے لہجے میں کہا۔'' ہو گے کسی کے ساتھ''

''ارے نہیں یار۔۔۔تم بس خواہ مخواہ۔۔''

''او کے، او کے۔۔ کب آرہے ہو؟''

''دس پندرہ دنوں میں۔''

''مائی گاڈ۔''

''کوشش کروں گا۔۔۔جلدی آجاؤں۔''

''دیر مت کرنا، میں انتظار کررہی ہوں۔۔۔سمجھے؟''

اس کی آواز دب رہی تھی۔وہ مضمحل ہوچکی ہوگی۔اس نے فون نہیں رکھا تھا۔وہ ہمیشہ چاہتی تھی کہ پہلے فون میں رکھوں۔''اچھا فون رکھو۔''اس کی منتشر آواز آئی۔میں نے دھیرے سے فون رکھ دیا۔مجھے معلوم ہے ریسور اس کے ہاتھوں اور کان پر ہوگا۔ایسا لگتا ہے۔ڈار سے بچھڑے کسی ساتھی کو تلاش کرتا ہوا کوئی خود بھی کہر زدہ جنگل میں کھو گیا ہے۔مجھ سے دوری کا احساس اسے اس قدر مغموم کیوں کرتا ہے؟''کیا آپ کبھی کسی سے دور رہنے کے سبب مغموم ہوئے ہیں؟ ''جس سے نفس کی برف مزید سخت ہوئی ہو۔وہ چاہتی تھی کہ میں یونیورسٹی میں اس سے ملوں اور باتیں کروں۔میں نہیں جانتا ایسا وہ کیوں چاہتی ہے؟ میں نہیں جانتا کیوں وہ میرے بغیر اس قدر اداس ہوجاتی ہے؟ میں اس کے اس رویے کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔کیا بے پناہ محبت کے باوجود ہم اپنے حبیب کو کم ہی سمجھ پاتے ہیں؟ کیا آپ نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا، کیا آپ اسے سمجھنے سے قاصر ہیں جس سے محبت کے آپ دعوے دار ہیں؟ اسی لیے مجھے لگتا ہے۔'محبت وہ واحد عمل ہے جس میں منطق کی گنجائش نہیں ہے۔'

------ ۱۴ -----

مجھے لگتا ہے:''جمہوریت کی ناکامی، کمیونزم کا انتشار، سیکولرزم کا فراڈ، مغربی قوتوں کی یلغار، بڑھتی ہوئی ہندوتوا وادی فسطائیت کا خوف اور مسلم کش فسادات میں قانون و انتظامیہ کی شمولیت نے خالد حسین کو انتہا پسند مسلم بنادیا۔''

مجھ سے وہ دس بارہ سال بڑا تھا۔ ممبئی یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد انگریزی صحافت سے جڑ گیا تھا۔ انتہائی سنجیدگی سے اپنے خیالات پیش کرتا تھا۔ لیکن گذشتہ چند برسوں میں اس کے مزاج میں کچھ نمایاں تبدیلیاں نظر آنے لگیں تھیں۔ صحافت ترک کیے بیٹھا تھا۔ اتفاقاًان برسوں میں اس کے کچھ زیادہ قریب ہو گیا تھا۔ وہ گھنٹوں جمہوریت، فسطائیت، مسئلہ کشمیر، بوسنیا، روس، ہندوتواوادی انتہا پسندی، افغانستان اور اسلامی اقدار کے زوال پر بے تحاشا باتیں کیا کرتا۔ جن ممالک میں جمہوریت کے فروغ یا مارکس ازم کے احیا کے نام پر مسلمانوں کی نسلی کشی کی جو کوششیں کی گئی ہیں ان اس کا ذکر کرتا۔ ان لمحوں اس کا چہرہ دہکتا ہوا سرخ پھول جان پڑتا۔ اس کے انگریزی کے نفیس جملے ٹوٹ جاتے اور اس کی گفتگو میں گالیاں در آتیں۔ وہ اکثر نیلے یا کالے رنگ کی جینس ٹی شرٹ پہنے ہوئے نظر آتا۔ وہاں مذہبی فرائض بھی ادا کرنے لگا تھا۔ بوسنیا میں مسلمانوں کا قتل عام غالباً بنیادی وجہ ہوگی جس نے اسے انتہا پسند تنظیم کا رکن بنادیا۔ اس کے لہجے کی اندوہناکی بیانِ واقعات کو شدت عطا کرتی۔ سننے والے اس کے جذبات کو بھی محسوس کرتے۔ اسے ان اسلامی ممالک پر افسوس تھا، جو پٹرول کی دولت کے نشے میں چور ہیں۔ وہ اکثر کہتا تھا کہ انسانوں کو جانوروں کی طرح بے حسی اور سفاکی سے کاٹا جارہا ہے۔ خواتین کی شرمگاہوں میں فسطائی جبر کا زہر انڈیلا جارہا ہے ایسے میں تم کربلا پر ماتم تو کرتے ہو لیکن جو کچھ سامنے ہورہا ہے اس کربلا سے آنکھیں چرارہے ہو۔ ایسے وقت اس کی زبان سے بے شمار گالیاں ادا ہوتیں۔

میں اس کا بہت قریبی دوست بن گیا تھا۔ حالانکہ اس کے بیشتر خیالات سے کبھی پوری طرح اتفاق نہیں کرسکا لیکن اس کی باتوں اور استدلال پر معترض ہونے کی قوت بھی اپنے اندر اکٹھا نہ کرسکا۔ وہ اکثر کہا کرتا کہ میری زندگی کا بس ایک مقصد ہے: میں موت سے پہلے فلسطین اور کشمیر کو جبر کے شکنجوں سے آزاد دیکھوں۔ اللہ میری اس خواہش کو

پورا کر دے۔ میں اس کی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں۔

خالد حسین تین سال قبل کشمیر ہو آیا تھا۔ وہاں کے حالات کا ذکر اس نے مجھ سے کیا تھا۔ خالد حسین کی شخصیت کچھ ایسی تھی کہ اس کی باتوں میں جھوٹ کے شامل ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میری زندگی میں وہ واحد شخص تھا جس کے مزاج میں تصنع نہیں تھا۔ اس کے باطن اور ضمیر میں دوسروں کو بے جا خوش رکھنے اور خود سے خوش گمان رہنے کے کیڑے نہیں رینگتے تھے۔ اس کی سنجیدگی اس کا اثاثہ تھی۔ اس کے قول و فعل میں باہم ربط تھا۔ وہ جب بھی واقعاتِ کشمیر بیان کرتا اس کی آنکھوں میں نمی در آتی اور اس کے گال غصے کی ہلکی پرت سے گاڑھے اور روشن ہو جاتے۔ اس کی زبان میں لکنت در آتی۔ شاید اس کا ذہن ان واقعات کی اذیت سے کسی داخلی زلزلے سے گزرتا ہوگا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں اس زلزلے کا 'ہپی سینٹر' تھیں۔

''یار یہ سالے! جو خود کو انسان دوست کہتے ہیں۔۔۔ سب انسانیت کے دشمن ہیں۔ گاؤں کے معصوم لوگوں کو رات میں جا کر گولیوں سے بھون دیتے ہیں اور نام مجاہدوں کا لیتے ہیں۔ بہنوں کے ساتھ شرمناک حرکت کرتے ہیں۔ سالوں نے وہاں کئی بہنوں کے ساتھ اجتماعی عصمت دری کی ہے۔ لیکن اب کشمیر کا بچہ بچہ اسے آزاد کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ کشمیر آزاد ہوگا۔ فسطائی جبر سے آزاد ہوگا۔ اب کوئی وعدہ انھیں نہیں بھٹکائے گا۔ انقلاب جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہا ہے۔ کشمیر جنگ کا میدان بن گیا ہے۔ مجاہد کامیاب ہوں گے۔'' اس طرح کی باتیں وہ اکثر کیا کرتا تھا۔ میرا اس سے متفق ہونا ان دنوں ناممکن تھا۔

بعض اوقات وہ جذباتی گفتگو کے بعد آسمان کی جانب ہاتھ اٹھا لیتا اور کہتا ''اللہ .... مجھے کشمیر کی آزادی کا دیدار نصیب کر .... میری زندگی کا مقصد اسے ایک ایسے ملک کے طور پر دیکھنا ہے، جہاں تیرا دین نافذ ہو۔''

خالد حسین کی داستانیں سن کر اس کچھ دوست اس کے ہم نوا ہو گئے تھے۔ جبر اور ظلم کے قصے وہ سلجھے ہوئے انداز میں بیان کرتا۔ یہ ایسے قصے تھے جن کو چند انگریزی اخبار بھی پیش کر رہے تھے۔ چنانچہ، جھوٹ کا شبہ کسی کو نہیں ہوتا تھا۔ میں جمہوریت کی حمایت کرتے ہوئے خود کو اکثر اس کے سامنے ہارتا ہوا محسوس کرتا تھا۔ اس کی بنیاد حقائق پر مبنی تھی۔

ہمارا جمہوری نظام کمزور ہو گیا ہے۔ شاید اسی لیے ہمارے الفاظ میں کشش اور آب و تاب نہیں ہے۔ جمہوریت ایک وحشی سراب بن گئی ہے جس میں عقل اور عرفان کی کشتیاں ڈوب رہی ہیں۔ اسے سب سے زیادہ نفرت ہندوتوا وادی جبر پرستوں سے تھی۔ جواب سیاسی جماعتوں اور لیڈروں کی صورت میں سامنے آئے ہیں......اور کون ہے، جو ان سے نفرت نہیں کرتا؟ شنکر اچاریہ اڈوانی، اوما ہندی، نریندر بہاری مودی، شنکر اچاریہ گنیش، بال داس ٹھاکرے...... یہ کیسے امن پسند لوگ ہیں؟ کیا یہ جمہوریت کے دشمن نہیں ہیں؟ کیا یہ قومی یک جہتی کے دشمن نہیں ہیں؟ اس طرح کے سوالات کھڑے کر کے خالد حسین سب کے ہونٹ سی دیتا تھا۔

بمبئی 92 کے فسادات میں جس سیاسی پارٹی کے لیڈر نے براہ راست حصہ لیا تھا۔ اس کی ناک لمبی ہے۔ سیاہ رنگ کا چوکور چشمہ پہنتا ہے۔ خالد حسین اسے قتل کرنا چاہتا تھا۔ یہ وہ آدمی ہے جس کی سیاسی زندگی لوگوں کے خلاف نفرت پھیلانے میں صرف ہوئی۔ اسی نفرت نے اسے اکثریتی فرقے کے مخصوص ذہن رکھنے والے افراد کے نزدیک طبقاتی سیاست کا معمار بنا دیا۔

خالد حسین کو اس عفریت سے بجا نفرت تھی۔ یہ شخص فسطائی ذہن کا مالک اور فسطائی رجحانات کو قوی کرنے والا ہے۔ یہ ہٹلر کا شیدائی ہے۔ حقیقی جمہوریت کا ازلی دشمن ہے۔

ممبئی میں 93 کے بم دھماکوں کے بعد خالد حسین کو اکثر یہ کہتے سنا گیا تھا۔ کاش ابلیس کا گھر نشانے پر ہوتا...... کاش !! مگر ابلیس کو خدا نے ہی توانائی اور دماغ عطا کیا ہے۔ ابلیس کی زندگی اور عمر کا تعین آدمی نہیں کر سکتا۔ امن کی شاہراہ کو سرخ و سیاہ کرنے ،انسانی خون اور لاشوں سے بھرنے کے فرائض ابلیس کا نصیب ہے۔ شاید اسی لیے ابنِ آدم کی بے پناہ کاوشوں کے باوجود ابلیس کا خاتمہ نہیں ہوتا۔

ابلیس کے خاتمے کے بعد خدا کی حاجت کیسے رہے گی ؟ خدا کی موجودگی کا احساس زندہ رکھنے کے لیے وجودِ ابلیس ناگزیر ہے۔

ــــــــ ۱۵ ــــــــ

عنایت غازی نے پٹرول کا چھڑکاؤ کیا تو انگیٹھی میں راکھ سرخ رنگت اختیار کر گئی۔ رات کے گیارہ بجے ہوں گے۔ لشکری، اعجاز بٹ، شکیل عارف اور حمید وارثی اسپین پر ایک دستاویزی فلم دیکھ رہے تھے۔ میں ایک طرف کھڑے ہو کر کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ باہر شب کہرازدہ، تاریک اور یخ بستہ تھی۔ گہرا دھواں بہہ رہا تھا۔ اس دھویں میں کئی روحیں اُڈ آتیں اور دیکھتے ہی دیکھتے دوبارہ تحلیل ہو جاتیں۔ ان کے چہروں پر زندگی کا کوئی عنصر نہیں تھا۔ کوئی جنبش نہیں تھی ۔۔۔ کبھی رہی ہوگی۔ اب تو یہ یاد کے کہرا زار میں دھویں کی زنجیریں تھیں۔ یہ چہرے یکا یک ٹوٹ کر دوبارہ تاریکی کے غار میں لوٹ جاتے۔ کسی کنجِ بے نام میں بکھر جاتے۔ اگر کہیں قریب کوئی جگنو روشن ہوتا تو رات کے سینے میں نور کی لکیر دور تک گزر جاتی۔ ملگجی پودے، سیاہی میں ڈوبے تناور درخت، بکھرے حشرات کی کائنات، اس ننھی سی روشنی کی تیرتی ہوئی ایک ساعت میں نگاہوں میں روشن ہوتی۔ پھر دھند لکے کی تہہ انھیں لینے آ جاتی۔ ایک عجیب سی بے

قراری تھی۔ایک ناقابلِ یقین .... احساسِ گمشدگی کی کیفیت سے میں دوچار تھا۔لشکری نے پیچھے سے آکر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟ سب فلم دیکھ رہے ہیں ...... یہاں کیا ہے۔اس اندھیرے میں؟''

''بس یوں ہی۔''

''تم اور یوں ہی۔۔۔ ہرگز نہیں۔کوئی یاد آرہا ہے کیا؟''

''نہیں یار''

''اچھا! محبوبہ کو یاد کررہے ہو؟''

(اعجاز بٹ، شکیل عارف اور حمید بھی آکھڑے ہوئے)

''سوچتا ہوں، ہم کتنی بدنصیب نسل ہیں۔ہمارے نصیب میں کیسی ذلت ہے۔کیسی ویرانی ہے؟ ہمارا دکھ کتنا مبہم ہے؟ ہم تاریخ کی تجربہ گاہ ثابت ہورہے ہیں۔۔ ہم کتنے مخدوش ہوگئے ہیں۔۔بے ربط ہوگئے ہیں۔''

اعجاز نے مجھے اپنے گلے لگایا۔

''ہم اپنے اجداد کی خطاؤں کا سیاسی اور تاریخی خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ہمارے اجداد ہمیں جلتی ہوئی کشتیوں میں چھوڑ کر جانے کہاں چلے گئے۔''

(حمید نے کھڑکی کھولی۔)

''ہمیں ہماری شناخت کے لیے لڑنا پڑ رہا ہے۔ہم کتنی مبہم حقیقتوں کے درمیان پھنس گئے ہیں؟''

(شہریار نے جا کر ویڈیو بند کردیا)

''ہم اپنے وجود کے تحفظ کے لیے لڑنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔''

شہریار نے لب کھولے۔
''ہاں! دشمن، جمہوریت کے لباس میں ہے۔ معصوم عوام بھی اس سے بدگمان ہیں۔''
لشکری نے کہا۔
''وہ اپنی شیطانی صورت اور بھگوے ترشولی دانتوں کے ساتھ وطن کی چھاتی پر رقص کر رہا ہے۔''
شکیل عارف نے کہا۔
''مادرِ وطن ان کے شکنجوں میں پھنس گیا ہے۔ وہ وطن پرستی کا لیبل لیے وطن کو فسطائی کربلا کی جانب دھکیل رہے ہیں۔ ان کے خلاف کچھ کہنا تمام یادداشت میں وطن کے خلاف اور امن کے خلاف زبان کھولنا ہے۔ یہی وہ خطرناک چال ہے، جس کے ذریعے وہ اقتدار میں آئے ہیں۔''
(میرے لبوں سے نکالا)
''ان تمام باتوں کے جواب کی تلاش مجھے یہاں لے آئی ہے۔ چے گوارا کی روح میرے بھی دماغ میں جاگ اٹھی ہے۔ کبھی کبھار ایسا کیوں ہوتا ہے کہ امن کی خاطر تشدد کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ کھلا نہیں رہتا۔ راون کا قتل کرنے کے لیے بھی تو تشدد کا راستہ اپنایا گیا تھا۔ زارشاہی سے نجات کے لیے، انگریزوں سے نجات کے لیے، ہٹلر سے نجات کے لیے، جنگ لازمی ٹھہری تھی۔ ہٹلروں سے نجات کے لیے جنگ اور تشدد کے علاوہ کیا کوئی دوسرا راستہ بچا ہے؟''
(حمید وارثی درمیان میں بول پڑا)
''میں کبھی کبھی کنفیوژ ہو جاتا ہوں۔''
(شکیل عارف نے کہا)
''تم اکیلے نہیں۔ اس وقت برصغیر کا ہر ذہین طالبِ علم اور امن پسند آدمی کنفیوژ

ہے۔''

(شہر یار نے کہا)

''یہ تاریخی جدلیاتی کش مکش کا ایک پہلو لگتا ہے۔''

(لشکری سے رہا نہ گیا)

''نہیں شہر یار یہ فلسفیانہ استدلال کا وقت نہیں ہے۔تم فلاسفی کے لیکچرر اس طرح کے مبہم جوابات کہاں سے ڈھونڈ لاتے ہو۔'' ایک بار تم نے مجھے خط میں لکھا تھا کہ تمہیں طاہر نا چن کا مضمون ''ہندوتوا وادی فاشزم کی منطق'' پسند آیا ہے۔اسے یاد کرو ۔فسطائیت ایک طرف ہماری تاریخ کو مسخ کرنے اور تاریخ کو جواز بنا کر اقتدار حاصل کرنے سے عبارت ہے تو دوسری طرف ...... یہ کھیل اس لیے بھی ہے کہ اس بڑے طبقے کو دوبارہ غلام بنایا جائے جو بدھ مذہب اختیار کر کے ان کے ہاتھوں سے نکل گیا ہے۔معاشی، سیاسی اور تعلیمی طور پر کمزور اور بدحال طبقے پر حکومت کرنا اصل میں ہندوتوا وادی فلسفہ ہے۔جمہوریت، سیکولزم اور مساوات کے فروغ سے یہ طبقہ ان کے شکنجے سے تیزی سے باہر نکلتا جا رہا ہے۔جس سے مستقبل میں ایک دوسرے اور خونی تاریخی انتقام کا آغاز ہوسکتا ہے۔اگر مساوات، خوش حالی اور معاشی استحکام کی بدولت پست ذات تصور، مظلوم اور محکوم افراد تاریخی اور طبقاتی جدلیت کے شعور سے فیض یاب ہو گئے، تو برہمن واد کا خاتمہ بھی ممکن ہے۔

(سب لشکری کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے)

منو وادی فکر کے حامل لوگ بہت کم ہیں۔اس لیے عدم تحفظ کا شکار ہو گئے ہیں۔ اپنے تاریخی چہرے کو مٹتے ہوئے محسوس کر کے یہ بوکھلا گئے ہیں۔اسی لیے مختلف ناموں سے یہ اپنی فکر اور تاریخی انا کو تحفظ فراہم کرنے میں کوشاں ہیں۔کیا آر آر ایس ایس کیا، بجرنگ وجرنگ، کیا بی جے پی سب منو واد کے دفاع اور دلتوں کو حقوق سے محروم

کرنے کی سازش کا نتیجہ ہیں۔ وطن پرستی تو ان کا ماسک ہے۔ تاکہ ان کا ابلیسی چہرا منظرِ عام پر نہ آئے۔ وطن پرستی، تاریخی مراجعت، ثقافتی احیا پرستی اور قومیت ان کے ہتھیار ہیں۔ ان ہتھیاروں کا استعمال کرتے ہوئے جمہوریت کو انھوں نے ڈھال کے طور پر اپنایا ہے۔ ''جمہوریت کے ذریعے، جمہوریت کا قتل ان کا منصوبہ ہے۔''

(شکیل عارف)

''تمہاری دلیل متاثر کن ہے''

(لشکری):

''یہی سچ ہے۔ دیکھ لینا! ہندستان میں ایک دن ہر اس پارٹی کو وطن دشمن قرار دیا جائے گا جو فسطائیت اور ہندوتواواد کے خلاف عوامی تحریک کی بنیاد رکھے گی۔ بائیں بازو کے لیڈروں کو خرید لیا جائے گا اور انھیں بکری کی مینگنیوں میں بدل کر سماج کے سامنے پھینک دیا جائے گا۔ ان اخبارات پر مقدمے چلیں گے جو حقیقی جمہوریت کا تقاضا کریں گے۔ خود احتسابی کی بات کریں گے۔ وہ دن دور نہیں جب انگریزی کو باہری قوتوں سے جوڑ کر اس کی بیخ کنی کی کوشش کی جائے گی۔ یا اس کے مزاج کو سنسکرت درآمد زبانوں کے مزاج پر منوواد کی تبلیغ کا آلہ بنانے کی کوشش ہوگی۔ نئے ہندستان میں انگریزی ایک ایسی زبان ہے جو فسطائیت کے خلاف محاذ کھول سکتی ہے۔ اسی لیے ہندوتواوادی سے نالاں اور خائف ہیں۔

(شہریار نے درمیان میں کہا)

''یہ لوگ انگریزی کو نقلی جمہوریت پسند کہتے ہیں۔''

''حرامی ہیں سالے۔'' اتنا کہہ کر لشکری بیٹھ گیا۔

(حمید وارثی، جو کسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔۔۔اس نے کہا)

''لشکری وہ ہمیں کیوں مفلوج کر رہے ہیں؟ تعلیم، سیاست اور معاشیت کی سطح پر

وہ کیوں ہماری کمر توڑ رہے ہیں؟ کیوں وہ ہمیں ذلت اور محرومیوں سے دوچار کر رہے ہیں؟ کیوں فسادات کی آگ میں ہم کو جھونکتے رہتے ہیں؟

میری نگاہوں کے سامنے دیہات آگ کی لپیٹوں میں جل رہے تھے۔ خالد حسین کی لاش ہوا میں معلق دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی ناک سے خون کے قطرے رہ رہ کر گر رہے تھے۔ دور دراز شہروں اور دیہاتوں سے انسانی چیخ و پکار کی آوازیں میرے کان کے پردوں کو پھاڑ رہی تھیں۔ یہ کیسی زمین ہے جہاں عورتوں کی شرم گاہوں پر تیزاب انڈیل کر لوگ خوشیاں مناتے ہیں۔ یہ کیسا جہاں ہے جہاں عورتوں کی چھاتیوں کو تلواروں سے کاٹ کر ان کے گھر کے افراد کے سامنے پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ کیسی تہذیب ہے جہاں حاملہ عورتوں کے پیٹ چیر دئے جاتے ہیں۔ یہ کیسی جمہوریت ہے جہاں نوجوان لڑکوں کے اعضاء کاٹ دئے جاتے ہیں۔

ان تمام مظلوم روحوں کا پرآشوب گریہ میرے کانوں میں گونجتا ہے۔ ان کے رونے کی آوازوں میں اس قدر دردناکی اور کرب ہے کہ ایسا لگتا ہے میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ یادیں فرش پر بکھر جائیں گی .... وہیں مچل مچل کر فنا ہو جائیں گی۔ دوسری طرف میرے ذہن کے ایک تاریک گوشے میں میری والدہ کی جلی ہوئی ہڈیاں تھیں۔ جن کو میں ہمیشہ سے فراموش کرنے کی کوشش میں گرفتار رہا ہوں۔

یاد کی اس کروٹ کی اذیت ناقابلِ برداشت ہے ...... ناقابلِ بیان ہے ...... ایک لمحے میں کتنے منظر بنتے ہیں اور معدوم ہو جاتے ہیں؟ کیا آپ کی آنکھ میں ایسا اذیت ناک منظر نہیں ہے؟

لشکری میری جانب دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

یہ ہمارا مقدر ہے، ہم تاریخ کے آسیب کی زد میں ہیں۔ یہ پرانی جنگ ہے۔ یہ وجود کی بقا اور سالمیت کو جاوداں رکھنے کی ابدی کشمکش ہے۔ تم، میں اور وہ سب جوان

افکار کے سیلاب میں بہہ رہے ہیں۔انھیں اس گرداب کا بھی سامنا ہے۔

''ہمیں اپنے وجود کی تفہیم سے روشنی حاصل کرنا ہے۔ہم خود کو یاد کر رہے ہیں۔''

وہ ایک لمحے کے لیے ٹھہر گیا...... شہریار کو اس نے بغور دیکھا پھر کہنے لگا:

''مجھے خوشی ہے۔ ہم سب کو خوش ہونا چاہیے کہ ہمارے اندر اپنی حقیقت سے مکالمہ کرنے کی صلاحیت ابھی فوت نہیں ہوئی ہے۔ ہم ذلتوں کی ماری نسل سہی، لیکن وقت کے میزان پر اپنے وجدان کو پرکھنے سے ہم محروم نہیں ہیں۔ میرے یارو! تم سب عمدہ ذہن رکھتے ہو...... تم تاریخ، سماج اور زندگی کا احتساب کرنے کی لیاقت رکھتے ہو...... یہی سرمایہ ہے۔ فسطائیت سے لڑنے کی یہی طاقت ہے ۔ جب تک قوم کا قوت حافظہ محفوظ رہتا ہے اسے کوئی طاقت زیر نہیں کر سکتی ۔ ہم اپنی شناخت، ثقافت اور تحت الشعور کے ساتھ زندہ ہیں ...... رہیں گے ۔ ہمیں اپنے دوستوں اور بھائیوں کو یاد دلانا ہوگا کہ 'وہ زندہ ہیں'۔ ہمیں یہاں سے لوٹنے کے بعد یہی فریضہ ادا کرنا ہے۔ احتیاط اور دانش مندی کے ساتھ۔''

اعجاز بٹ درمیان میں اٹھ کر چلا گیا تھا۔ چائے لے آیا۔ سب چائے کی طرف بڑھ گئے۔ باہر صنوبر کے تنے کے پاس ایک جگنو رینگ رہا تھا۔ وہ تنہا یخ بستہ شب میں زندگی کا استعارہ ہے۔ مانا کہ اس کی روشنی ماند پڑ رہی ہے۔

ہر انسان کے دل میں ایک عدد ایسا جگنو ضرور ہوتا ہے۔ اس کی حفاظت سخت کوش، یخ بستہ شب کی ظلمت میں کون کرتا ہے؟

کش مکش حیات، نظریاتی تصادم، تاریخی شعور، عالمی اور ملکی سطح کی سازشیں، توہمات اور عقائد پر دن رات مباحث رہے۔ کئی نئے دوست ملے ۔ بے تکلف باتیں ہوئیں۔ طاقت، جبر، فلسفہ اور انسانی حقوق پر تبادلۂ خیال ہوا۔ یہ سارے احباب پہلی

اور غالباً آخری بار مل رہے ہوں گے۔ سب اپنے اپنے ذمے کچھ کام لے کر بچھڑ رہے تھے۔ یہ جمہوریت کے فریب خوردگی اور فسطائیت کے عروج سے بدظن اور دلبرداشتہ اسکالرز تھے۔ شاید جن کے نصیب میں فسطائیت کے عفریت کی خوراک بننا لکھا ہو...... کسے معلوم؟ کیا آپ جانتے ہیں کہ ان کا انجام کس قدر اذیت ناک ممکن ہے؟ کیا آپ جانتے ہیں میرا انجام خالد حسین سے کس قدر مختلف اور ناقابلِ فہم ہے؟'' کیا آپ اپنے انجام کی اذیت سے واقف ہیں؟''

باب چہارم

آکار نراکار

"The form which stand in closest competition with those undergoing modification and improvement will naturally suffer most."

—Darwin

(The Origin of Species)

ـــــــــ ا ـــــــــ

(آج کی شب گزارنے کے لیے یہ کمرہ میں نے کرایے پر لیا ہے۔)

سری نگر سے بمبئ واپسی کے وقت دل نے چاہا چند روز ڈلہوزی میں گزارلوں۔ میں پٹھان کوٹ ہوتا ہوا ڈلہوزی پہنچا...... ہفتے بھر کے لیے ایک کمرہ بک کیا۔اس خوبصورت پہاڑی مقام کے شمال اور جنوب میں برفباری خوب ہوتی ہے۔ برف پوش پہاڑوں سے ٹکرا کر منعکس ہوتی ہوئی سورج کی کرنوں کا جلوہ بڑا دلکش ہوتا ہے۔ پہاڑوں کے عقب اور ڈھلان چبوتروں میں برطانوی طرز کے بڑے بڑے مکانات راستوں کے دونوں طرف نظر آتے ہیں۔ جن میں شیشے کی بڑی بڑی کھڑکیاں بھی جابجا دکھائی دیتی ہیں۔ شیشہ آنکھ اور منظر کے درمیان حائل نہیں ہوتا۔

برفیلی پہاڑیوں کو سرخ روشن طلسمی قبا پہنائے شام اتر آئی ہے۔فضا میں ایک نغمگی تھی۔ رنگ برنگی پودے جو ابھی تک نگاہوں میں نگار خانہ بنائے ہوئے تھے، اندھیری چادر میں سرکنے لگے۔لیکن ان کے خوب صورتی دیدوں میں ٹھہر گئی۔ بہت سارا حسن اور قدرت کی شادابی سے لطف اندوز ہونے کے باوجود ایک حزنیہ کیفیت میرے دل میں تھی۔ہم اپنے خیالات سے زخم خوردہ کیوں ہوتے ہیں؟ اپنے تفکرات سے نجات کیوں کر ممکن ہے؟ مجھے یہ بات بار بار کیوں پریشان کرتی ہے کہ ''کون سا میں'' حقیقی میں ہوں؟ میری شخصیت کا تاثر مختلف لوگوں کے پاس مختلف ہے اور ہر شخص مجھے دوسرے سے الگ طور پر جانتا ہے۔لیکن جس 'میں' کو میں جانتا ہوں وہ

سب سے پوشیدہ ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے اور ان کے تعلق کی بنیاد غیر حقیقی ہے۔ وہ جس آدمی سے مربوط ہیں۔ وہ میں نہیں ہوں...... میں کس طرح بتاؤں کہ میں ''کیسا'' ہوں؟ یہ بات سمجھائی نہیں جاسکتی۔ اسی طرح شاید میں بھی ان کی حقیقی شخصیت سے واقف نہیں ہوں۔ ذات کا تجربہ انفرادی ہوتا ہے اور اس کی قدریں مشترک نہیں ہیں۔

مذہب کو بنیاد بنا کر میں خود کو تاریخ کے سیل رواں میں کیوں کھوجتا ہوں؟ مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں ایک تاریخی تسلسل ہوں؟ (جس سے لوگ مجھے منقطع کرنا چاہتے ہیں) میں فریدہ سے عشق کیوں کرتا ہوں؟ میں اندھیرے سے کیوں ڈرتا ہوں؟ کیوں رنگوں کے پرتو میں مقید ہو جاتا ہوں؟ فریدہ سے محبت کے باوجود دوسرے رنگ بھی مجھے متاثر کیوں کرتے ہیں؟ میرا دل تلاشِ رنگِ رائیگاں میں انبساط کیوں ڈھونڈتا ہے؟ مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں فلابیر کا خلق کیا ہوا کردار 'مادام بواری' ہوں۔ (تو فریدہ سے میری الفت کی صداقت کیا ہے؟) بواری کا زہر پینا جاں سوز ہے۔ اس کے باوجود مجھے لگتا ہے وہ ابھی قیدِ حیات ہے۔ جانے کس شہر، کس دیہات، کس قصبے میں وہ میری منتظر ہے۔ کیا میرا ذہن منہدم ہو رہا ہے؟ میرا شعور لاشعور میں بدل رہا ہے۔

------ ۲ -----

مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ ترشول میرے تعاقب میں ہے؟ ایک ہندتوا وادی سیاسی جماعت کے اراکین بھالے، نیزے اور تیزاب لیے میرے قتل کی سازش بن رہے ہیں؟ میں صلیبِ وطن پر بیڑیوں میں جکڑا ہوا ہوں۔ مجھ پر وطن سے غداری اور خود

سے محبت کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ ساری عدالتوں کے جج ترشول اپنے ہاتھوں میں لیے میرے خلاف فیصلے رقم کر رہے ہیں۔ میں ہار رہا ہوں۔ مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ میرا حشر ذلت آمیز ہے؟

کیا میرے نصیب میں ایک خوں آشام جنگ ہے؟ کیا شناخت کے تحفظ کے لیے وطنیت کی دیواروں کو مسمار کرنا میرے لیے آخری راستہ ہے؟ کیا مجھے ان سیاسی لیڈروں کو قتل کرنا پڑے گا جو مجھے صفحۂ ہستی سے مٹانے کے نعرے بلند کرتے ہیں۔ کیا خود کو زندہ رکھنے کے لیے مجھے کمل کی پنکھڑیوں پر سوار، رتھ یاتراؤں میں مگن حیوانوں کو بم دھماکے سے ہلاک کرنا ہوگا؟ وہ جو خاموش تماشائی ہیں، میری رسوائی کے، کیا مجھے ان کے خلاف بھی لڑنا ہوگا؟

''کیوں تاریخ کے جدلیاتی سفر میں ایسا موڑ آتا ہے، جب امن کے استعارے کو تشدد کا لباس اوڑھنا پڑتا ہے؟ کون ہے اس جدلیاتی کش مکش کا محرک؟ وقت، خدایا تاریخ......! کون؟''

میں مجبور ہوں۔ تنہائی میں خیالات کے ہالے میری روح کے گرد رقصاں ہوتے ہیں۔ میں گزشتہ کئی برسوں سے ان ہالوں کی روشنی میں جاگتا کٹتا رہا ہوں۔ اندھیرے میں خود کلامی کی دیوی میری روح میں جاگزیں ہو جاتی ہے......حتیٰ کہ......اندھیرے میں، میں خود کو ٹٹولتا ہوں۔ آواز دیتا ہوں۔......ہاں تاریکی میں، اپنے سایے سے بات کرنا میری عادت بن گئی ہے۔ اس سے مجھے تسکین میسر ہے۔ میرے اور سایے کے بیچ کوئی پردہ حائل نہیں رہتا۔ ایک راز کی بات اور بتاؤں ......اندھیرے میں برہنہ بیٹھنے کی مجھے لت لگ گئی ہے۔ تاکہ میں خود کو دیکھ سکوں۔ دریافت کر سکوں۔ کیا احساسِ زیاں آدمی کو اس قدر مبہم بنا دیتا ہے؟ کیا احساسِ زیاں کا تعلق شناخت کی محرومی ہے؟ مجھے تو کسی بات کا علم نہیں ہے۔ میں مخدوش تصویر ہوں۔ حالانکہ میری تمنا

وجود کے جمالیاتی اسرار دریافت کرنا تھی۔

------ ۳ -----

جب ہر طرف اندھیرا پھیل گیا تب باہر کی ہوا اپنے ساتھ اندھیرے کی تہوں کو کمرے میں لے آئی۔ اندھیرا سانسوں سے گزر کر ظلمتِ دل میں اتر گیا۔ میری روح بدن کی بے آسماں فصیلوں میں مقید ہوگئی۔ جس طرح عالم تمام کی روشنی ازلی اندھیرے کے بطن میں قید ہے۔ یکا یک لشکری کا چہرہ میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ پھر ایک ایک کر کے وہ سارے چہرے نظروں کے سامنے ایک حصار میں گردش کرتے رہے۔ ان کے ہونٹوں پر نا قابلِ سماعت لفظوں کی قطاریں کھڑی ہیں اور ان کی آنکھوں کے کونوں میں نہ روئے گئے آنسوؤں کا دریا ہے۔ ان کی نگاہوں میں وہ مناظر ہیں جو جمہوریت کے نام زائیدہ عفریت کے جبر وتشدد کا رزمیہ بیان کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی ہم زبان ہم شناخت عورتوں کے جسموں پر فسطائیت کے ناخنوں سے خراشیں پڑ گئی ہیں۔ ان میں ایسی بدنصیب عورتیں بھی ہیں جن کی چھاتیوں کو تلواروں سے کاٹ دیا گیا۔ خون کے فواروں کی طرح ان کی آنکھوں سے اب تک خونِ دل بہہ رہا ہے۔

یہ سب چہرے، وہ چہرے ہیں جو اس درد کو محسوس کرتے ہیں۔ ان کا ندبہ ونوحہ بیان کرتے ہیں۔ اس وقت ان کی آنکھوں سے خون کے فوارے اڈپڑتے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں اندھیرا گہرے منجمد خون کے دھبوں سے اٹ گیا ہے۔

------ ۴ -----

سرخ ذرے جب ظلمتِ شب کی جھیل میں ڈوب گئے، تو میں نے دیکھا کیلاش

پربت کی طرح بلند و بالہ پہاڑیوں سے گوتم بدھ دیوانہ وار بھاگتا چلا آ رہا ہے۔ یقیناً اس نے شنکر کا قتل کیا ہے۔ میرے سامنے پہنچ کر وہ برہنہ ہو گیا اور شنکر کے دربار میں سنی ہوئی تال پر رقص کرنے لگ گیا۔ اس کے چہرے کی ابدی مسکراہٹ شنکر کے لہو کے ساتھ بہہ گئی ہوگی۔ وہ پرتشدد آنکھوں سے ہر شے کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کا رقص اس قدر تیز ہو گیا کہ مناظر اور اشیاء اس کی آنکھوں سے محو ہو گئے ہوں گے۔ رقص تیز تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے پھیپھڑے اور دل کے ریشے بدن کی ویرانی میں بکھر گئے ہوں گے۔ تبھی تو اس کے تلوؤں سے منجمد سبز و سرخ لہو کے گاڑھے گاڑھے قطرے زمین پر بکھرنے لگے۔ میں نے چیخ کر کہا:

گوتم، بس کرو...... پاگل ہو گئے ہو کیا؟ دیواروں نے اس کی زبان اختیار کر لی، لرزہ براندام بولیں: ''نراکار ہو جاؤ'' رقص نے کمرے کی ہر شے کو بے سدھ اور بے شکل کر دیا تھا۔ شیشے کا گلاس اور چائے کی کیتلی نم دیدہ ہو گئے تھے...... میں نے کہا: مگر کیوں نراکار ہو جاؤں؟

دیواروں کے چہرے روشن ہوئے اور الفاظ کا ارتعاش ہوا: ''میں ہار کا سوگ منا رہا ہوں۔ میری تپسیا ویرتھ گئی...... میرا جنم بے کار ہے...... میرا نروان لا حاصل......''

''گوتم اب ماتم کرنے سے کیا فائدہ؟''

''نراکار...... نراکار...... ویرتھ...... ویرتھ......''

''گوتم، تمہارا خواب بے معنی تھا۔ تم دکھ اور خواہش سے نجات چاہتے تھے۔ غافل ہو گئے تھے کہ نجات کی خواہش تمہارے اندر جاگ گئی ہے۔ تم نجات کی خواہش میں بندھ گئے تھے......''

''کچھ نہیں! نراکار...... نراکار...... مرتی ہوئی آوازوں کے ساتھ دیواروں کا چہرہ ٹوٹ پھوٹ گیا اور دھوئیں کی لکیریں بہتی ہوئی آسمان کی طرف چل پڑیں۔ رقص کا

شور کانوں میں منجمد ہو گیا تھا۔ دیواریں گویا رو چکی تھیں۔ آنسوؤں کی لکیر سے رنگ غائب نظر آتا تھا۔ شیشے کے گلاس کا پانی برف بن گیا تھا اور چائے کی کیتلی سرد اگئی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے چہرے کو ٹٹولا...... ابہام سے باہر نکلا...... شاید کبھی نہ جان سکوں گا۔ ''مجھے ایسے واقعات وقوع پذیر ہوتے ہوئے کیوں محسوس ہوتے ہیں؟ ''سوچ کے دائرے پھیل رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ کمرے میں مکان مالک کی بیوی داخل ہوئی۔

''صاحب اندھیرا ہوا ہے، لائٹ لگا دوں؟''

''جی جی۔''

اس کے جاتے ہی میں نے خود کو بستر پر پھینک دیا۔ ''نیند سے بہتر علاج درد کیا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ نیند دکھ کو نراکار بنا دیتی ہے......؟ مگر نیند نراکار کو آکار بھی تو عطا کرتی ہے۔ وہ بھلا کیوں؟''

باب پنجم

نخلستان کی تلاش

"It is difficult to express well that one has never felt'"

—Gustave Flaubert

(The Novel, Forms And Techniques)

خالد حسین کی موت نے جمال کی زندگی ،فکر اور نظریات کو متاثر کیا تھا۔ جمہوری اقدار کی شکست اور فسطائی تحریکوں کے عروج نے شناخت کے بحران میں اسے ابھی پھینک دیا تھا۔ اس کے ذہنی کنفیوژن نے بالآخر اسے بھی بنیاد پرست مذہبی تنظیموں سے وابستہ کردیا۔ جہاں اس کی تاریخی ، مذہبی ،فکری اور جدلیاتی شناخت کے نئے نقوش بننے والے تھے۔ خالد حسین کی موت کا صدمہ میرے لیے بھی اتنا جاں سوز تھا جتنا جمال کے لیے، لیکن میرے اور جمال کے ماضی اور حال میں فرق تھا۔ ورنہ شاید ناول کا یہ حصہ جمال میرے لیے تحریر کررہا ہوتا...... جمال ان بدنصیب ذہین اور مفکرانہ طرزِ حیات رکھنے والے طلبہ میں سے ایک تھا، جن کے بچپن میں مایوسی اور یاسیت کا یکساں گرفت رکھنے والا کوئی نہ کوئی مقناطیسی منظر ہوتا ہے۔ ''ناخوش'' رویہ تخلیقی فکر کا منبع ہے اور جمال کی زندگی کا بڑا حصہ اس رمز کو پیش کرتا تھا۔ محبت کی پرزور اور والہانہ خواہش بھی باطن کی ناخوش حالت پر قابو پانے کا ایک فکری عمل لگتا ہے۔ جمال سے فریدہ کی محبت اور کیا ہے؟ محبت کی ساری کہانی میں کیا آپ نے یہ محسوس نہیں کیا کہ جمال، فریدہ کے بدن سے لذت کے تمام جزیرے دریافت کرنا چاہتا ہے۔ اس کے جسم کی نازکی کا بیان وہ اکثر پرکشش انداز میں کیا کرتا تھا۔ ہاں !! جن باتوں کو اس نے آپ کے سامنے کھل کر پیش کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ باتیں وہ مجھ سے اور خالد حسین سے کیا کرتا تھا۔ فریدہ کی محبت میں گرفتار ہونے سے قبل بھی اس کے جنسی تعلقات بعض لڑکیوں سے تھے۔ ماسٹربیٹ کے لطف کا تذکرہ بھی وہ کیا کرتا جس پر ہم اس کو بہت

کوستے تھے۔ لیکن وہ میراجی کی نظمیں سنا کر ہماری بولتی بند کر دیتا۔ نیلی فلموں کے حیران کن جنسی مناظر کا جب وہ بیان کرتا محفل کون و مکان سے ماورا ہو جاتی۔

وہ ہمیشہ جنسی تسکین کا متلاشی رہا ہے۔ محبت شاید ایک پردہ سیمیں تھی جس پر جنسی جذبات اور عدم اطمینانی کے المیے باہم ہوا کرتے تھے۔ لیکن پھر اس کا ماضی ......ایک گانٹھ بن کر اس کی روح کی ویرانی میں بیٹھا سانس لیتا رہا۔ شاید اس نے آپ کو بتایا تھا کہ اس کے گھرانے کے بعض افراد کا قتل اور ایک بہن کی عصمت دری ہندتوا وادی فسادیوں نے کی تھی۔ جب وہ چھوٹا بچہ تھا۔ رشتے داروں نے اس کی پرورش کی تھی۔ تنہائی اور حزن کا بار لیے وہ جوان ہوا...... البتہ یہ بات بھی درست ہے کہ انسانی درد مندی کا لالہ اس کے دل میں کھلا ہوا تھا۔ مارکسی خیالات نے اسے سماج کے پسماندہ طبقات کے بہت قریب کر دیا تھا...... ایک وقت تھا جب وہ مذہب کو دماغی ایڈز کہا کرتا تھا۔ ہر اس کام سے پرہیز کیا کرتا تھا جو مذہبی ثقافت اور تہذیب سے اس کی شناخت کو مربوط کرتا...... وہ انسانی اقدار کا زبردست حامی تھا۔ جب خالد حسین نے شروع شروع میں مذہبی تحریک سے اپنا رشتہ استوار کیا تب جمال نے کئی بار اپنی برہمی کا مجھ سے اظہار کیا تھا۔ کہتا ''ایک اور ذہین آدمی ریت میں گم ہو گیا......!!'' لیکن سیاست کے مذہبی کرن، اس کے ماضی کی ہولناک یادوں، اور فسطائیت کے عروج نے شاید اسے اپنے تاریخی چہرے کو تلاش کرنے پر مجبور کر دیا۔ خالد حسین کی ناگہانی موت نے اس کے ماضی کے کرب کو ایک راہ فراہم کی اور وہ اس راستے پر چل پڑا جو گہرے سمندروں میں جاتا ہے۔ فریدہ سے ملاقاتیں کم ہونے لگیں اور تحریکی کاموں میں اس کا وقت زیادہ گزرنے لگا۔ خود مجھ سے بہت کم ملاقاتیں رہیں۔ میں نے اسے کبھی نہیں روکا۔ ہماری دوستی ''غیر مشروط'' تھی اور اس میں مشورے بازی کا چلن شروع سے نہیں تھا۔ یہ الگ بات ہے میں نے اس کا راستہ نہیں اپنایا؟ میں خود کو حق بجانب اور اس کو

غلط قرار نہیں دے سکتا۔ موجودہ حالات مطلق کسی ایک فیصلہ کن حالت میں ہمیں کھڑا نہیں کرتے۔ آج ہر آدمی بے زبان، محکوم اور بے ربط ہے۔ اس کے سامنے کوئی منظر خوش رنگ نہیں ہے۔ میں کبھی کبھی یہ سوچتا ہوں کہ جمال ذات کے الاؤ میں گر گیا جس کی تپش کا اندازہ کوئی اور نہیں لگا سکتا۔

آپ کے ذہن میں ممکن ہے یہ سوال کروٹ لے رہا ہو کہ جب ساری روداد جمال خود شعور کی رو میں بیان کر رہا تھا، تو اچانک میں کہاں سے آدھمکا...... اور میں کون ہوں ...... میں مختار ہوں۔ جس نے جمال کے کمرے پر خالد حسین کی موت کا پیغام پہنچایا تھا۔ اب میں واحد گواہ ہوں جسے اس بات کا علم تھا کہ جمال کی گمشدگی یا گرفتاری سے قبل وہ کس ریاست میں اور کس نوعیت کی کانفرنس میں شرکت کے لیے گیا تھا...... وہاں سے جب اس نے فریدہ کو فون کیا تھا، اسی دن اس نے مجھے بھی فون کیا تھا۔ واپسی کا دن بتایا تھا۔ لیکن وہ کبھی واپس نہیں آیا...... میں نے اس کے تحریکی ساتھیوں سے کئی دنوں کے انتظار کے بعد رابطہ قایم کیا۔ انھوں نے کانفرنس کے منتظمین سے رابطہ قایم کیا لیکن جمال کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ دو تین مہینوں بعد باتیں قیاس آرائی میں بدل گئیں۔۔۔ ہو سکتا ہے خفیہ ایجنٹس نے اسے گرفتار کر لیا ہو۔ وہ فرار ہو گیا ہو۔ کوئی حادثہ ہوا ہو...... مگر کوئی وثوق سے یہ نہیں بتا سکا کہ اب جمال کہاں ہے؟ یا اس کی طرح بہت سارے نوجوان اچانک کس صحرا میں گم ہو جاتے ہیں۔ وہ نوجوان جو وطنِ عزیز میں سیاسی فسطائیت کے خلاف گفتگو کا خواب دیکھتے ہیں۔ نا قابلِ برداشت جبر کے صحرا میں شناخت کے نخلستان کو تلاش کرنا چاہتے ہیں۔

رحمٰن عباس کا پہلا ناول 'نخلستان کی تلاش' ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا جو چند وجوہ کے سبب متنازع قرار دیا گیا۔ اس ناول پر فحاشی کا مقدمہ قائم ہوا جو تا حال ممبئی کی عدالت میں جاری ہے۔ 'ایک ممنوعہ محبت کی کہانی' رحمٰن عباس کا دوسرا ناول ہے جو ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اردو فکشن کی دنیا میں ایک تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح پھیل گیا۔ اردو فکشن نگاروں نے اس ناول کو بہت سراہا اور رحمٰن عباس کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کیا۔ ۲۰۱۱ء میں 'یونی ورسل سوسائٹی فار پیس اینڈ ریسرچ' (اورنگ آباد) نے اس ناول کو نیشنل ایوارڈ برائے ادب سے نوازا۔ 'خدا کے سائے میں آنکھ مچولی' رحمٰن عباس کا تیسرا ناول ہے جو ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا اور موضوع کی بے باکی اور طرزِ اسلوب کی ندرت کے سبب عوام و خواص میں زیرِ بحث بنا۔ اس ناول پر کناڈا کے اردو ٹی وی چینل 'راول ٹی وی' نے ایک گھنٹے کا مذاکرہ منعقد کیا جس میں پاکستان اور ہندوستان کے فکشن نگاروں نے حصہ لیا۔ 'خدا کے سائے میں آنکھ مچولی' پر ادبی جرائد اور رسائل میں خاصے مضامین اور تبصرے شائع ہوئے ہیں اور یہ ناول تکنیک کے تجربے کے طور بھی پذیرائی حاصل کر رہا ہے۔

رحمٰن عباس نے مراٹھی مفکر سندیپ واسلیکر کی مشہور تصنیف 'یکا دشے چا شودھ' کا اردو ترجمہ 'ایک سمت کی تلاش' کے عنوان سے کیا ہے۔ یہ کتاب جون ۲۰۱۱ء میں شائع ہوئی۔ اس ترجمے کی بھی خوب پذیرائی ہوئی ہے۔ رحمٰن عباس کے افسانے اور مضامین ملک اور بیرونِ ملک رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں ان کا مضمون 'ناول کا فن اور اردو ناول کی تنقید کا المیہ' شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کو ناول کی تنقید میں ایک اہم، غیر معمولی اور فکر انگیز مضمون قرار دیا جا رہا ہے۔ فکشن پر ان کے مضامین بہت جلد کتابی صورت میں شائع ہوں گے۔

رحمٰن عباس نے دوردرشن کے لیے اردو قلم کاروں کے انٹرویوز کیے ہیں۔ چند مشہور فنکاروں پر ڈوکیومنٹریز کی اسکرپٹ لکھی ہے اور اینکرنگ بھی کی ہے۔ رحمٰن عباس فی الحال ہندوستان کے ایک اہم تھنک ٹینک 'اسٹریٹجک فارسائٹ گروپ' میں ساؤتھ ایشیا سکیورٹی یونٹ میں ریسرچ اسسٹنٹ کے عہدے پر فائز ہیں۔

رحمٰن عباس کے مذکورہ تینوں ناولوں کو جو پذیرائی ادبی اور عوامی حلقوں میں ملی ہے اس کے پیش نظر ہم ان ناولوں کو ایک ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ (اظہار احمد ندیم)

Mosharraf Alam Zauqui

Aabe-Rawane-Kabeer

arshia publications
arshiapublicationspvt@gmail.com

ISBN 978-93-81029-37-4
9 789381 029374